سپاس گزار

میمونہ صدف

قسط نمبر 1

ایک ہاتھ سے معذور، چیچک کے داغوں، آدھ جلے چہرے اور بھدے ہاتھوں والی عورت عجیب نظم نما گیت گاتی آگے بڑھ رہی تھی۔۔۔اس عورت اور گیت سے زیادہ اس گیت کی زبان نے اسے چونک کر اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ بھکارن کا انگریزی زبان میں گیت گانا۔۔۔اسی بات نے اس کے قدموں کی کششِ ثقل کو کہیں گنا بڑھا دیا تھا۔

when you think things are bad .....
when you feel sour and blue ....
when you start to get mad ....

وہ حلیے اور صورت سے بھکارن تھی پھر اس زبان کا گیت وہ کیسے گا رہی تھی۔۔۔؟ کم از کم پاکستان میں کبھی اس نے ایسا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

بھکاری عورت کے پیچھے دو بچے اس کا سایہ تھے۔ان میں سے ایک چار سال کے لگ بھگ لاغر سا سرخ وسفید، صاف ستھرا بچہ تھا اور دوسری آٹھ دس سالہ دھلی دھلائی بچی، جس کی رنگت سانولی تھی۔۔ وہ تینوں ہی نقوش سے پاکستانی نہیں دکھتے تھے۔۔۔رنگوں کا عجب امتزاج لئے ،لبوں پہ پیپڑی جمے بچوں نے جہاں اسے منجمد کیا تھا وہیں اس بھکاری عورت کے الفاظ نے اسے موم کیا تھا۔ وہ مدھر آواز میں گیت گاتے آگے بڑھ رہی تھی۔ کششِ ثقل نے اسے آزاد کیا اور وہ اس تین کی قطار میں چوتھی بن گئی۔ وہ سننا چاہتی تھی کہ وہ کیا سنا رہی ہے، جو بھی وہ گا رہی ہے، کس کے لیے اور کیوں گا رہی ہے۔

You should do what i do ....
Just tell yourself, Duckie.......
You' re really quite lucky .....

اور اُس نے عورت کی اِس خوش قسمتی کو تعجب سے دیکھا جو چیخ چیخ کر اس کا حال پکار رہی تھی۔ وہ کیسے خوش قسمتی کہہ رہی تھی۔۔۔؟

some people are much more....
oh , ever so much more ...
oh , muchy much much more ...
unlucky than you ....

اور ایک گہری سانس جو اس کے اندر کب کی مقید تھی، اس لمحے آزاد ہوئی۔ اس گیت نے اس کے اندر اترتے سوالات کا جواب بخوبی دے دیا تھا۔ ایک عرصہ ہوا اسے یوں مقامی بسوں کے سفر کو ترک کیے۔ آج نجانے کون سی انجان طاقت اسے مجبور کر کے یہاں بس اسٹاپ تک لے آئی تھی۔

بچی نے ماں کے گیت کے اختتام پہ، ماں سے چھپ کر بھائی کے کان میں سرگوشی کی۔

''اور اگر آج کھانا نہ ملا تو۔۔۔؟''

''کون سا دن گزرا ہے کہ ہم بھوکے سوئے ہو۔۔۔؟'' اس قطار کی لیڈر ماں نے بچی کی سرگوشی کو پالیا تھا اور بغیر مڑے سوال کیا۔ اسی سوال میں بچی کا جواب پنہاں تھا۔ بچی کچھ خجل سی ہو کر اب بھائی کو ہاتھوں سے اشارے کر رہی تھی کہ ماں پاگل ہو چکی ہے، کھانے کو اب کچھ نہیں ملنے والا۔ مغرب کے ملگجے اندھیرے نے ہر شے کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔۔۔

تبھی پاس سے گزرتے ایک ریڑھی بان نے اپنی ریڑھی کے سبھی گلے سڑے اور بچے ہوئے پھل اس عورت کی اور بڑھا دیئے۔ بوڑھی عورت پھل تھامنے سے قبل گھٹنوں کو ہلکا سا خم دیتی جھکی اور ایک ہاتھ پیٹ اور سینے کے درمیانی حصے پہ رکھتے سر جھکا کر گویا پھل فروش کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی اِس حرکت پہ پھل فروش تھوڑا خجل سا ہوا کہ دیئے جانے والے پھل اس قابل تو نہ تھے کہ اِس انداز سے شکریہ ادا کیا جاتا۔ بوڑھی عورت کو پھل فروش کے تاثرات سے کوئی لینا دینا نہیں تھا کہ وہ اپنا کام کر چکی تھی اور اب اسے پھل تھامنا تھے۔ پھل اس نے ہاتھ میں موجود ایک کٹورے میں بھر کر وہ فٹ پاتھ کے کنارے لگے ایک سنگی بنچ پہ بیٹھ گئی اور گلے سڑے حصے سے صاف حصے کو الگ کرتی بیٹی سے مخاطب ہوئی۔

"میں نہ کہتی تھی ملے گا، ضرور ملے گا۔" چہرہ پہ عجیب چمک تھی۔ اپنے بات کے سچ ثابت ہونے جانے کی چمک۔

"یہ۔۔۔آں۔۔۔میں یہ نہیں کھا سکتی۔ کیا ہم نے خدا کا اس برے طریقے سے شکریہ ادا کیا تھا کہ اس نے ہمیں ایسا برا کھانا دیا۔۔۔؟" اس نے حقارت سے پھل کو دیکھتے منہ چڑایا۔

اس کی اس بات نے بھکاری عورت کا چہرہ موت سا سیاہ کر ڈالا۔

"جب تک انسان کو کسی شے کی قدر نہ ہو، وہ شے اسے ملنا بے قدری کو بڑھا دیتا ہے۔" اس نے لڑکی کی جانب بڑھایا پھل پیچھے ہٹا لیا۔ لڑکی نے بھی عجیب سا منہ بنایا کہ اسے اس باسی پھل کو کھانے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اس کا اضطراب بتا رہا تھا کہ وہ بھوکی تھی اور مزید کی امید بھی کم تھی۔

"مجھے نہیں لگتا کہ اس سڑن زدہ پھل کی قدر میں کبھی سیکھ پاؤں گی۔ اس میں قدر لائق ہے ہی کیا۔۔۔؟" لڑکی نے شانے اچکائے۔ وہ شاہ تھی جو گدا کے ہاں پیدا ہو گئی تھی۔

"مجھے بھی نہیں لگتا کہ تمہیں اس سے بہتر کیا، آئندہ یہ بھی مل پائے گا۔ بہتر ہمیشہ کمتر کی قدر سے ملتا ہے۔ جسے کمتر کی قدر نہ ہو، وہ بہتر کو کبھی نہیں پا سکتا۔" بھکاری عورت ایک حصہ اپنے منہ میں اور ایک اپنے بچے کے منہ میں ڈال رہی تھی جو رغبت سے کھا رہا تھا۔ تبھی وہ ریڑھی بان واپس پلٹ کر آیا تھا اور بھکاری عورت کے پیالے کی جانب اس نے کچھ صاف ستھرا پھل بڑھایا تھا۔

"تم نے جیسے میرا شکریہ ادا کیا، مجھے لگا میں نے زیادتی کر دی۔" ننھی لڑکی کا چہرہ یکدم بجھ گیا۔ کچھ دیر قبل ادا کئے گئے الفاظ پہ شاید اسے پچھتاوا ہو رہا تھا۔

اس قطار کی آخری امیدوار جو کچھ فاصلے سے سب دیکھ رہی تھی، اس نے آج ایک راز پا لیا تھا۔ وہ جو ہمیشہ سے چھوٹے دل کی مالک رہی، کبھی اپنی چھوٹی سوچ سے بلند ہو کر اوپر نہ اٹھ سکی، اس نے شاکر کو دیکھا، شکر کو پایا۔ شکر جس کا مقام دل ہوتا ہے، کبھی اُس دل میں نہیں سما سکتا جس میں پہلے سے ہی بہت کچھ سمایا ہو۔ کئی سال پہلے وہ ایسی ہی تھی، اس بچی جیسی۔۔۔ اس سے بھی بڑھ کر کیونکہ اس میں ناشکرے پن کے ساتھ تکبر بھی تھا۔ پھر وہ بت ٹوٹا۔۔۔ سب ٹوٹا۔۔۔ بڑی زور سے ٹوٹا۔

جانے سے پہلے اُس نے ایک طے شدہ چمکیلے کاغذ کو بیگ سے نکالتے ہوئے آہستگی سے بھکاری عورت کے ایک جانب پڑے چرمی تھیلے میں ڈال دیا۔۔۔بس آ چکی تھی، اسے اب جانا تھا۔ پیچھے وہ بھکاری عورت کیا کہہ رہی تھی، وہ سن نہ سکی تھی۔

☆......☆......☆

اس کی آنکھ کھلی تو فجر کی نماز قضا ہو چکی تھی جس کا اسے افسوس تھا۔سفر کی تھکاوٹ اتنی تھی کہ الارم کی آواز اسے سنائی ہی نہیں دی اور وہ شاید پھر سے بند کر کے سو گیا تھا۔کل رستے میں سفر کے دوران اس نے جگہ جگہ کوسٹر رکوا کر نماز پڑھی تھی۔وہ اکیلا نہیں تھا نماز پڑھنے والا، اس کے بہت سے کلاس فیلوز بھی تھے لیکن ہمیشہ کوسٹر وہی رکواتا تھا۔ایسا کرتے اس نے بہت سے لوگوں کی دھیمی سرگوشیاں بھی سنی تھیں۔

''شو آف۔۔۔''

''خواہ مخواہ ہمیں لیٹ کروا رہا ہے۔''

''سفر میں نماز چھوڑ دے تو کیا ہو جائے گا۔''

''شوق ہے اسے بہت نمازی پرہیزگار بننے کا۔''

لیکن جو اسے جانتے تھے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ کلاس کے دوران پروفیسرز سے اجازت لے کر بھی نماز کے لیے جاتا تھا۔ پہلے پہل کچھ پروفیسرز نے اعتراض کیا لیکن جب وہ مان کر نہ دیا تو اسے اجازت دے دی کہ بنا کلاس کو ڈسٹرب کیے وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا جایا کرے۔شروع میں وہ اکیلا کلاس سے نکل جاتا تھا، بعد میں اس کی دیکھا دیکھی کئی اور اسٹوڈنٹس بھی نماز کے لئے جانے لگے حتیٰ کہ کچھ پروفیسرز جن کی آخری کلاس ہوتی تھی وہ نماز کا وقفہ لے کر بعد میں اپنی کلاس کا وقت پورا کر لیتے تھے۔

یہ ٹرپ اسی نے ارینج کیا تھا کیونکہ یہ اس کا علاقہ تھا اور وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ڈھائی سو کی کلاس میں سے بہ مشکل سو لوگ ہی ٹرپ کے لئے آمادہ ہوئے تھے۔سوات کے خراب حالات کی وجہ سے کم اسٹوڈنٹس کو ہی اجازت ملی تھی جانے کی۔سو لوگوں کے لئے ٹرانسپورٹ، رہائش اور کھانے پینے کا انتظام اس اکیلے نے کیا تھا۔ایسے میں اس کے روابط قائم آئے تھے۔

اس نے وقتاً فوقتاً ایک بہترین گائیڈ کی خدمات بھی پیش کی تھیں ۔ وہ اس رستے ، اس کے حالات اور اس سے جڑے واقعات سے بخوبی آگاہ تھا اور اپنی اسی آگاہی کی بنا پہ وہ سارے رستے بولتا ہوا ہی پایا گیا تھا۔

اس نے کسل مندی سے اس فور بیڈ روم میں بیڈ اور نیچے بچھے میٹرس پہ الٹے پلٹے پڑے ان دس لڑکوں کو دیکھا جو سارے رستے بھنگڑے ڈالتے ، سیٹیاں بجاتے اور گانے گاتے آئے تھے اور اب مزے کی ایسی نیند سو رہے تھے کہ یہاں سونے کے مقصد سے ہی آئے ہوں ۔۔۔اس نے اٹھ کر کھڑکی پہ پڑے پردوں کو پیچھے کیا جہاں سامنے چھوٹے بڑے ہوٹلز ، ریسٹورنٹس کی قطار اسے 'بحرین' میں صبح بخیر کہہ رہی تھی ۔ فجر کے فوراً بعد ہی یہ ہوٹل کھلنا شروع ہو جاتے تھے کہ سیاحوں کی آمدورفت تو رات میں بھی جاری رہتی تھی اور صبح صبح سیاح ناشتہ کرنے کے بعد کالام کا سفر اختیار کرتے اور واپس جانے والے یہاں سے لوٹتے تھے۔

بحرین ، سیدو شریف سے ۶۶ کلومیٹر کے فاصلے پہ درال ندی اور دریائے سوات کے سنگم پہ واقع چھوٹا سا خوبصورت قصبہ ہے۔جس کے بازار میں سیاحوں کے لئے ہر طرح کا سامان ہے۔

کل رات ہی وہ پونے آٹھ بذریعہ کوسٹر یہاں پہنچے تھے ۔اسٹوڈنٹ لائف کا یہ آخری ٹرپ تھا ۔اس کے بعد ان کی پڑھائی ختم ہو جانا تھی اور یہاں تک سب کا ساتھ بھی۔

برابر والے کمرے میں ہی دس لڑکیوں میں سے ایک وہ بھی تھی جس کی اسٹوڈنٹ لائف کا وہ پہلا اور آخری ٹرپ تھا۔اسکول کالج میں اسے کسی ٹرپ پہ جانے کی اجازت گھر والوں سے نہیں ملی تھی ، اب بھی نہ ملتی اگر وہ دو دن بھوک ہڑتال نہ کئے رکھتی۔

اس کے گھر والوں کو سیر و تفریح سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ان کے لئے یہ وقت اور پیسے کا ضیاع تھا۔جو فیملی راولپنڈی میں رہ کر ساری زندگی مری نہیں گئی تھی ، وہ شمالی علاقہ جات کا رخ کیوں اور کیسے کرنے والی تھی ۔۔۔؟ وہ اپنی پوری زندگی میں ایک بار مری گئی تھی اور مری پہ مر ہی گئی تھی ۔اس کی امی کی خالہ زاد اپنی فیملی کے ساتھ فیصل آباد سے مری جانے کے لئے آئی تھیں اور اسے بھی ساتھ لے گئی

تھیں۔ واپسی پہ اس کا دل کیا کہ گاڑی سے چھلانگ لگا کر یہیں کسی پہاڑ سے گر گرا جائے اور پاؤں ہاتھ تڑوا لے تاکہ وہ اس علاقے کی مہمان بن جائے لیکن گرمی اور دھول کھانے واپس پنڈی نہ جائے۔۔۔

گھر لوٹ کر وہ دو دن کی رہائش کے قصے ایسے سناتی رہی تھی جیسے برطانیہ میں دو سال گزار کر آئی ہو۔۔۔ جتنے شوق سے اس نے سفرنامہ سنایا، اتنی ہی بیزاریت سے گھر والوں سے سنا اور یہ کہہ کر اٹھ گئے۔

"اب تم لوٹ آئی ہو تو جان لو کہ تمہارے کمرے کی صفائی ہونا ضروری ہے۔ وہاں مہمان بچے خاصا ادھم مچا کر گئے ہیں۔" وہ لوٹ تو آئی تھی لیکن اب وہ بار بار ان پہاڑوں میں لوٹے گی یہ اس نے قسم کھائی تھی۔ لیکن اس قسم کو وہ اگلے نو سال پورا نہیں کر سکی تھی اور اب نو سال بعد اس ٹرپ کی صورت اس کی وہ معصوم سی قسم پوری ہونے جا رہی تھی۔ سیاحت اپنے اندر ایک طلسم رکھتی ہے جس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔

رات وہ آٹھ بجے جب پہنچے تھے تو ہر طرف چھائے اندھیرے میں اسے کچھ بھی ڈھنگ سے نہ دکھائی دیا تھا۔ قریبی ہوٹل سے ان کے گروپ نے کھانا کھایا اور واپس کمرے میں آ گئے تھے۔ پانی کا شور البتہ خوب ہی سنائی دیا تھا۔ لیکن اب جو نظارہ کھڑکی کے پار، ہوٹلز کی اس قطار کے بھی پار، اونچے پہاڑوں، سفید دودھیا دریا کے تیز رفتار پانی اور گھر کر آتے بادلوں کی صورت دکھائی دے رہا تھا، وہ کس کافر کو مبہوت نہ کرتا۔۔۔ پوری فضا سکوت اوڑھے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ ٹھنڈی تازہ ہوا میں کھل کر سانس لینا ایک نعمت تھا۔ دریائے سوات کے پانی کی آواز۔۔۔ یہاں پانی بہتا نہیں، دھاڑتا ہے۔

"مینگورہ سے بحرین، کالام، اشوہ اور پھر مہوڈھنڈ جھیل تک دریا ہمسفر رہتا ہے۔" کل ہی عباد نے رستے میں بتایا تھا۔

وہ اس دریا کو ہمسفر رکھنا چاہتی تھی۔

مڑ کر روم میٹس کو دیکھا۔ فور بیڈ روم کو ان دس نے جیسے تیسے شیئر کیا تھا۔ سیاحت ایک مہنگا لیکن شاندار شوق۔۔۔ اس شاندار شوق کو کسی حد تک سستا بنایا جا سکتا ہے اگر رہنے کے لئے واجبی سی

سہولیات والے ہوٹلز کو اپنایا جائے اور ان کے کمروں میں بھی ٹھس ٹھسا کر پورا آیا جائے۔ سارا دن سفر کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں مہنگا کمرہ اور ہوٹل کیا کرنا۔ وہی بچت اچھی سواری اور کھانے پینے پہ سرف کر دی جائے تو کمال کا سفر ہو سکتا ہے۔ یہی عباد نے کیا تھا۔

بحرین تک کا سفر آسان تھا، اس سے آگے کالام اور وہاں سے آگے اشوہ ویلی سے مہوڈھنڈ تک روڈ ناپید تھی۔ ایسے میں ''ٹرانسپورٹ پہ نو کمرومائز'' کا موٹو عباد نے اپنایا تھا۔

کچھ شہنشاہ تھے جنھوں نے عباد کے بک کیے ہوٹل میں رہنے سے صاف انکار کیا تھا۔ انھوں نے اپنا بندوبست کسی مہنگے ہوٹل میں پہلے سے ہی کر لیا تھا۔ لیکن ایسے اسٹوڈنٹس اکا دکا ہی تھے۔۔۔ برگر اور ممی ڈیڈی ٹائپ۔۔۔ زیادہ تر ان کی طرح مست ملنگ تھے۔

''صبح پوری شان سے ہو چکی ہے اس لئے سب پوری چستی سے آنکھیں کھولیں اور تیاری پکڑیں۔ ہم نے آٹھ بجے تک نکل جانا ہے۔'' کل ہی انھیں پلان بتا دیا گیا تھا کہ وہ صبح آٹھ بجے اپنا ضروری سامان باندھ لیں۔ یہاں سے انھیں کالام کے لئے نکلنا تھا۔ ناشتہ ان سب کو کمرے میں ہی ملنا تھا۔ یہاں بھی کچھ من چلے تھے جو پانی کے کنارے ناشتے کی خواہش لئے ایسے ہوٹلز کا رخ کرنا چاہتے تھے جہاں سے وہ دریا کو بخوبی دیکھ سکیں، منہ میں ایک آدھ نوالہ ڈال کر پانی میں ڈبکی لگا سکیں اور نہیں تو سیلفیز بنا بنا کر فیس بک پہ ہی لگا لیں۔

ان کا تین دن کا قیام تھا وہاں۔۔۔ گھر سے اجازت ہی اتنے دن کی ملی تھی۔ شمالی علاقہ جات کا سفر ہی ایک دن نگل جاتا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں گاڑی جتنی بھی اڑا لی جائے سفر موٹروے کی طرح طے نہیں ہو سکتا۔ سڑکیں بھلے ہی کتنی شاندار کیوں نہ بنا لی جائیں۔ گرمی کی تمازت جب وہاں موجود گلیشیرز کو پگھلاتی ہے تو پانی کے چھوٹے بڑے جھرنے اپنا رستہ بناتے ہوئے وہاں کی اچھی پکی سڑکوں کو بھی بہا لے جاتے ہیں۔۔۔ یا پھر کیچڑ بنا دیتے ہیں۔

''ویسے عباد کی معلومات بہت ہیں اس علاقے کے بارے میں۔ اچھا معالج نہ بھی بن سکا تو ایک اچھا گائیڈ تو بن ہی جائے گا۔'' سمیرا کو عباد ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ ویلکم ویک سے ان دونوں کا

عناد چل رہا تھا جو ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ عباد تو بھلا بھی چکا تھا لیکن وہ نہیں بھولتی تھی۔ وہ خاصی کینہ پرور واقع ہوئی تھی جو دوسروں کی غلطیاں اتنی آسانی سے نہیں بھلایا کرتے۔

وہ چاروں جو سیرت گروپ کے نام سے جانی جاتی تھیں، بحرین کی مین روڈ پہ کنارے کنارے آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ صبح صبح گرما گرم مزیدار پراٹھوں، انڈے اور چائے کے ناشتے نے جسم میں توانائی سی بھر دی تھی۔ وہ سب معمول سے زیادہ کھا گئی تھیں۔ نجانے کیوں پہاڑی علاقوں کے سبھی مہمان یہاں آکر سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ یہاں کا پانی ہی ایسا ہے کہ سب ہضم ہوتا ہے اور جلدی ہضم ہوتا ہے۔

''وہ اسی علاقے کا ہے اسی لئے۔'' سیرت نے دھڑا دھڑ تصاویر اتارنا شروع کر دیں۔ سڑک پہ آگے پیچھے انھی کے کلاس فیلو دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ ناشتے کے لئے جاتے ہوئے اور کچھ ناشتہ کر کے اب فوٹو سیشن کرواتے ہوئے۔۔۔ بس آدھا گھنٹہ ہی وہ دریا کے ٹھنڈے پانی میں اتر کر شوق پورا کر سکتی تھیں۔

''کرسٹل کلیئر واٹر۔۔۔'' شفاف دودھیا پانی میں اس نے پاؤں ڈالا تو پورے جسم میں ایک کرنٹ سا ہو کر گزرا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ سخت گرمی میں اتنا ٹھنڈا پانی۔۔۔ اوپر سے برف پگھل پگھل کر آ رہی تھی۔

''جنت میں دودھ کی نہریں بھی ایسی ہی سفید ہوں گی۔'' انشراح نے ایک بڑے پتھر پہ بیٹھتے ہوئے سامنے پانی میں پاؤں ڈالے آئینور کی تصویر لی۔ پانی کا بہاؤ اس قدر تیز ہوتا تھا کہ سطح میں موجود بڑے پتھروں سے پوری قوت سے ٹکرانے پہ سطح پہ سفید جھاگ سی بنتی تھی۔ اسی لئے سارا دریا چاندی میں نہایا لگتا۔۔۔

کوئین لزبتھ ٹو نے اس علاقے کو 1962 کے دورے میں ''منی سوئٹزرلینڈ'' کا نام دیا تھا۔۔۔ وہ اسے اس سے بڑھ کر کوئی اور پیارا نام دینا چاہتی تھی۔

اس نے پانی کو بغور دیکھا جو ایک پل میں اسے مرعوب کرتا اور اگلے پل میں خوفزدہ۔۔۔ سامنے آسمان کے کان میں سرگوشیاں کرتے، مسکرا مسکرا کر اپنے مہمانوں کو دیکھتے پہاڑوں کو اس نے پوری گردن اٹھا کر اوپر تک دیکھا۔ اسے وہ خود پہ گرتے دکھائی دیتے تھے لیکن وہ تو درختوں سے سرسبز،

جھرنوں کو رستہ دکھاتے، مکینوں کو خود میں سمیٹے پوری شان سے کھڑے تھے۔ جس ہستی نے پہاڑوں کو اپنی میخیں کہا کہ جو زمین میں اس نے گاڑھ دیں تاکہ وہ ڈھلک نہ جائے وہ خود کیسا ہوگا۔۔۔؟ فطرت غور کرنے کے کئی موقع دیتی ہے، کئی دروا کرتی ہے، کئی جہاں آباد۔۔۔ سیاح کو چاہئے کہ وہ اس نشید کو کان لگا کر سنے جو فطرت اسے سناتے ہوئے جھوم رہی ہوتی ہے۔۔۔ اس نشید میں رب کی باتیں بہت میٹھے سروں میں سنائی جاتی ہیں۔

اوپر عباد کا گروپ انھیں بلا رہا تھا۔ انھیں مزید سفر کی تیاری کرنا تھی۔ زمین کی جنت۔۔۔ اللہ کی حسین خلقت۔۔۔ شدت سے مہمانوں کی منتظر تھی۔

☆......☆......☆

وہ تیار ہوکر نیچے اتر رہی تھی، اپنے بلو ڈرائی کیے بالوں کو شانے پہ گرائے، ڈیزائنر ویئر پہنے وہ ڈائننگ ہال کا رخ کیئے ہوئے تھی۔ سیڑھیوں سے اترنے سے لے کر ہال میں داخل ہونے تک اس کی ہیل کی ٹک ٹک دانش کے اعصاب پہ بری طرح برس رہی تھی۔ اس میں زچ ہونے والی کوئی بات نہ ہوتی اگر وہ بیوی سے اس قدر بیزار نہ ہوتا تو۔ ناگواری سے اس نے سامنے سے آتی اپنی بیوی کو دیکھا جو اس وقت سے یکسر مختلف دکھتی تھی جب وہ اس کی زندگی میں آئی تھی۔ تب وہ اس سے قدرے بہتر تھی لیکن ہمیشہ جیسی مفاد پرست تھی۔ اس وقت بھی اس کی انگلی کی پوروں پہ ہر شے نپی تلی ہوتی تھی اور اب وہ اس سے کہیں زیادہ کیلکولیٹڈ ہوچکی تھی۔

''پیسہ کم ظرفوں کو ایسا ہی بنا دیتا ہے۔'' یہ بات وہ اس کے منہ پہ کہہ سکتا تھا لیکن فی الحال وہ محض سوچ کر پھر سے سر جھکائے ناشتہ کرنے لگا تھا۔

وہ عام روایتی شوہر نہیں تھا کہ بیوی کے ہاتھوں کا بنا ناشتہ بیوی کے ساتھ بیٹھ کر کرتا۔ اور نہ وہ ایک روایتی بیوی کبھی بن سکی تھی۔ شروع کے دنوں میں اس نے پھر بھی ازراہِ مروت اس کو شوہروں والا پروٹوکول دیا تھا لیکن بعد میں اس تردد سے بھی باز آگئی تھی۔

''زکی تیار ہوگیا۔۔۔؟ آج اس کا اورنج ڈے ہے۔'' ان کے مابین اپنے لئے کوئی وقت تھا نہ

ہی کرنے کو کوئی بات۔ ساری باتیں بچوں کے گرد ہی گھوم پھر کر ختم ہو جاتی تھیں۔ ان کا آپس کا رشتہ اب بچوں ہی کے مرہون زندہ تھا اور شاید کب کا ختم ہو چکا ہوتا اگر بچے بیچ میں نہ ہوتے۔

"ریشم کر رہی ہے اسے ریڈی۔" مارے باندھے جواب دیا گیا۔

"کم از کم بچوں پہ تو تھوڑی توجہ دے دیا کرو۔" سلائس پہ مارجرین لگاتے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔

"صبح میں خود تیار ہوں یا بچوں کو کروں۔۔؟ اتنے شارٹ ٹائم میں اتنا کچھ کرنا ممکن نہیں ہے یہ جان کر بھی ایسی بات کرنا اپنا فرض سمجھتے ہو جو میرا موڈ اور دن خراب کر دے۔" اس نے ملامتی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔ اپنے بلو ڈرائی بالوں کو اس نے ماتھے پہ آنے سے روکا جن کے لئے وہ صبح صبح اٹھ کر اپنی نیند قربان کرتی تھی۔

"اپنے بالوں کے اسٹائل، کپڑے جوتوں کی میچنگ، جیولری کی سلیکشن کے لئے تمہارے پاس وقت نکل آتا ہے۔ بچوں کے لئے نہیں نکل سکتا۔ ہاؤ فنی نا۔۔۔؟" وہ طنزیہ مسکرایا اور ایک پل میں اس کی مسکراہٹ سمٹ بھی گئی۔ اس کی یہ مسکراہٹ ہمیشہ آگ لگانے کا کام کرتی تھی اور آگ لگ چکی تھی۔

"میں کوئی ہاؤس وائف نہیں ہوں جو تمہارے یہ میٹھے طنز برداشت کر لوں گی۔ آئی ایم آ ڈاکٹر۔۔۔ تمہیں اتنی تکلیف ہے تو بچوں کیلئے فل ٹائم گورنس رکھ لو لیکن مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں تمہارا گھر اور بچے سنبھالوں گی۔ مجھے میرا پروفیشن بہت عزیز ہے اور میں اس میں آگے سے آگے جانا چاہتی ہوں۔ گھر بار بچوں میں پڑ گئی تو کہیں کی نہیں رہوں گی۔" وہ چبا چبا کر ایک ایک لفظ ادا کر رہی تھی۔ گویا روز کی لڑائی کا آغاز ہونے جا رہا تھا۔

"بچوں کے لئے گورنس ہو۔ گھر کے کاموں کے لئے ریشم ہے۔ تمہارے شوہر کی دیکھ بھال تک ریشم کرتی ہے۔ تو پھر میں ریشم سے ہی کیوں نا شادی کر لیتا۔ تمہارا سر درد پالنے کی مجھے کیا ضرورت تھی۔۔۔؟" اس کا پارہ چڑھ چکا تھا۔

آئے دن ان کے درمیان جھگڑے اب معمول کی بات بن چکے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ دونوں کو ہی ایک دوسرے میں کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی تھیں، خامیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

''بہتر ہوتا اگر تم یہی کرتے تو۔۔۔ یوڈیزروہر (تم اسی کے قابل تھے)۔۔۔ میرے جیسی ہائلی کوالیفائیڈ لڑکی کے تم قابل تھے بھی نہیں۔'' اپنی ڈگری کا اسے ہمیشہ سے ہی زعم رہا تھا اور وہ کسی کو بھی خاص کر شوہر کو جتانا نہیں بھولتی تھی۔ اس کی اس بات سے دانش کو خاص چڑ تھی۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتا تھا اگر وہ اس سے باز آجاتی اور وہ سب سے باز آسکتی تھی سوائے اس ایک بات کے۔

کچھ لوگ ڈگریز کے ڈھیر محض اس لئے لگا لیتے ہیں کہ اس سے دوسروں کو نیچا دکھا سکیں۔ ان کو دو کوڑی کا کر کے خود کی تسکین کا سامان کر سکیں۔

''ہائلی کوالیفائیڈ۔۔۔'' وہ استہزائیہ مسکرایا تھا۔ اور دونوں ہاتھ میز پہ مارتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''جہاں سے اتنی ہائی کوالی فیکیشن حاصل کی تھی وہیں سے تھوڑے سے مینرز بھی حاصل کر لیتی۔''

''میں بدتمیز ہوں۔۔۔؟'' وہ پلیٹ پرے سرکاتے غصے سے پھٹ پڑی۔

''اور تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو۔ کیا اوقات ہے تمہاری۔۔؟ سارے سرکل میں ڈاکٹر بیوی کو فخر سے پیش کرتے ہو کہ تم جیسے معمولی اکاؤنٹنٹ کو اتنی پڑھی لکھی بیوی ملی ہے اور اب تم مجھے بتاؤ گے کہ میں بدتمیز ہوں۔''

''اپنی اوقات تو تم بھول گئی ہو کیونکہ تمہیں تمہاری اوقات سے زیادہ جو مل گیا ہے۔ اسی وجہ سے دماغ ٹھکانے پہ نہیں رہا تمہارا۔ بھول چکی ہو کہ جب مجھ سے شادی ہوئی تھی تو کیا تھی تم۔۔۔؟''

''ایسی کون سی پرائم منسٹر کی اولاد ہو تم اور تمہارا خاندان۔۔۔؟ چار پیسے کیا آگئے دوسروں کو ان کی اوقات یاد دلا رہے ہو۔۔ شاید تم بھول گئے ہو کہ میں جب اس گھر میں آئی تھی تو بھی ڈاکٹر ہی تھی اور تم ایک معمولی اکاؤنٹنٹ۔ آج میں ایک کامیاب سرجن ہوں اور تم وہیں کھڑے ہو۔ اس گھر کے زیادہ تر خرچے میری کمائی سے پورے ہو رہے ہیں، تمہارے باپ کی کمائی سے نہیں۔'' لہجے میں رعونت اور

حقارت یکجا ہو گئی تھیں۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اپنی ڈگری کو گلے کا ہار بنا کر گھومے یا کم از کم ماتھے پہ کندہ کروا دے اور کچھ نہیں تو سر پہ ایک تاج پہن کر ہی گھومے کہ "میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ جی جی میں ڈاکٹر ہوں۔"

لیکن یہ کام وہ چلتے پھرتے اپنی ہر ادا سے چھلکاتی تھی کہ مجھے تعظیم دی جائے، میرے سامنے ادب سے سر جھکایا جائے کیونکہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ مجھے سر آنکھوں پہ بٹھایا جائے، ہاتھوں ہاتھ لیا جائے کیونکہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ اس کا نام بھلے نہ پکارا جائے لیکن اسے ڈاکٹر ضرور بلایا جائے۔

"اور تم بھول گئی ہو کہ یہ میرے باپ اور میری کمائی ہی تھی جو تمہیں اتنا پڑھایا اور سرجن بنایا ورنہ تم تھی کیا، ایک معمولی ایم بی بی ایس۔۔۔" میڈیکل کالج کی ٹاپر، ذہین فطین، اپنی شعبے کی ماہر۔۔۔ اس نے سوچا بھی کیسے کہ وہ اس کے لئے 'معمولی' جیسا لفظ

استعمال بھی کر سکتا ہے۔ کبھی اسی ایم بی بی ایس کے لئے اس نے باپ سے ٹکر لی تھی کہ وہ شادی کرے گا تو بس کسی ڈاکٹر سے ورنہ نہیں۔ اور اسی ضد میں اس نے اپنی بھابھی کی کزن کا انتخاب کیا تھا۔ کیا ہو گیا اگر وہ معاشی اعتبار سے ان کے ہم پلہ نہیں تھے تو بھی، لڑکی ڈاکٹر تھی، خوبصورت تھی اور اس کے لئے یہی کافی تھا کہ جب وہ اسے پہلو میں لئے کہیں سے بھی گزرے گا تو سب کی نگاہوں کا مرکز بن جائے گا لیکن اب وہی رشتہ اس کے لئے سر درد بن گیا تھا۔

"ایم بی بی ایس معمولی بات ہے تمہارے نزدیک تو تم کر کے دکھا دیتے، ایک گھسی پٹی یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری لے کر ایک دو ٹکے کی کمپنی میں اکاؤنٹنٹ بھرتی ہو گئے اور یہاں کھڑے ہو کر مجھے معمولی کہہ رہے ہو۔" یہ جملہ اتنا ہتک آمیز تھا کہ اس کی کانوں کی لوئیں سرخ پڑ گئی تھیں اور ماتھا عرق آلود ہو گیا تھا۔

وہ جواب دیتے دیتے یکدم تھم گیا تھا۔ سامنے شیشے کے دروازے کے پار سیڑھیاں اترتے زکی کو وہ بخوبی دیکھ چکا تھا۔ وہ صبح صبح یہ سب ہنگامہ اس کے سامنے کر کے اس کا دن خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اب بکواس بند کرو۔ زکی آ رہا ہے۔" اپنے حصے کا جواب وہ پھر کبھی پہ اٹھا کر، اپنی آواز کو

دباتے، منمنایا تھا کہ زکی سن نہ سکے۔ زکی سیدھا ڈائننگ کی جانب ہی آرہا تھا۔ اسکول میں آج اورنج ڈے تھا اور وہ اس حوالے سے پہلی بار اسٹیج پہ پرفارمنس دینے جارہا تھا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی۔ رات بھی وہ اسی خوشی میں ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا کہ کب صبح ہو اور وہ اسکول جا کر پرفارم کرے۔

''اچھا ہے اسے سننے دو۔ اسے بھی تو پتا چلنا چاہئے کہ اس کا مہان باپ کیا ہے۔۔۔؟'' وہ سینے پہ ہاتھ باندھے اب مسکرا کر کچھ محظوظ ہوتے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ زکی کے سامنے وہ اسے کچھ نہیں کہتا تھا۔ ایسے میں وہ اسے چڑا کر بہت مزہ لیتی تھی۔۔۔ بیٹے کے سامنے اس کی حالت ایسی ہو جاتی تھی کہ اگر اسے اس عورت کے قدموں میں گر کر بھی اسے خاموش ہو جانے کی استدعا کرنا پڑتی تو وہ یہ بھی کر گزرتا۔ اس کی زکی کے سامنے زبان بندی کے لئے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا اور یہی بات اسے شہہ دیتی تھی۔

''ول یو پلیز شٹ اپ۔۔۔؟'' وہ دانت پیس کر کہتے اب زکی کو دیکھ رہا تھا جو ڈائننگ ہال کا سلائیڈنگ ڈور دھکیل رہا تھا۔

''گڈ مارننگ پاپا۔'' دونوں بازو وا کر کے وہ باپ سے لپٹ گیا تھا۔ اس کا باپ زمین پہ پنجوں کے بل بیٹھا اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کر کے اس کے گال چوم رہا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی اس کا خیر مقدم کرتا تھا۔

''شروع ہو گیا ڈرامہ۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اب پھر سے ناشتہ کرنے لگی تھی۔ اولاد سے ایسا پیار اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ محبت کے اظہار کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے ہی محدود رہی تھی البتہ غصے اور نفرت کو وہ جی بھر کر دوسرے کے وجود پہ لٹاتی تھی۔

''آپ کے اسکول کے لئے اورنجز میں رات میں لے آیا تھا۔ ریشم آپ کو باسکٹ میں ڈال دے گی۔'' گود میں بٹھائے وہ اسے سلائس کے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر دے رہا تھا۔

زکی کن اکھیوں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ جو کام اس کی ماں کو اس کے لئے کرنا چاہئے تھا وہ ہمیشہ باپ کرتا تھا۔ نجانے اس کی ماں کی ممتا اتنی ٹھنڈی کیوں تھی کہ ساری محبت کی گرمائش کو نگل جاتی تھی۔

''کیا آپ دونوں آئیں گے میری پرفارمنس دیکھنے۔۔۔؟'' اس نے باری باری دونوں کو دیکھتے پوچھا تھا۔

''میں پوری کوشش کروں گا آنے کی۔ آج کل کام بہت زیادہ ہے تو آفس سے نکلنا پاپا کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ماما آجائیں گی۔۔۔ کیوں ماما آپ جائیں گی نازکی کے اسکول۔۔۔؟'' اس نے نظروں ہی نظروں میں بیوی سے التجا کی تھی کہ وہ جانے کی حامی بھر لے۔ زکی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''چلی جاؤں گی۔'' قدرے توقف سے اس نے جواب دیا اور زکی کو دیکھ کر بمشکل مسکرائی تھی۔ جواب میں وہ بھی مسکرا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ماں کی بات کو لے کر بے یقینی تھی۔ اب تک کی ساری پیرنٹس ٹیچر میٹنگز میں اس کا باپ اکیلا آتا تھا۔ ماما کی مصروفیات پاپا سے کہیں زیادہ تھیں یا پاپا کی محبت بہر حال وہ ہمیشہ باپ کو اسکول پاتا اور ماں کے لئے منتظر ہی رہتا۔

''ڈونٹ وری ماما آجائیں گی۔'' گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ زکی کو بٹھاتے اس نے محبت سے اس کا گال چومتے اسے تسلی دی تھی۔ وہ مسکرا کر مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کے پاپا نے کہا تھا تو اسے یقین تھا کہ ماما ضرور آئیں گی۔ اس کا باپ اس کی ماں کو کسی طور بھی منا لے گا وہ جانتا تھا۔

☆......☆......☆

فاطمہ نے بے یقینی سے اپنی ماں کی جانب دیکھا۔ جو کچھ بھی وہ کہہ رہی تھیں اس کے لئے ناقابل یقین تھا، بالکل ناقابل قبول۔۔۔ متحیر نگاہوں سے خود سے دائیں جانب بیٹھی بڑی بہنوں پہ نگاہ دوڑائی جن کے تاثرات اس سے قدرے مختلف تھے۔ وہ دونوں بیزار سی ماں کی بات یوں سن رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ آپ یہ سب ہمیں بتا کر ہمارا وقت کیوں برباد کر رہی ہیں۔۔۔؟ اس بات سے نہ تو انھیں کوئی فرق پڑا تھا اور نہ ہی پڑنے والا تھا۔

اس کی سب سے بڑی بہن اپنا میڈیکل مکمل کر کے اب ہاؤس جاب کر رہی تھی جو کہ پیڈ (paid) تھی اور اس سے اپنا خرچا بخوبی نکل سکتی تھی۔ ان کا طرزِ زندگی ہمیشہ سادہ رہا تھا سو کسی نے بھی ایسے اخراجات نہیں پالے تھے جو محدود آمدن میں اٹھائے نہ جا سکیں۔۔۔ یوں بھی اس کا رشتہ ایک کزن

کے توسط سے اونچے گھرانے میں طے ہو گیا تھا جہاں وہ نہ صرف مزید تعلیم جاری رکھ سکتی تھی بلکہ چاہتی تو پڑھنے باہر بھی جا سکتی تھی یا یہیں رہ کر اپنا چھوٹا موٹا کلینک تو چلا ہی سکتی تھی سوا سے اس گھر کے مسائل سے کیا لینا دینا تھا۔ وہ ہمیشہ سے گھر کے مسائل میں کم ہی دلچسپی رکھتی تھی۔ اس کے لئے اس کا محور بس اپنی ذات تھی جس کے گرد وہ گھمن گھیریاں ڈالتے نہیں تھکتی تھی۔ وہ سکھی تھی یہ اس کے لئے کافی تھا، دوسروں کے دکھوں سے اس کا کچھ بھی لینا دینا نہیں رہا تھا بھلے وہ دکھ اس کے ماں باپ کے ہوں یا بھائی بہنوں کے۔

اس کی دوسری بہن نے پرائیوٹ بی اے کیا تھا اور مزید پڑھنے میں وہ قطعاً دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ یہاں تک پڑھنے میں بھی ابا کی سختی ہی کام آئی تھی کہ وہ پڑھ پائی تھی ورنہ تو شاید وہ میٹرک بھی پاس نہ کرتی۔ ذہین، لائق فائق بہن بھائیوں میں ایک کھوٹا سکہ اکثر نکل ہی آتا ہے تو رامین وہی کھوٹا سکا تھی۔۔۔۔ گھر بیٹھی اس کے کون سے خاص خرچے تھے جن کے لئے وہ پریشان ہوتی۔ دو وقت کی روٹی اور پڑھنے کے لئے ماہنامے تو اسے مل ہی جانے تھے۔ گھر کا ایک کونہ پکڑے وہ پڑی رہتی۔۔۔ اس سے زیادہ بے فکری اور بھلا کیسے ہونا تھی۔۔۔؟ وہ عام سی لڑکی تھی اور اس کے مسائل بھی قریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔

ان دونوں کے چہروں سے نظر ہٹا کر اس نے بائیں جانب بیٹھے بڑے بھائی کو دیکھا جو تیکھے چتونوں ماں کو دیکھ ضرور رہا تھا لیکن اس کا دھیان جیسے کہیں اور تھا۔ ہاتھ میں پکڑی سائیکل کی چابی کو آگے پیچھے گھماتے شاید وہ اندر ہی اندر حساب کتاب لگا رہا تھا کہ وہ اپنی ٹیوشنز سے اپنے اخراجات کیسے پورے کرے گا۔۔۔ وہ ہمیشہ سے جس بھی ادارے میں پڑھتا تھا اس کا ٹاپر رہا کرتا تھا۔ اسکالرشپ پہ اس نے اپنی میٹرک کے بعد کی ساری تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ کبھی بھی ابا پہ بوجھ نہیں رہا تھا۔ اب بھی وہ ملک کی ایک بہترین یونیورسٹی میں اسکالرشپ پہ ہی پڑھ رہا تھا۔ یونیورسٹی ان اسٹوڈنٹس کو جو اسکالرشپ پہ پڑھ رہے ہوتے تھے، مفت ٹرانسپورٹ دیتی تھی۔۔۔ کتابوں، نوٹس جیسے دیگر اخراجات کو وہ اپنی ٹیوشنز کی کمائی سے پورا کر لیتا تھا، پہلے بھی کر رہا تھا، اب بھی کر سکتا تھا۔ پھر بھلا وہ مستقبل کے خسارے گننے کی زحمت کیوں اٹھاتا۔۔۔ جتنا وہ لائق اور قابل تھا تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ جہاں بھی نوکری کے لئے جاتا اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔

اس کے تینوں بہن بھائی ہمیشہ سے ہی اپنی ذات میں مقید رہے تھے۔ بہن بھائیوں کی فطری قرابت اسے کبھی ان سے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ جو کسی ایک کا دکھ سب کی آنکھ رلاتا ہے، وہ رشتہ ان میں سے کبھی کسی کا بھی نہیں رہا تھا۔ شاید اس لئے بھی کہ وہ ان سب سے کافی چھوٹی تھی۔ وہ تینوں اوپر تلے کی اولادیں تھیں اور ان میں سے سب سے چھوٹے یعنی بھائی سے وہ چھ برس چھوٹی تھی۔ ایک ان چاہی اولاد، ان چاہی بہن۔

یہاں کسی کو بھی امی کی کسی بات سے فرق نہیں پڑا تھا۔ فرق اگر کسی کو پڑ رہا تھا تو اکیلے اسی کو پڑ رہا تھا۔ ابھی اس نے میٹرک کے امتحان ہی تو دیے تھے کہ یکدم یہ سب ہو گیا تھا۔ امی جو کچھ بتا رہی تھیں، سمجھا رہی تھیں وہ سمجھنے سے قاصر محض خالی نظروں اور ذہن سے ماں کو تک رہی تھی۔۔۔ وہ ذہین تھی، ہوشیار تھی مگر سب سے چھوٹی تھی۔ ابھی تو زندگی نے خواب بننا ہی شروع کیے تھے کہ ست رنگی بلبلہ اوپر اڑتا ہوا اچانک پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔۔۔ اسے ابھی آگے پڑھنا تھا، ڈھیر سارا، جتنا وہ پڑھنا چاہتی تھی۔۔۔ اپنی بڑی بہن کی طرح ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ لیکن میڈیکل کی مہنگی تعلیم اب اس کے ابا افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی نوکری اب ختم ہو گئی تھی۔ یہ بات وہ اپنے منہ سے نہ بھی کہتے تو بھی وہ جانتی تھی۔ ساٹھ سال کی عمر میں پرائیوٹ کالج نے انھیں ریٹائر کر دیا تھا حالانکہ وہ ابھی بھی بخوبی پڑھا سکتے تھے اور پڑھا رہے تھے۔ انھیں لگتا تھا کہ ابھی ان کا دماغ تازہ دم ہے لیکن جسم کا کیا کرتے جو ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ کمر کے مہرے جواب دے چکے تھے، وجود میں سرایت ہو چکی لرزش سب کی نظروں سے چھپی نہیں رہی تھی۔ پروفیسر ہو کر ساری زندگی سائیکل پہ اسکول جانے والے کی ٹانگیں سائیکل کے پیڈل چلانے سے کب کی انکاری ہو چکی تھیں پھر بھی وہ انھیں گھسیٹ رہے تھے۔۔۔ صرف اپنے خاندان کے لئے۔

''سائیکل چلانا چھوڑ دوں گا تو جو روزانہ تھوڑی بہت ورزش ہو جاتی ہے وہ چھوٹ جائے گی۔۔۔ دو دن میں بستر سے لگ جاؤں گا۔۔۔ کسی کام کا نہ رہوں گا پھر۔ اور ابھی تو مجھے زندگی کو بہت سال جینا ہے۔'' ابا بہت ہنسنے ہنسانے والے انسان تھے۔ فکروں کو چھپائے بے فکری سے قہقہے لگاتے رہتے۔ انھوں نے کبھی زندگی کی تلخیوں کو لہجے تو کیا چہرے تک پہ نہ آنے دیا تھا۔

''اب آپ کی عمر نہیں رہی پروفیسر صاحب کہ سائیکل پہ خود کو گھسیٹیں۔'' امی اکثر سمجھاتیں۔ وہ ڈرتی تھیں کہ اگر انھیں ہلکی سی ٹھیس بھی پہنچی تو وہ ایک بڑا دھچکا ثابت ہوگی۔

''کیا ہوا ہے میری عمر کو۔۔۔؟ باہر کی دنیا میں مجھ سے بڑی عمر کے لوگ کیسے دوڑیں لگاتے ہیں ۔۔کبڈی، رسہ کشی، تیراکی، جمناسٹک کیا کچھ نہیں کرتے۔۔۔؟ اتنے بڈھے بابے ایسے بچوں کی سی لچک لئے اچھلتے کودتے ہیں اور تم مجھے سائیکلنگ سے ڈرا رہی ہو۔ تم بھلے خود کو بڑھیا مان لو لیکن میں نہیں مانتا کہ میں ابھی سے بوڑھا ہو گیا ہوں اور جو انسان خود ہار تسلیم نہ کرے اسے کوئی نہیں ہرا سکتا۔''

سب کو سنانے کے لئے ان کے پاس یہ ٹھوس دلیل تھی لیکن اندر سے سب سمجھتے تھے کہ موٹر سائیکل خریدنے اور اس کا پیٹرول ڈلوانے کو وہ شاہ خرچی سمجھ کر سائیکل چلا کر بچت کر رہے تھے۔ وہ اس گھر کے واحد سربراہ تھے جن کی آمدن محدود تھی اور وہ اس محدود آمدن کو اپنے بچوں کے لئے پائی پائی جوڑ رہے تھے۔ ان کے شاندار حال اور روشن مستقبل کی خاطر۔

''بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی کچھ سیکھو ان گوروں سے۔۔۔ ان کی بڈھیاں دیکھو، تمہاری ماں کی عمر کی ہوں گی اور کیسے میک اپ کے سارے لوازمات منہ پہ آزما کر، سرخ شوخ لپ اسٹک لگائے، ٹک ٹک ہیل پہنے بھاگی دوڑی پھرتی ہیں جیسے ابھی ابھی جوانی کی دہلیز پہ کھڑی ہوئی ہوں۔'' وہ امی کو اکثر میک اپ ٹوٹوریل دکھاتے اور امی انھیں دیکھ دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگائے توبہ استغفار پڑھتیں۔ کسی کونے کھدرے میں کتاب لئے وہ دبکی اپنی ہنسی کو دبا لیتی لیکن ابا کی باتوں پہ خوب ہنستی۔ اسے ابا بہت پیارے لگتے تھے لیکن امی سے ڈر لگتا تھا کہ وہ ڈانٹتی اور گھورتی بہت تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ باقی بہن بھائیوں کی نسبت امی ابا کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی تھی۔ ایسے وقت میں امی کے تاثرات اور ابا کی شرارت اسے بہت مزہ دیتی تھی۔

''یہ ہم لوگ ہی خود پہ جلد بڑھاپا طاری کر لیتے ہیں اور بستر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ گوروں سے سیکھو کہ موت سے پہلے زندگی جینا کبھی نہیں چھوڑنا چاہئے۔'' ابا زندگی کو لے کر بہت پر جوش ہوا کرتے تھے۔۔۔ اب جب سے وہ اس قدر بیمار پڑے تھے، نوکری ختم ہوگئی تھی، حالات بدل گئے تھے تو وہ بھی

بدل گئے تھے۔۔۔گرمجوشی مایوسی میں ڈھل گئی تھی۔۔۔ایک ماہ نے انھیں یکدم بوڑھا کر دیا تھا۔وہ ابا سے کہنا چاہتی تھی کہ زندگی جینا کیوں چھوڑ دی، ابھی تو موت دور ہے۔۔ پیاری حسین زندگی اتنی بدصورت کیوں ہوگئی۔۔۔لیکن وہ اتنی ہمت نہ دکھا سکی کہ باپ کی ہمت بڑھاتی۔اس کے پیارے سے ابا جنھیں وہ دل میں ہی بہت پیارا سمجھتی تھی، باہر سے ڈھیروں احترام کرتی تھی، بہت بدل گئے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد چند لاکھ ان کو سی پی فنڈ کی مد میں ملنا تھے جس سے انھوں نے بیٹیوں کی شادیاں کرنا تھیں۔امی نے صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ اب ان کے پاس اتنا ہی سرمایہ ہوگا کہ وہ تینوں بچیوں کی شادیاں باعزت طریقے سے کرسکیں۔حتیٰ کہ ابا اپنی کمر کے علاج کو بھی ٹال رہے تھے۔

ایسے میں اس کے ڈاکٹر بننے کا مطلب تھا کہ اس کی بہنوں کو بنا کسی جہیز کے رخصت کیا جاتا اور امی اس کے بالکل حق میں نہیں تھیں۔ بھلا بنا جہیز کے کون اس دور میں ان کی تین تین بیٹیوں کو بیاہ کر لے جائے گا۔معمولی نوعیت کا سہی کچھ تو دینا ہی تھا۔کم پیمانے پہ ہی سہی بیٹیوں کو چند لوگوں کی موجودگی میں رخصت تو کرنا ہی تھا۔ دنیا میں رہنا ہے تو دنیاداری کو اوڑھنا بچھونا بنانا پڑتا ہے۔یہ اختیار نہیں مجبوری بن جاتا ہے۔

''ابا نے کیوں میرے لئے کچھ سوچ کر نہیں رکھا تھا جب وہ جانتے تھے کہ وہ ریٹائر ہونے والے ہیں۔۔۔کیا اب میں سب سے چھوٹی اولاد ہونے کا تاوان ادا کروں گی۔۔؟'' چند ہزار کی پرائیوٹ نوکری سے بھلا ایک سربراہ کتنی بچت کر سکتا تھا، بس اتنی ہی اس کے باپ نے کی تھی۔یہ بات وہ جانتی تھی، سب حالات وہ جانتی تھی پھر بھی ہر انسان کی طرح اس نے شکوے کو دل میں جگہ بنانے کے لئے رستہ دے ڈالا۔

محفل برخاست ہو چکی تھی، سب جا چکے تھے اور وہ وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں نے امی کا دل پگھلا دیا تھا۔لیکن وہ اسے تسلی دے سکتی تھیں، ان کے پاس وہی تھی دینے کو۔۔۔رقم نہیں تھی تو نہیں دے سکتی تھیں۔

امی نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔اتنی ہی محبت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''خواب دیکھنا برا نہیں ہوتا لیکن خوابوں کو حقیقت بنانے کے لئے طاقت اور موافق حالات چاہیئے ہوتے ہیں۔ ہوا کا رخ قدموں کا ساتھ نہ دے تو انسان صرف تھکتا ہے، گرتا ہے اور اپنے خوابوں سمیت ٹوٹ جاتا ہے۔'' ان کی بات پہ ڈھیر آنسو اس کے حلق میں اترتے دل میں جذب ہوئے تو ایک ٹیس نے جنم لیا اور پھر وہ سارے وجود میں پھیل گئی۔

وہ امی کو کیسے بتاتی کہ اس کے کتابوں کے ڈھیر میں ایک چھوٹی ڈائری بھی ہے جہاں اس کے چھوٹے موٹے، کھلی آنکھوں سے دیکھے گئے خوابوں کی ایک فہرست ہے۔ اس فہرست میں سب سے اوپر لکھا گیا خواب اس کا ڈاکٹر بننا ہے۔ سب سے اوپر لکھے اور اولین درجے پہ رکھے خواب کو وہ نیچے لکھ سکتی ہے، دوسرے درجے پہ بھی لا سکتی ہے لیکن مکمل طور سے مٹا نہیں سکتی۔ ایسا کوئی ربڑ ابھی نہیں بنا تھا کہ اس کی کچی عمر کے پکے خوابوں کو مٹا سکتا۔۔۔ خواب ہمیشہ انسان کے اندر زندہ رہتے ہیں، دب سکتے ہیں، مر نہیں سکتے۔

وہ اس سے اتنی بڑی قربانی نہ مانگیں جو وہ دے نہ سکے لیکن وہ جانتی تھی کہ اسے یہ قربانی دینا ہو گی۔ اس کے ماں باپ مجبور تھے اپنی تنگدستی کے ہاتھوں۔

اس رات وہ کھانے پہ نہیں آئی تھی۔ وہ چھت کی ممٹی پہ گھٹنوں پہ سر رکھے روتی رہی تھی۔ اس کے باقی بہن بھائی مطمئن تھے کیونکہ وہ قریب قریب اپنی منزل پہ تھے، تکلیف میں تو وہ تھی جس کا سفر شروع ہی نہیں ہوا تھا اور ختم بھی ہو چکا تھا۔۔۔ سامنے بس اندھیری سرنگ تھی، مایوسی کی علامت۔۔۔ اور وہ مایوس ہو رہی تھی۔

''اللہ بھی کبھی کسی کو سب کچھ دے دیتا ہے اور کبھی کسی کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ اس نے مجھے کچھ بھی نہیں دیا۔'' نیچے آنے سے پہلے وہ مایوس ہو چکی تھی۔

اس نے پورا ایک ہفتہ چھپ کر، روتے ہوئے گزارے تھے۔ کبھی ممٹی میں، کبھی چھت کی سیڑھیوں پہ، کبھی غسل خانے میں۔ لیکن اس کی متورم آنکھیں اور سرخ ناک دیکھ کر کبھی کسی نے اس سے سوال نہیں کیا تھا۔ وہ سب جانتے تھے کہ وہ کس بات کا ماتم منا رہی ہے۔ وہ سب اس ماتم کے خاتمے

کے انتظار میں تھے کہ اس کا حل ان کے پاس نہیں تھا۔ آپ کے کچھ مسائل بس آپ کے اپنے ہی ہوتے ہیں، دوسروں کے نہیں۔ اسی لیئے ان کا حل بھی آپ کو خود ڈھونڈنا پڑتا ہے، کوئی آپ کے لیئے یہ کام نہیں کرتا۔ اسے بھی یہ کام خود کرنا تھا۔

وہ گھر سے نکل آئی اور بنا مقصد گھومتی رہی ۔۔۔ گھر کے آس پاس کی سڑکوں پہ ہی کتنے چکر لگا چکنے کے بعد وہ تھک ہار کر سایہ دار درخت میں بیٹھ گئی ۔۔۔ بلا وجہ ہنسنے اور خوش ہونے والی کو اب ہنسنے اور خوش ہونے کے لیئے وجہ درکار تھی۔ وہ آتے جاتے لوگوں کی مسکراہٹوں اور قہقہوں سے چڑ رہی تھی کہ آخر ایسا بھی کیا ہے کہ وہ ہنس رہے ہیں، گھوم پھر رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں۔

اداسی میں انسان بہت خود غرض ہو جاتا ہے۔ وہ ساری دنیا پہ ایک ہی رنگ دیکھنا چاہتا ہے ۔۔۔ اداسی کا رنگ ۔۔۔ جو اس وقت اس کا اپنا رنگ ہے۔

اس شام وہ بنا کسی کو بتائے قریبی پارک میں چلی آئی تھی۔ تازہ ہوا میں گہری سانس اسے یہ سکھا رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ زندگی جو متحرک ہے، جمود موت ہے۔ اسے زندگی کا تھوڑا بہت ہی صحیح حق ادا کرنا چاہیے۔ آگے بڑھنے کے لیئے کوئی رستہ متعین کرنا چاہیے۔

پارک میں خاصی گہما گہمی تھی۔ وہ اداس نظروں سے لوگوں کے روشن، ہنستے چہروں کو دیکھ رہی تھی۔ دنیا تو دکھی نہیں تھی پھر وہ کیوں اس کے سوگ میں شامل حال ہوتی ۔۔۔؟ انسان کو اپنے حصے کے دکھ اکیلے اٹھانے پڑتے ہیں۔ سکھ میں ہر کوئی پاس آنے، مسکرانے، قہقہے لگانے کے لیئے تیار ہوتا ہے لیکن دکھ میں سب دامن بچا کر نکلنا چاہتے ہیں۔

ایک چہرے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرے کا سفر اسے سوچنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

"سب کے لیئے زندگی کیسی آسان اور پیاری ہے۔ ایک سوائے میرے ۔۔۔"

مشکل پڑنے پہ ہر انسان اسی سوچ کو اپنے اندر گھر کرتا ہے۔ وہ دنیا کے مظلوم ترین انسان کا لبادہ اوڑھ کر ہمدردی کا کاسہ اٹھائے پھرتا ہے کہ کوئی اس میں رحم کے چند سکے ڈال دے۔ اس نے بھی یہی کیا۔ فوراً سے مجبور اور مظلوم بن گئی۔

''کچھ لوگی باجی۔۔۔؟'' آٹھ نو سالہ صاف حلیے والی بچی ایک ٹوکری میں کچھ پنیں، پونیاں، بینڈز قرینے سے سجائے اس سے پوچھ رہی تھی۔

اس نے سر نفی میں ہلاتے دوسری جانب موڑ لیا۔

''کچھ تو لے لو باجی۔۔۔ بھیک تو نہیں مانگ رہی، بیچ رہی ہوں۔'' التجا وہ کر رہی تھی، رونا اسے آ رہا تھا۔

''پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔۔۔'' اس نے خالی ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیے۔ وہ گھر سے بنا کچھ لئے خالی ہاتھ ہی نکلی تھی۔ خالی پرس اٹھا کر کندھے پہ اضافی بوجھ لئے وہ کیوں پھرتی۔۔۔؟

بچی ایک میٹھی مسکان لبوں پہ سجائے آگے بڑھنے لگی تو اس نے روک لیا۔

''تم پڑھتی نہیں ہو۔۔۔؟؟ یہی کام کرتی ہو۔۔۔؟''

''تبھی تو یہ بیچتی ہوں کہ پڑھ سکوں۔۔۔'' بڑی پیاری چمک تھی ان آنکھوں میں۔

''پڑھائی کمانے سے تھوڑا ہی روکتی ہے۔'' بولتے ہوئے وہ ٹوکری میں رکھی چیزوں کی ترتیب درست کر رہی تھی۔

''تو تمہاری اماں یا ابا کیوں نہیں کماتے۔۔؟'' پچھلے ایک ہفتے سے اس نے گھر میں کسی کو مخاطب کیا تھا نہ ہی کوئی بات کی تھی۔ اب اس بچی سے بات چیت کرنا اسے اسی لئے اچھا لگ رہا تھا۔

''وہ تو بس اتنا کماتے ہیں کہ ہمیں کھلا سکیں۔ پڑھنے کا شوق تو مجھے ہے۔ شوق ایویں تو پورے نہیں ہوتے، اس کے لئے تو محنت کرنا پڑتی ہے۔ جان مارنا پڑتی ہے۔ یوں بھی میری استانی کہتی ہیں کہ ابا اماں کے کندھوں پہ پڑھائی کا بوجھ نہ ڈالو۔ اپنا بوجھ خود اٹھاؤ۔ اتنا تو گدھے بھی کرتے ہیں نا کہ دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ کیا ہم گدھے سے بھی گئے گزرے ہیں۔۔۔؟'' بچی باتوں کی شوقین لگتی تھی۔ پٹر پٹر بول رہی تھی۔ اسے کسی دوسری جانب سے صدا لگی تو وہ مسکرائی اور اس طرف بڑھ گئی۔ وہ حیرت سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ اتنی سی عمر میں وہ کیسی کمال اور پتے کی بات بتا گئی تھی۔

''کیا وہ گدھے سے بھی گئی گزری ہے۔۔۔؟'' اس نے سوچ کر نفی میں سر ہلایا۔ ساری زندگی ''گدھے'' نام کے جانور کا طعنہ دوسروں کو دیتے کبھی حضرتِ انسان یہ نہیں سوچتا کہ وہ کسی کے حصے کا کتنا بوجھ اٹھا کر میلوں چلتا ہے اور یہاں انسان اپنا بوجھ اٹھاتے ہوئے مظلوم اور دکھیارا بن جاتا ہے۔

یہ حالات نہیں تھے جو اسے خود ترسی سکھا کر کھوکھلا کر رہے تھے۔ یہ وہ خود تھی جو مضبوط بننے کی بجائے کمزور بن رہی تھی۔۔۔ بہادری دکھانے کی بجائے، اندر سے ٹوٹ رہی تھی۔

کوئی بھی نہ پیدائشی کمزور ہوتا ہے نہ ہی مضبوط۔۔۔ وقت اور حالات کے ساتھ انسان یہ ڈھنگ سیکھ جاتا ہے۔

ایک نئی درز کھلی اور تازہ ہوا اندر داخل ہوئی۔ اب زندگی نئی استاد بننے جا رہی تھی، نئے اسباق پڑھانے جا رہی تھی۔ وہ سبق جو کوئی صاحبِ مکتب بھی حاصل نہیں کر سکتا اب اسے سیکھنا تھے۔ اپنا مقدمہ زندگی سے خود لڑنا اور اپنا دفاع خود کرنا تھا۔

اسی شام وہ گھر آتے ابا امی کے سر ہوئی تھی۔

"آپ مجھے کتنی رقم ادھار دے سکتے ہیں۔۔۔؟ فکر مت کریں، جتنا لوں گی اتنا لوٹا بھی دوں گی۔ بس کچھ وقت لگے گا۔ بس وقت دے دیجئے گا مجھے۔ اتنا حق تو میں رکھتی ہی ہوں۔" وہ بہت کمپوزڈ سی ماں کے سامنے بیٹھی ان سے پوچھ رہی تھی۔ وہ اپنے بے بس ماں باپ پہ اپنی خواہشات کا بوجھ کیوں لادتی۔ وہ اسے پڑھانے سے انکاری تو نہ تھے۔ اس کا بنیادی حق اسے دینے پہ وہ ہر طرح سے آمادہ تھے۔ اپنے فرائض سے غفلت وہ کسی طور برتنے کو تیار نہیں تھے بس وہ اس کی مہنگی تعلیم کی خواہش پوری نہیں کر سکتے تھے۔ ایسا وہ جان کر نہیں کر رہے تھے۔ وہ مجبور تھے اور بس۔۔۔

"رقم کا کیا کرو گی تم۔۔۔؟" وہ حیران ہوئی تھیں۔

"اپنی پڑھائی پہ لگاؤں گی۔"

"تم اب تک اس سوچ سے باہر نہیں نکل سکی۔۔؟" وہ جو سمجھ رہی تھیں کہ دو ہفتے بعد وہ سنبھل چکی ہے، وہ غلط سمجھ رہی تھیں۔

"تمہیں سمجھنا چاہیے بیٹا کہ جتنا ہم کر سکتے تھے ہم نے کیا۔ مزید بھی کریں گے لیکن وہ نہیں کر سکتے جو تم چاہتی ہو۔ لوگ اپنی نالائق اولاد پہ بھی سرمایہ کاری کرتے ہیں کہ وہ کچھ نہ کچھ بن جائے اور ہم اپنی لائق اولاد کے لئے دھیلا نہیں لگا پا رہے۔ اس کے لیے تم ہمیں معاف کر دو۔۔۔" ابا نے سر جھکا لیا تھا۔ ان کی آنکھیں اور آواز دونوں بھرا گئے تھے۔ وہ اس کی خواہش پوری نہ ہو سکنے پہ نادم تھے۔ اسے

اپنے بوڑھے باپ پہ ترس آیا۔ انھیں علاج کی ضرورت تھی لیکن وہ ساری زندگی کی طرح اب بھی اپنی ضروریات کو مار کر اپنی اولاد کے مستقبل کا سوچ رہے تھے۔ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتے تھے کہ وہ اپنا آپ مارتے آئے تھے اور اب بھی مار ہی رہے تھے۔ اس کا دل کیا وہ ابا سے لپٹ کر رو دے۔ اتنا روئے کہ انھیں بھی رلا ڈالے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ابا۔" اس لمحے وہ اپنے سے زیادہ ان کے لئے دکھی ہوئی تھی۔

ابا نے یکدم بے بسی سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تو اس نے تڑپ کر ان کے ہاتھوں کو تھام کر لبوں سے لگاتے چوم لیا۔

ساری زندگی اس کی ہر ضرورت کسی بھی طرح پوری کرنے والا باپ ہاتھ جوڑے اس کے سامنے اب بھی اس سے معذرت ہی کر رہا تھا کہ وہ اس کی مزید ضروریات پوری نہیں کر پائے گا۔

"لیکن مجھے احساس ہے۔" ابا کا سر اٹھا تو اس کا جھک گیا۔ وہ ان کی آنکھوں میں آئی نمی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"ہم تمہیں کسی سرکاری کالج میں داخل کروا دیں گے۔ تم جتنا چاہے پڑھ سکتی ہو۔۔۔۔لیکن ۔۔۔" وہ اس 'لیکن' سے آگے کی کہانی جانتی تھی۔ یہی کہ وہ 'وہ' نہیں پڑھا سکتے جو وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ اسی لئے اس نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

"مجھے منظور ہے۔۔" وہ جانتی تھی کہ وہ میٹرک کے پیپر اتنے اچھے دے چکی ہے کہ کوئی بھی پرائیوٹ کالج اسے اسکالرشپ دے کر اس کا دو سال کا خرچا اٹھا لے گا۔ اس کے لئے امی ابا کو پریشانی نہیں اٹھانا پڑے گی۔

امی ابا کو لگا تھا کہ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ اپنے خوابوں سے دستبردار ہو کر وہ وہی کرے گی جو اب گھر کے حالات اسے کرنے کو کہہ رہے تھے لیکن انھیں غلط لگا تھا۔ وہ 'اپنی سی کوشش' کرنا چاہتی تھی۔ ایک آخری بار، وہ اپنی پوری ہمت آزما لینا چاہتی تھی۔ پھر وہ ناکام بھی ہو جاتی تو کم از کم یہ افسوس نہ ہوتا کہ اس نے سرے سے اپنے حصے کی جنگ نہیں لڑی، طاقت نہیں آزمائی، بہادری نہیں دکھائی۔ ایک بار تو کوشش کرنا اس کا حق تھا۔ حق سے زیادہ اس پہ فرض تھا۔ اس کوشش میں وہ اپنی پوری

طاقت آزمالینا چاہتی تھی۔

محنت۔۔۔یہ ہر انسان کے لئے کھلا در ہے۔اس میں داخل ہو کر منزل پانا، پھر انسان کا نصیب۔

☆......☆......☆

آج وہ معمول سے کہیں جلدی گھر سے نکل آیا تھا۔پیلی کوٹھی کے باہر پہنچ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔بوڑھا شخص کوٹھی کی دیوار کے دائیں جانب بنے تھڑے پہ بیٹھا تھا۔پاس میں چائے کی ایک پیالی خالی پڑی تھی جس کے کنارے سے چائے کے قطرے بہہ کر جم چکے تھے۔پاس ہی پلیٹ میں پراٹھے کے چند گنے چنے ٹکڑے پڑے تھے جنھیں وہ نحیف ہاتھوں سے چن کر منہ میں ڈالنے میں اس قدر منہمک تھا کہ سامنے فٹ پاتھ پہ رک کر جوتوں کے تسمے ٹھیک کرتا نوجوان اسے دکھائی نہیں دیا تھا۔

ابھی روشنی بھی ٹھیک سے نہ پھیلی تھی۔اکثریت مسجد سے لوٹ کر آتے نمازیوں کی تھی یا اس کی طرح صبح کی سیر کے لئے آئے جوانوں اور بوڑھوں کی۔وہ ٹریک سوٹ میں ملبوس ناشتہ کرتے اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا جو شاید خاص ناشتہ کرنے ہی روزانہ اس پیلی کوٹھی کے باہر آکر بیٹھتا تھا جسے اس نے اس وقت کے علاوہ کبھی وہاں نہیں دیکھا تھا۔روز وہ سورج چڑھنے پہ جاگنگ کے لئے نکلتا تھا لیکن آج وہ اسی تجسس کے ہاتھوں جلدی نکل آیا تھا کہ اس شخص کو دیکھ سکے جو اس بوڑھے شخص کو روزانہ ناشتہ دیتا تھا۔روزانہ اس کے وہاں سے گزرنے پہ بوڑھا شخص ناشتہ کر کے برتن ایک طرف رکھ چکا ہوا تھا، آج اس کے جلدی آنے پہ وہ ناشتہ کر رہا تھا۔ناشتہ پہنچانے والا اس سے بھی جلدی آکر چلا گیا تھا۔شاید انھی نمازیوں میں سے کوئی ہوتا ہوگا یا پھر سیر کے لئے آنے والوں میں سے۔۔۔وہ روز کی طرح اب بھی بوڑھے کا ناقدانہ جائزہ لے رہا تھا جو سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔لباس پرانا ہونے کی وجہ سے سفید رنگ قدرے پیلاہٹ میں ڈھل چکا تھا اور ایک دو جگہ پیوند کاری بھی دکھائی دے رہی تھی۔پاؤں میں پرانا گھسا پٹا پشاوری چپل تھا اور سر پہ خاکی رنگ کی ٹوپی۔آنکھوں پہ بوسیدہ سا پرانا کالا چشمہ تھا اور چہرے پہ باریش داڑھی۔۔۔روزانہ ہاتھ میں تھامی تسبیح کو وہ آج ایک طرف رکھے ناشتہ کر رہا تھا۔

"بابا جی۔۔آپ کہاں رہتے ہیں۔۔۔؟" وہ ریٹائرڈ آفیسرز کی کالونی تھی جہاں کے مکین اپنے حال حلیے سے اپنا پتا دیتے تھے اور کم از کم وہ اسے اس کالونی کا نہیں دکھتا تھا۔باہر سے کسی فقیر مسکین کو بلا اجازت

کالونی میں آنے کی ممانعت تھی۔ پھر بھلا وہ کون ہوسکتا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے مخاطب کر بیٹھا تھا۔

بوڑھے شخص نے ایک نظر اس پہ ڈالی جس میں بلا کی معصومیت تھی اور سر جھکا لیا۔

''آپ کہاں رہتے ہیں۔۔۔؟ اور یہ ناشتہ آپ کو کون دے کر جاتا ہے۔۔؟'' اس نے کچھ توقف سے پوچھا لیکن جواب ندارد۔

''اس دن آپ کے پاس ایک چمکیلا کاغذ تھا۔ وہ کہاں سے آیا، کس نے دیا تھا وہ آپ کو۔۔۔؟'' جس سوال نے اسے بے چین کیا تھا، اس نے کر ہی ڈالا۔

بوڑھے شخص نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہ کیا اور ہنوز ناشتہ کرتا رہا۔ ناشتے کے بعد اپنی تسبیح اٹھائی اور دانے گراتے کچھ پڑھنے لگا۔ اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

''کیا وہ آپ کو کوئی لڑکی دے کر جاتی ہے۔۔۔؟'' خاموشی۔

''آپ مجھے اس لڑکی کا نام بتا سکتے ہیں۔۔۔؟'' تسبیح کے دانے مکمل ہوئے اور دوسری بار شروع ہو گئے۔

''حلیہ ہی بتا دیں۔۔۔ وہ کیسی لگتی ہے۔۔ کیا وہ یہیں کہیں رہتی ہے۔۔۔؟'' ہنوز جواب، خاموشی۔

وہ مزید آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھا رہا تھا لیکن نہ تو بوڑھے نے اس سے کوئی بات کی نہ اس کی کسی بات کا جواب دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سماعت سے بے بہرہ ہے۔ نہ ہی کوئی برتن اٹھانے وہاں آیا تھا۔ وہ بھلا کب تک وہاں بیٹھ سکتا تھا۔ سب آتے جاتے اس بوڑھے کے ساتھ اسے بھی گھور رہے تھے۔ ان میں سے جو اسے جانتا تھا ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا آگے بڑھ جاتا۔ یہ کافی عجیب صورتحال تھی۔ اس نے ہاتھ پہ بندھی کلائی میں وقت دیکھا۔ سات بجنے کو تھے۔ اسے ہسپتال سے بھی دیر ہو رہی تھی۔ اسے اب چلنا چاہئے تھا۔ اب یہ کام وہ چھٹی والے دن پہ اٹھا چکا تھا۔

❀ ❀

ناول **سپاس گزار** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 2

"مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تیرا مسئلہ کیا ہے یار۔۔۔؟ دنیا کے سارے کام ایک طرف ڈال کر تو ان بابا جی کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گیا ہے۔۔۔ تجھے کب سے بابوں کا شوق ہو گیا۔۔۔؟" سامنے فروٹ باسکٹ میں سے سیب اٹھا کر، مزے سے کھاتے ہوئے کاؤچ پہ بیٹھا علی ایک فیشن میگزین کی ورک گردانی کرتے اسے لتاڑ رہا تھا۔ وہ پچھلے دو ہفتوں سے اس کے منہ سے "بابا نامہ" سن سن کر اک گیا تھا، پک گیا تھا اور اب سڑ سڑ کر بدبو دینے لگا تھا۔

"مجھے ان سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔۔۔ میرا مسئلہ وہ انسان ہے جو انھیں ناشتہ دیتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑا مسئلہ وہ کاغذ ہے جو اُس روز ان کے پاس تھا۔" اپنا مسئلہ وہ صرف علی سے ہی کہہ سکتا تھا ۔وہ دونوں پچھلے اٹھارہ سال سے دوست تھے۔ دونوں کے والد بھی اکٹھے فوج میں رہے تھے۔ دونوں خاندانوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا اور اب بابا منہا کے لئے آئے علی کے رشتے کے بارے میں بھی سوچ رہے تھے۔

"بھائی میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔" اس نے واقعی ہاتھ جوڑ کر دکھا دیے۔ "کہے تو پاؤں پڑتا ہو۔۔۔" وہ اس کے قدموں میں بیٹھنے کو آگے بڑھا جب اس نے پیر پیچھے کیے اور ناگواری سے اسے گھورا۔

"ان چکروں سے باہر آ جا۔۔۔ یہ کیا پیری فقیری، دم درود، تعویذ گنڈوں میں پڑ رہا ہے ۔۔۔" پَر کا کوا بنانا اسے خوب آتا تھا اور سموئیل اس کی ایسی کسی بات پہ دھیان نہیں دیتا تھا۔

"ایک بار بس اس انسان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔"

''دیکھ کر کیا مل جائے گا۔۔۔؟ گولڈ میڈل پہنائے گا اسے یا پھولوں کے ہار۔۔۔آسکر دے گا۔۔ تاج پوشی کرے گا کہ آپ مہان ہیں جوان باباجی کو ناشتے کی دعوت دے کر باہر فٹ پاتھ پہ بٹھا کر ناشتہ کرواتے ہیں۔۔۔'' اس کی بات پہ سموئیل کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

''بس یونہی ایک عجیب سا تجسس ہے۔دل کھنچتا ہے ان کی طرف جیسے کوئی راز ہوں وہ۔۔ اور ان سے جڑا میری زندگی کا راز بس کھلنے والا ہو۔'' علی نے سچ مچ اپنا سر تھام لیا تھا۔

'' وہ کاغذ وہی ہے علی۔۔ اس پہ وہی نشان۔۔۔ وہ ان کے پاس کہاں سے آیا۔۔۔؟ وہ کاغذ اس کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہو سکتا۔'' اس کی بات پہ علی بھی چونکا تھا۔

اس کاغذ کو مختلف رنگوں میں اس نے پانچ سال پہلے اس کے پاس دیکھا تھا۔اسے اچھی طرح سے اس پہ موجود نشان بھی یاد تھا۔وہ کاغذ اس نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، پھر ویسا ہی کاغذ کچھ مختلف رنگ کا ان باباجی کے پاس کیسے آ سکتا تھا۔اسی نشان اور اسی قسم کی سجاوٹ کے ساتھ۔

'' تیری کالونی کے باہر تو گارڈز ہوتے ہیں پھر وہ کیسے اندر آ جاتے ہیں۔۔؟'' کچھ سوچ کر اس نے پوچھا۔

''یہی تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

''تو سمجھنے کی کوشش کر۔۔ پتا لگا، معلوم کر۔۔۔ انھی گارڈز سے پوچھ لے کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کس سے ملتے ہیں۔پھر کہاں چلے جاتے ہیں۔۔۔؟'' پتے کی بات وہ کر گیا تھا۔سموئیل اپنی جگہ ساکت سا ہونٹ سکوڑے کسی سوچ میں گم ہو گیا۔یہ خیال اس کے ذہن سے کیوں محو رہا۔۔ ادھر ادھر جاسوسی کرنے کی بجائے وہ سیدھا سیدھا گارڈ کے پاس جا کر پوچھ سکتا تھا، ساری معلومات نکلوا سکتا تھا۔

''میں چلتا ہوں۔'' وہ اسی وقت گاڑی کی چابیاں اٹھا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''کہاں چل دیے۔۔۔؟'' وہ کہتا ہی رہ گیا اور سموئیل نکل بھی گیا۔وہ اب وقت ضائع کیے بنا گاڑی کو اڑاتے ہوئے گھر کی طرف جا رہا تھا تاکہ گیٹ پہ موجود گارڈز سے ان باباجی کے متعلق پوچھ

سکے جو پچھلے پورے ماہ سے اس کے لئے راز کی صورت زیادہ چھپے اور کچھ کچھ عیاں تھے۔

جب اس نے گاڑی کالونی کے گیٹ پہ روکی تو اس وقت دو گارڈ موجود تھے جن میں سے ایک اپنی چوکی میں بیٹھا تھا۔ دوسرا آنے جانے والوں میں سے کالونی کے لوگوں کو بنا چھان بین کے جانے دے رہا تھا اور باہر کے انجان لوگوں سے با قاعدہ ان کا آئی ڈی کارڈ لے کر جمع کر کے پوچھتا تھا کہ وہ کالونی میں کس سے ملنے آئے ہیں۔اس سے آگے ایک گاڑی تھی جو کالونی سے باہر کی تھی تبھی انھیں روک کر معلومات لی جارہی تھیں۔۔۔ اسے انتظار کرنا پڑ رہا تھا جو سخت کوفت زدہ تھا۔

'' باباجی کارڈ کے بغیر تو کالونی میں نہیں آسکتے۔'' اس دوران اس نے سوچا تھا۔لیکن ان کے حلیے اور ذہنی کیفیت سے لگتا تو نہیں تھا کہ ان کے پاس کارڈ ہوگا۔

'' السلام علیکم سر جی ۔۔۔'' گارڈ نے گاڑی آگے بڑھانے پہ ماتھے تک ہاتھ لے جاتے ہوئے سلام کیا۔ وہ سموئیل کو پہچانتا تھا۔سموئیل بھی اس کے نام سے واقف تھا۔ یہ امیر علی تھا جو چند ماہ پہلے ہی گارڈ بھرتی ہوا تھا۔کالونی کی کمیٹی میں جو چند ریٹائرڈ آفیسر شامل تھے

ان میں اس کے بابا بھی تھے۔کمیٹی کالونی سے متعلق سارے اہم اور بڑے فیصلے کرتی تھی۔ گارڈز کی ڈیوٹیاں اور تعیناتی جیسے معاملات بھی کمیٹی کے سپرد تھے۔

''وعلیکم سلام جوان ! کیسے ہیں آپ۔۔۔؟'' سن گلاسز اتار کر اس نے ہاتھ میں تھام لی تھیں۔ وہ اب براہ راست اسے دیکھ رہا تھا۔اپنے ریٹائرڈ کرنل باپ کی کئی عادات اس میں بھی حلول کر چکی تھیں۔فوجی باپ کی اولاد آدھی فوجی تو بن ہی جاتی ہے۔۔۔ لیکن وہ آدھے سے کچھ کم ہی فوجی بن پایا تھا۔ بابا کی نسبت اس میں بلا کی عاجزی اور دھیما پن تھا۔وہ گارڈز کو بہت محبت اور احترام سے '' جوان'' کہہ کر بلاتا تھا۔

''اللہ کا کرم ہے سر۔۔۔ ہمارے لائق کوئی خدمت۔۔۔؟'' سینے پہ ہاتھ رکھے، ہونٹوں پہ پر خلوص مسکراہٹ لئے پٹھانوں کے مخصوص لب و لہجے میں وہ پوچھ رہا تھا۔

''جوان کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ صبح فجر سے پہلے ایک باباجی کالونی میں آتے ہیں۔پارک

کی دوسری جانب بیٹھتے ہیں پہلی کوٹھی کے باہر۔ وہ کیوں آتے ہیں۔۔؟ اور کیا ڈیوٹی پہ موجود گارڈز نہیں جانتے کہ کالونی میں غیر متعلقہ افراد کا داخلہ ممنوع ہے۔'' وہ اب کی بار پشتو میں ہی بات کر رہا تھا۔ اپنا آدھا بچپن وہ انھی پٹھانوں میں اٹھا بیٹھا تھا اسی لئے ان کی زبان بول سکتا تھا۔ اس زبان پہ اس کو اتنا عبور حاصل تھا کہ اس کے پٹھان نہ ہونے کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔

بھلے وہ اس وقت جرح کر رہا تھا لیکن لہجہ بہت نرم تھا۔ اس کی اچھی عادت تھی کہ وہ اپنے سے اونچے طبقے سے جس انداز میں مخاطب ہوتا اسی انداز میں نچلے طبقے سے بھی مخاطب ہوتا تھا۔ لہجے کی طبقاتی تخصیص اس کی ذات کو گوارہ نہ تھی۔ یہ اس کا بڑا پن تھا، اسی بنا پہ اس کی عزت بھی کی جاتی تھی۔

''سر رات کی ڈیوٹی پہ اکرم جان ہوتا ہے۔ میں تو صبح آٹھ بجے آتا ہوں۔ میری موجودگی میں وہ کبھی نہیں آیا۔ ہاں جاتے ہوئے میں نے ضرور دیکھا ہے اس کو۔ لیکن جانے والے سے تو ہم نے پوچھ گچھ نہیں کرنا ہوتی۔ اکرم جان نے بس اتنا کہا تھا کہ یہ سدھو صاحب کا مہمان ہے۔ کوئی پوچھے تو بتا دو۔''

گارڈ کا شکریہ ادا کر کے وہ گاڑی گھر کی طرف لے گیا۔

''مہمان۔۔'' وہ کچھ الجھا۔ اگر وہ مہمان تھا تو گھر کیوں نہیں بلوایا جاتا تھا۔ سڑک کنارے کیوں بٹھایا جاتا تھا۔۔۔؟ مہمانوں کو کوئی کیوں گھر کے باہر فٹ پاتھ پہ بٹھائے گا۔

کرنل سدھوان کی لین سے اگلی لین میں رہتے تھے۔ دونوں لین کے مابین پارک تھا۔ کرنل سدھو سال قبل ہی اس کالونی میں شفٹ ہوئے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ہی انھیں یہاں گھر ملا تھا۔ دونوں فیملیز کی ایسی خاص جان پہچان نہ تھی۔ مسجد آتے جاتے وہ ان سے تعارف حاصل کر چکا تھا۔ تاہم وہ ان کا گھر نہیں جانتا تھا، بس لین سے واقف تھا۔

''تم صبح پارک کی دوسری طرف کیا کر رہے تھے۔۔۔؟'' رات کھانے پہ بابا نے اس سے پوچھا تو یکدم وہ گھبرا گیا۔ ایک عرصے کے بعد وہ ڈنر گھر پہ کر رہا تھا سب کے ساتھ ورنہ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ ہسپتال میں بہت مصروف تھا۔ اوپر سے پارٹ ٹائم اس نے گاڑیوں کی خرید و فروخت کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ جس کی سب نے مخالفت کی تھی لیکن گاڑیوں میں اس کی خاص دلچسپی تھی۔۔۔ اب کم

کم ہی ایسا موقع آتا کہ وہ سب کے ساتھ سکون سے بیٹھ کر کھانا کھاتا، گپ شپ لگاتا۔

''نہیں تو۔۔۔'' گھبراہٹ میں اس کے منہ سے پھسل گیا۔اب پھسل گیا تو پھسل گیا۔

ہاتھ میں پکڑا نوالہ بابا لئے حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔وہ اتنی سی بات پہ مکر جائے گا انھیں ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔انھوں نے تو یونہی اس سے پوچھا تھا اور اب وہ کیسے اس بات سے ہی مکر رہا تھا۔ایسا کیا تھا کہ اسے مکرنے کی ضرورت پیش آ گئی تھی جبکہ وہ صبح اپنی آنکھوں سے اسے اس کی گاڑی سمیت وہاں دیکھ چکے تھے۔

''میں صبح جاگنگ سے واپسی پہ وہیں سے آ رہا تھا۔تمہاری گاڑی میں نے وہیں کھڑی دیکھی تھی اور تم وہاں ایک فٹ پاتھ پہ یوں کھڑے تھے جیسے کسی خاص مشن پہ نکلے ہو، ڈاکٹری چھوڑ کر جاسوس بھرتی ہو گئے ہو یا ایکشن موویز میں آڈیشن دینے کی مشق کر رہے ہو۔''

وہ برا پھنسا تھا۔اسے جلد بازی میں یوں انکار نہیں کرنا چاہئے تھا۔اب اسے کوئی بات تو بنانا ہی تھی ورنہ وہ بابا کی نظروں میں مشکوک ہو جاتا۔

''وہ تو میری گاڑی میں کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔'' وہ پھیکا سا یوں مسکرایا جیسے ابھی ابھی اس کی یادداشت نے کام دوبارہ سے کرنا شروع کیا ہو اور وہ جان گیا ہو کہ بابا کس بارے میں پوچھ رہے تھے۔

بابا نے اسے یوں گھورا جیسے اس کی بات کا بالکل یقین نہ آیا ہو لیکن وہ اس کو جھٹلا نہیں سکے تھے۔ ایک گہری نظر اسے دیکھا کہ ''بیٹا جی میں باپ ہوں تمہارا'' اور پھر کھانے میں مصروف ہو گئے۔وہ بابا کی ایسی تفتیشی نظروں سے بہت گھبراتا تھا۔

''پارک سے گھوم کر گیٹ کی طرف جانے کی بھلا کیا تک ہے۔۔۔؟ اپنی لین سے نکل کر سیدھے جایا کرو۔''

''سیدھا ہی جاتا ہوں۔آج نجانے کیوں وہاں سے چلا گیا تھا۔'' بابا کی خالصتاً فوجی نظروں سے بچنے کے لئے وہ جلدی جلدی پانی پیتے گلا صاف کرنے لگا۔

''کرنل سدھو کی فیملی کو آپ جانتے ہیں۔۔۔؟'' سوال عام سا تھا، انداز اس سے بھی عام

لیکن موقع عام نہیں رہا تھا۔۔۔ وہ اپنی حماقت سے اسے مشکوک بنا چکا تھا اور اب سوال سے مزید بنا رہا تھا۔۔۔ بابا نے پھر سے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا جیسے کہتے ہوں کہ انھی کی لین کے سامنے گاڑی کھڑی کرتے ہو، ان کے گھر کے آس پاس گھومتے ہو، پوچھنے پہ مکر جاتے ہو اور اب انھی کی فیملی کا پوچھتے ہو۔ خیر سے تو ہو نا بیٹا جی۔۔۔؟

''ان سے تمہیں کیا کام۔۔۔؟'' آج تو بابا صحیح تفتیشی انداز اپنائے ہوئے تھے۔ کسی بات کا جواب سوال کیے بنا دے ہی نہیں رہے تھے۔

''کام تو کچھ نہیں بس یونہی۔۔۔۔'' وہ کچھ تھما کہ اب کیا بہانہ بنائے۔

''ان کے گھر کے باہر اس دن ایک پیاری سی بچی دیکھی تھی۔'' یونہی اس نے ہوا میں ایک تکا لگایا تھا جو صحیح بھی ہو سکتا تھا۔ وہ تو ان کا گھر تک نہیں جانتا تھا، بچی کیا خاک دیکھا ہونا تھی۔۔۔ اس نے رسک لیا تھا۔ لیکن اب تو لے لیا تھا۔

بابا نے پھر سے اسے گھورا کہ روز ہزاروں گھروں کے باہر بچیاں کھیلتی کودتی ہیں، پیاری بھی ہوتی ہیں ان سب کے بارے میں اس نے کبھی نہیں پوچھا پھر اسی بچی اور اس کی فیملی کے بارے میں کیوں۔۔؟

''ان کی پوتی ہے۔'' کھانا کھاتے انھوں نے سرسری سا جواب دیا۔۔۔ تکا صحیح جا لگا تھا۔

بابا کے ایسے خشک مزاج اور الفاظ سے وہ جان گیا تھا کہ اس معاملے میں باپ سے کسی بھی قسم کی معلومات حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسے کوئی اور رستہ اپنانا ہوگا۔ اس لئے وہ اب خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا۔

''دو بیٹے ہیں کرنل سدھو کے۔۔۔ چھوٹا اپنی فیملی سمیت یہیں رہتا ہے اور بڑا اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ ہوتا ہے۔ ایک بیٹی بھی ہے لیکن میرڈ ہے۔۔۔ گھر نوکروں کے سپرد ہے کیونکہ بیگم ان کی وفات پا چکی ہیں اور بہو ڈاکٹر ہے جو گھر پہ کم ہی پائی جاتی ہے۔'' اسے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔۔۔ انھوں نے خود سے ہی سارا کچھ بتا دیا تھا۔ ڈاکٹر بہو کے ذکر پہ اس کو

اپنے اندر گرہیں پڑتی محسوس ہوئی تھیں۔

وہ جسے ایک عرصے سے ڈھونڈ رہا تھا، گمان ہوا کہ اسے کھو چکا تھا۔ چار سال کی طویل مدت کم وقت نہیں ہوتا کسی کو کھو دینے میں۔۔۔

☆......☆......☆

مزید سفر کے لئے نیچے جیپوں کی ایک طویل قطار موجود تھی۔ سب اپنی اپنی جیپوں پہ سوار ہو رہے تھے۔ پونے نو تو یہیں ہو چکے تھے۔ ان کا سامان بھی ان کے ساتھ تھا۔ آج کی بکنگ کالام کے ہوٹل میں تھی۔ کالام کا بحرین سے رستہ قریباً تین گھنٹے کا ہے۔ سڑک نہ ہونے کے برابر تھی۔ یقیناً کسی زمانے میں تعمیر کی گئی ہوگی جسے پانی کی تباہ کاریاں بہالے گئی ہوں گی۔ پتھریلے اور تنگ رستے کی وجہ سے گاڑی تیز نہیں دوڑائی جا سکتی تھی۔

ان کی گاڑی میں سیرت گروپ اور ایک رؤف تھا جو عباد گروپ سے تھا۔ ہر گاڑی میں لڑکیوں کے ساتھ ایک یا دو لڑکے لازمی تھے تا کہ کوئی مسئلہ درپیش ہو تو وہ لڑکیوں کے ساتھ رہیں۔

''پلیز کچھ دیر گاڑی روک دو۔'' رستے میں ہر تھوڑی دیر بعد کوئی چشمہ یا آبشار آتی تو وہ چاروں شور ڈال دیتیں۔

''عباد نے منع کیا تھا کہ کہیں نہیں رکنا۔ جہاں رکیں گے سب اکھٹے رکیں گے۔ ایسے ہر کوئی تھوڑی تھوڑی دیر بعد رکنے لگا تو پہنچ ہی چکے ہم کالام اور دیکھ لیا سارا سوات۔''

''اب کیا ہم عباد کی مرضی سے گھومیں گے۔۔۔؟'' ثمرہ کا تو عباد سے عناد کی وجہ سے بس نہیں چل رہا تھا کہ اس رؤف کو بھی گاڑی سے دھکا مار کر گرا دے۔

گھنٹے کے سفر کے بعد کچھ جیپیں ایک بڑی آبشار پہ روکی گئیں جس کے پاس لکڑی کا ایک کھوکھا تھا۔ کھوکھے کے مالک نے پانی اور کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں چشمے کے کنارے مختلف پتھروں میں اس طرح دبا رکھی تھیں کہ چشمے کا پانی ان کو بھگوتا ہوا ٹھنڈا کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ یہاں کا روایتی اور قدرتی فریج تھا۔ اس علاقے میں جگہ جگہ ایسے روایتی فریج پائے جاتے تھے۔ جہاں گلیشیئر موجود ہوتے تھے وہاں

گلیشیئر میں چھوٹے چھوٹے خانے بنا کر کولڈ ڈرنکس ٹھنڈا کرنے کے لئے رکھی جاتی تھیں ورنہ ٹھنڈے بہتے پانی سے ہی کام چل جایا کرتا تھا۔

باقی اسٹوڈنٹس آگے نکل گئے تھے۔ سب کو پتا تھا کہ انھیں کالام پہنچ کر سامان کس ہوٹل میں رکھنا ہے۔

سب آبشار کے کنارے کنارے اوپر کی جانب چڑھنے لگے۔ آئینور وہیں نیچے بیٹھ گئی تھی۔۔۔ ایک بڑے پتھر کے کنارے بیٹھتے ہوئے اس نے پانی میں پاؤں لٹکاتے وہ ان سب کو اوپر چڑھتے دیکھ رہی تھی۔ عباد اور اس کا گروپ سب سے اوپر پہنچ چکے تھے۔ عباد ایک مخصوص بلندی تک پہنچ کر اب واپس تیزی سے نیچے کی جانب آرہا تھا۔ جینز کے پائنچے اوپر فولڈ کیئے، جوگرز اس نے ہاتھ میں تھام رکھے تھے۔۔۔ پتھروں پہ نیچے اترتے اس کی مشق قابل دید تھی۔۔۔۔

"سواتی منڈا۔۔۔" اسے دیکھ کر بے اختیار دل میں آیا تھا۔

"آپ کیوں اوپر نہیں آرہیں۔۔۔؟" وہ اس کے لئے نیچے آیا تھا اسی لئے اسی کے پاس آیا تھا۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں۔۔۔ مجھے اوپر نہیں آنا۔" وہ شکریہ کے سے انداز میں مسکرا دی۔

"سب اوپر ہیں تو آپ یہاں کیوں رک گئی ہیں۔۔۔؟" آبشار کا رخ عمودی تھا اسی لئے سب کے لئے چڑھنا نسبتاً آسان تھا۔

"مجھے ہائیٹ فوبیا ہے۔ میں اونچی جگہوں پہ جانے سے گریز کرتی ہوں۔"

"اوہ۔۔۔" وہ چونکا۔

"آپ جائیں اپنا انجوائے کریں۔ میں یہاں ٹھیک ہوں۔" اس نے جانچتی نظروں سے آئینور کو دیکھا تھا تو اس کی تسلی کے لیے وہ ذرا کی ذرا مسکرا دی۔۔۔ بھلے اسے ہائیٹ فوبیا کا ایشو بھی تھا لیکن سچ یہ تھا کہ وہ وہاں اکیلے بیٹھ کر فطرت کے قریب تر ہوتے اسے محسوس کرنا چاہتی تھی۔ سکون سے، بنا کسی شور کے۔۔۔ اور وہ سن سکتی تھی کہ سب اسٹوڈنٹس نے اوپر کتنا شور ڈالا تھا کہ درختوں میں چھپے بندروں اور مدھم سروں میں گاتی مینا انھیں کتنی ناگواری سے دیکھ رہے تھے جو ان کی خاموشی میں مخل ہو رہے تھے۔ شہر سے شور مچانے وہ ان کی خاموشی توڑنے یہاں چلے آئے تھے۔

قریباً دس منٹ بعد وہ پھر سے پتھروں پہ دوڑتا ہوا نیچے آرہا تھا۔۔۔ وہ پتھروں پہ بھی یوں چلتا تھا جیسے زمین پہ دوڑ رہا ہو، فٹ بال کو مہارت سے ادھر ادھر گھماتے بس گول کرنے والا ہو۔۔۔ کھانا سواتی منڈا تھا وہ۔فطرت سے بڑا پیارا تھا۔

آئینور کے پاس پہنچ کر اس نے پنجوں کے بل پتھر پہ بیٹھ کر ہاتھوں کی اوک بنائے اس میں ٹھنڈا یخ پانی بھرتے اپنے چہرے پہ چھپاکے مارے۔ٹھنڈا پانی اس نے چہرے پہ ڈالا تھا اور سارے زمانے کی ٹھنڈ آئینور کو اپنے وجود میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ چند سیکنڈ سے زیادہ اس میں پاؤں ڈالے رکھنا محال تھا اور وہ چھپاک چھپاک منہ دھو رہا تھا۔

''سب ٹھیک ہے۔۔۔؟'' جوگرز کو قریبی پتھر پہ رکھ کر وہ بھی اس کے برابر پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

آئینور کے پیروں کی جلد پانی میں رکھنے کی وجہ سے بالکل سفید پڑ رہی تھی۔اس نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔اب وہ پاؤں پانی سے باہر نکال رہی تھی۔پاؤں سن سے ہو گئے تھے جیسے خون کی گردش تھم گئی ہو۔

''مجھے ہمیشہ یہاں کے پہاڑ فیسی نیٹ کرتے ہیں۔۔۔ پوری آن بان سے سر اٹھائے زمین والوں کو دیکھتے، آسمان کو چھوتے۔۔۔۔مضبوط اور سخت۔۔۔ اپنی بلند چوٹیوں پہ چڑھنے کی دعوت دیتے ہوئے ایک دم رعب دار۔'' سامنے بلند و بالا چوٹیوں کو دیکھتے وہ کہہ رہا تھا۔اس موسم میں بھی پہاڑوں کی اکثر چوٹیاں برف پوش تھیں۔

''You dont need to climb a mountain to know that its high ...''

اس نے بھی سامنے دیکھتے کہا۔

'' میں نے ایک جگہ پڑھا تھا پہاڑوں کی اونچائی ان کی فطری خاصیت ہے۔۔۔ اسے پرکھا نہیں جاتا۔اسے ادب سے مانا جاتا ہے۔'' عباد مسکرا دیا۔

''انسان کو بھی پہاڑ جیسا مضبوط اور سخت ہونا چاہئے۔۔۔'' آئینور نے رخ پھیر کر اسے دیکھا۔

''انسان کو پہاڑوں سے بھی کہیں زیادہ مضبوط اور سخت ہونا چاہیے تاکہ حالات کے زلزلے

اسے اپنی جگہ چھوڑنے پہ مجبور نہ کر دیں۔۔۔ شق نہ ہو جائے کیونکہ زندگی ایسے انسانوں کو پناہ دینے پہ راضی نہیں ہوتی۔" عباد اب اس کی خاموشی پہاڑوں سے ہمکنار ہوتی محسوس کر رہا تھا۔ وہاں بس پانی کا شور تھا۔۔۔ اور اوپر اسٹوڈنٹس کا شور۔ باقی علاقہ خاموش تھا۔ سیاحت ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی کھلی تھی اسی لئے ابھی وہاں سیاحوں کا رش کم تھا۔ ان علاقوں میں سیاحت کا "پیک سیزن" ابھی باقاعدہ شروع نہیں ہوا تھا ورنہ ٹریفک کا شور اور

دھواں دل کو آوازار کرتا ہے۔

جب انسان کا مقابلہ پہاڑ سے ہو تو اس کے پاس بہت سے اختیار ہوتے ہیں۔۔۔

اس پہ چڑھا جائے اور اسے پار کر لیا جائے۔۔۔

اس کے گرد بس گھوما جائے۔۔۔

اس کے اندر کہیں تہہ میں دب جائے۔۔۔

اس کے اوپر سے اڑا جائے یا اسے اڑا دیا جائے۔۔۔

اسے نظر انداز کر دیا جائے جیسے وہ وہاں ہے ہی نہیں۔۔۔

واپس مڑ جایا جائے جہاں سے انسان آیا ہے۔۔۔ یا پھر اسی پہ قیام کر لیا جائے تا کہ وہ انسان کا گھر بن جائے، امن و سکون کی جائے پناہ۔۔۔

اسے اختیار دیا جاتا تو وہ آخری آپشن اپناتی۔

وہ سب اب نیچے آ رہے تھے۔۔۔ ٹھہر ٹھہر کر، احتیاط سے۔۔۔

آئینور اور عباد بھی نیچے جانے لگے۔۔۔

"فطرت سے کافی کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔؟" دونوں ایک ساتھ اترتے آگے بڑھ رہے تھے۔ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس نے اپنی بات کی تصدیق کے لئے آئینور کو دیکھا۔

"فطرت کی گود بہترین تجربہ گاہ ہوتی ہے۔ یہاں ہر شے آپ کو پڑھا رہی ہوتی ہے، کچھ نہ کچھ سکھا رہی ہوتی ہے۔"

"ہاں مگر جب آپ اچھے اسٹوڈنٹ ہوں اور پڑھنے پہ آمادہ ہوں۔" دونوں اس بات پہ ہنس دیے تھے۔ یہ بہت عرصے بعد ہوا تھا کہ ان دونوں کی آپس میں اس طرح بالکل نارمل بات ہوئی تھی ورنہ ماضی کی ایک تلخ یاد نے کبھی ان دونوں کے درمیان ایک تناؤ ہمیشہ قائم رکھا تھا۔

وہ پچھلے چار سال سے جب جب اس سے ملتا، بات کرتا تھا، اسے لگتا تھا کہ وہ مشکل باتیں کرتی ہے۔۔۔ گہری اور تجربے کے نچوڑ سے بھری۔۔۔ اب چند منٹ وہاں اس کے ساتھ گزارنے سے اسے لگا تھا کہ وہ صرف باتیں ہی گہری نہیں کرتی وہ بذاتِ خود ایک گہری لڑکی ہے۔۔۔

"آپ سمیرا سے اتنا چڑتے کیوں ہیں۔۔۔؟" اوپر اس کی دوستیں اسے ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ وہ اتنا اوپر تک نہیں گئے تھے لیکن لڑکے اتنے اوپر چلے گئے تھے کہ اب ایک نقطے کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

"میں کب چڑتا ہوں۔۔؟" ایک سایہ سا آکر گزرا تھا۔

"او کے تو میں اپنا سوال بدل لیتی ہوں۔۔۔ سمیرا آپ سے اتنا چڑتی کیوں ہے۔۔۔؟" عباد نے شانے اچکائے۔

"جانتے ہیں لیکن بتانا نہیں چاہتے۔"

"انسان نے نادانستگی میں کبھی کسی دوسرے کی انسلٹ ہو سکتی ہے۔۔ بار بار نہیں۔ ایک بار پہلے میں غلط حرکت کر چکا ہوں۔ اب اسے دہرا کر دوبارہ نہیں کرنا چاہتا۔" وہ سمجھ گئی تھی کہ اس سے نادانستگی میں کبھی کچھ ہوا تھا جو وہ اسے بتا کر سمیرا کی پھر سے بے عزتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کا ظرف تھا یا شرافت۔۔۔ جو بھی تھا اسے اچھا لگا۔

قصہ کچھ یوں تھا کہ چار سال پہلے جب ان کی ویلکم پارٹی تھی تب وہ اس ویلکم پارٹی میں نہیں آئی تھی۔ اس کی کچھ گھریلو مجبوریاں تھیں جن کے باعث وہ شرکت نہیں کر سکی تھی لیکن اس کی باقی تینوں دوستوں کا پورا ارادہ تھا۔ وہ تینوں عام سے چھوٹے سرکاری کالجوں سے یہاں تک پہنچی تھیں۔ صرف وہ ان میں سے تھی جو پرائیوٹ کالج سے پڑھی تھی لیکن بہر حال ان میں سے کوئی بھی کو ایجوکیشن سے نہیں تھی۔ لڑکوں سے بات کرتے ہوئے ایک جھجک فطری بات تھی۔ دوسری طرف یہی حال لڑکوں کا بھی تھا

جو پہلی بار لڑکیوں کے ساتھ پڑھتے ہوئے کہیں زیادہ شوخے ہو جاتے اور کہیں محتاط، کہیں کوئی رائے زنی کر جاتے اور کہیں گونگوں کا گڑ کھا لیتے۔

پارٹی کسی قریبی ہال میں رکھی گئی تھی۔تحریم اور صدف پہنچ چکی تھیں۔سمیرا جب پہنچی تو اسے مطلوبہ ہال نہیں مل رہا تھا کہ وہاں کافی سارے ہالز تھے۔اس وقت موبائل فون عام نہیں ہوا تھا کہ ہر کسی کے پاس ہوتا۔وہ باہر پارکنگ میں ہی کھڑی کسی سے رستہ سمجھ رہی تھی۔رؤف اور عباد بھی اسی وقت پہنچے تھے۔سامنے ہی ان کا گروپ منتظر تھا۔وہ سب سے مل رہے تھے۔تبھی ان کے گروپ کے ایک شوقین مزاج لڑکے نے سمیرا پہ ہلکی آواز میں رائے زنی کی تھی۔

''بندہ اگر ہاف سلیوز پہن ہی رہا ہو تو اسے ویکس تو کروا ہی لینی چاہیئے۔'' اس کی نظریں نیم اندھیرے میں بھی خوب کام کرتی تھیں۔بے اختیار اس کے منہ سے پھسلا تھا اور اتنا ہی بے اختیار سب کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔۔۔یہ لڑکوں کی عام عادت کے مطابق ہی تھا کہ جو لڑکیوں پہ باتیں بنا دیتے ہیں اور ہمارے معاشرے میں اسے برا نہیں سمجھا جاتا۔ان سے خاصی آگے چلتی سمیرا کے کان ضرورت سے زیادہ سنتے تھے۔وہ رکی، ٹھٹکی اور اپنے بازوؤں کو دیکھا۔جلدی میں وہ اتنا اہم کام بھول گئی تھی۔اتنی بڑی حماقت ۔۔۔چہرہ خفت سے لال بھبھوکا ہوا۔وہیں سے مڑی۔ان سب کی سمت دیکھا جن میں سے سب زیادہ دانتوں کی نمائش عباد کی تھی۔سب سے بلند قہقہہ بھی اسی کا ہوتا تھا۔وہ غصے سے کھولتی ہوئی ان تک آئی اور ایک کڑاکے دار تھپڑ گونجا ۔۔۔ سب سن ۔۔۔ بلکہ گم صم ۔۔۔ عباد کا گال لال و لال ۔۔

عباد بالکل شاکڈ گال پہ ہاتھ رکھے پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ان سب کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ بات اس کے کانوں تک بھی جا سکتی ہے۔لیکن بات کہنے والا تو کوئی اور تھا۔عباد تو ان سب کی طرح بس ہنسا ہی تھا۔اس کی بدقسمتی تھی کہ اس کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔

سمیرا اسی وقت تیزی سے پارکنگ سے باہر نکلتی چلی گئی۔وہ واپس جا رہی تھی۔مارے خفت کے وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔عباد کتنی دیر سن گال کے ساتھ وہیں کھڑا رہا۔پھر وہ بھی رؤف کے لاکھ روکنے پہ وہاں سے چلا گیا۔

اگلے دو دن وہ شرمندگی کے مارے کالج نہیں گیا اور سمیرا نے دوستوں کے بار ہا پوچھنے پہ انھیں وجہ نہ بتائی کہ وہ ویلکم پارٹی میں کیوں نہیں آئی۔ وقت کے ساتھ بات تمام ہو گئی لیکن دو سینوں میں وہ ہمیشہ سلگتی ہی رہی۔۔۔ ایک سینہ سمیرا کا اور دوسرا عباد کا۔

باقی کے چار سال سمیرا اور عباد ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا پائے، بات نہیں کر پائے، کوئی معذرت جیسے الفاظ نہیں ادا ہوئے۔۔۔ عباد کے اندر ٹنوں کے حساب سے پشیمانی تھی تو سمیرا کے اندر کینہ ان سب کے لئے تھا۔۔۔ لڑکپن کی ایک نادانی اور نادانی میں کسی کی کی گئی بے عزتی وہ اب تک نہیں بھولا تھا لیکن اس واقعے نے ایک تو اسے لڑکیوں کی عزت کرنا سکھا دی، دوسرا اپنے قہقہے پہ قابو رکھنا۔

سب اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ کالام مین بازار میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کا اگلا پڑاؤ۔۔

☆......☆......☆

"بہت بڑا فیصلہ، مشکل بھی اور درست بھی۔۔۔ آج کل ہینڈ میڈ چیزوں کا بہت رواج ہے۔ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور تم میں تو بچپن سے یہ فن موجود ہے کہ تم بیکار اشیاء کو منٹوں میں کارآمد بنانے کا گر جانتی ہو۔ نہ صرف جانتی ہو بلکہ بنا کر دکھا بھی دیتی ہو۔" میڈم شیریں نے ہمیشہ کی طرح اس کی کمر تھپکی تھی، اس کی بات کو اہمیت دیتے اسے سراہا تھا۔ اس کی ہمت بندھائی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کی ہر بات کی ایسے ہی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔

"کیا میں اتنا کما سکوں گی کہ اپنی پڑھائی کا خرچا اٹھا سکوں۔۔۔؟"

"پڑھائی کے ساتھ یہ سب آسان نہیں ہے۔" وہ اسے جھوٹی امید نہیں دلانا چاہتی تھیں۔

"آسان تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔ سب مشکل ہے اور مشکل سے ہی ہو گا۔" وہ بس خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"پھر بھی تم پڑھائی کے ساتھ یہ سب کیسے کرو گی۔ اس کے لئے بہت وقت چاہئے ہوتا ہے۔"

"میں اس سال ایڈمیشن نہیں لوں گی میڈیم۔" میڈم شیریں نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کا

دماغی توازن بگڑ گیا ہو۔

''تو اس سال کیا کرو گی۔۔۔؟''

''صرف رقم جمع۔ ہینڈ میڈ کرافٹس بنا کر اور آپ کی اکیڈمی میں پڑھا کر۔'' اکھٹے اتنا کچھ کرنے کی حامی بھرنے والے کچھ بھی ڈھنگ سے نہیں کر پاتے۔۔۔ دو کشتیوں کا سوار کہیں نہیں پہنچ سکتا اور فاطمہ تو کئی کشتیوں کی سواری بننے پہ مصر تھی۔

'' یہ سب کرنا اکیلے بندے کا کام نہیں ہے فاطمہ۔ عموماً ہینڈ میڈ آرڈرز بہت محنت طلب کام ہوتا ہے۔ انھیں سنبھالنا ایک بندے کا کام نہیں ہوتا۔ میں جانتی ہوں تم محنتی ہو لیکن انسان ہو اور انسان ایک حد تک ہمت کر سکتا ہے۔۔۔ وہ تھکتا بھی ہے اور بیمار بھی پڑتا ہے۔۔ موسموں کی تبدیلی کا اثر بھی قبول کرتا ہے اور رویوں کا بھی۔۔۔ وقت کی کمی بھی درپیش ہوتی ہے اور دیگر مسائل بھی جن پہ اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔۔۔ اور مجھے لگتا ہے کہ جو تم کرنا چاہتی ہو اس میں تم جلد تھک جاؤ گی۔''

میڈم ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ ابھی وہ جذباتی ہو رہی تھی، سب کرنے کی ہمت دکھانا چاہ رہی تھی، کل وہ تھک جاتی تو کون اتنے بڑے پروجیکٹ پورے کرتا۔۔۔؟ لیکن اس نے نہ تھکنے اور نہ جھکنے کا جو عزم کیا تھا اب اسے اس پہ جم کر دکھانا تھا۔ وہ کسی کی بھی ایسی باتوں سے نہ گھبرائے گی نہ ہی دھیان دے گی۔ اسے بس اپنے مقصد اور کام پہ دھیان دینا ہے۔ فوکس رہنا ہے۔

''ٹھیک ہے آپ مجھے کسی ایک پروڈکٹ کا آرڈر لے دیں۔ چھوٹا موٹا ہی سہی۔ گھر پہ رہ کر میں وہ پورا کیا کروں گی اور باقی وقت آپ کی اکیڈمی کو دے دوں گی۔ اتنا تو میں کر سکتی ہوں نا۔۔۔؟ یا آپ کو لگتا ہے کہ سب کر لینے والی فاطمہ اب اتنا بھی نہیں کر سکتی۔۔۔'' میڈم نے مسکرا کر تائید میں سر ہلا دیا تھا۔ انھیں یہ فیصلہ درست لگا تھا۔

''مارکیٹ سے میٹریل اٹھانا ہوگا، اس سے پہلے تمہیں اس کی کوالٹی چیک کرنا ہوگی۔ اس کام میں پورا پورا دن لگ جاتا ہے۔۔۔ ابھی تمہیں اس کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور بچی سمجھ کر لوگ تمہیں بے وقوف بنانے کی بھی کوشش کریں گے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ تم اپنے ساتھ میرے ایک کاریگر کو لے جانا

جو اکیڈمی کے ان معاملات کو ڈیل کرتا ہے۔۔۔ میں تمہیں کچھ آرٹ اینڈ کرافٹس کی شاپس کے نمبر دے دوں گی جو خاص طور سے اپنی شاپس کے لئے آرڈر بنواتے ہیں۔انھیں ہمیشہ وہ کام درکار ہوتا ہے جو مارکیٹ میں اور کہیں نہیں ملتا۔۔۔ میری اکیڈمی کی کچھ لڑکیاں ان کے لئے کام کر رہی ہیں۔ان کے کام میں اتنی مہارت نہیں ہے جتنا تمہارے کام میں ہوگی۔۔۔۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ کاریگر کو ہمیشہ اس کی محنت سے بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے۔اس لئے ایک دو آرڈر کے بعد اگر تمہیں لگے کہ تم زیادہ تھک رہی ہو اور بدلے میں ہاتھ کچھ نہیں آرہا تو بہتر ہوگا کہ تم مزید آرڈر مت لینا۔کیونکہ پھر تم کام سے انصاف نہیں کر سکو گی۔۔۔''

''اس وقت میرے لئے قطرہ قطرہ جمع کرنا بہت قیمتی ہے، مجھے یکدم کسی ندی نالے پہ بندھ باندھ لینے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔'' اسے دریا بنانا تھا اور وہ کسی قطرے کو ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھی۔۔۔ میڈم نے اس فیلڈ کے دیگر اہم معاملات سے اسے آگاہ کیا تھا۔

''تم کب سے کام کرنا چاہتی ہو۔۔۔؟''

''آج بلکہ ابھی سے۔۔۔''

''میں کوشش کرتی ہوں کہ تمہیں آج کل میں ہی کام مل جائے۔۔۔ کم از کم وہ تمہارے سیمپل جلد از جلد چیک کر لیں۔''

''اکیڈمی جوائن کرنے کی صورت میں مجھے کتنا وقت دینا ہوگا۔۔۔؟'' وہ دوسرے رستے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''یہ تو تم پہ ہے کہ تم کون سی کلاسز کنڈکٹ کرانا چاہو گی۔۔۔؟ اکیڈمی کی ٹائمنگز صبح سے شام تک ہیں۔صبح میری سسٹر ہوتی ہیں اور شام میں میں خود ہوتی ہوں۔آج کل میرے پاس شام کی کلاسز کے لئے فلاور میکنگ کی ٹیچر نہیں ہیں اور تم سے اچھا یہ کام کون کر سکتا ہے۔'' اکیڈمی اس کے گھر سے قریباً بیس منٹ کی پیدل مسافت پہ تھی۔وہ اکیلے باسانی آ جا سکتی تھی۔ایک سے زائد کلاسز بھی لے سکتی تھی۔اکیڈمی میں تا حال مصنوعی زیورات بنانے کی کلاسز کا اجراء نہیں ہوا تھا، وہ یہ کام بھی شروع کروا

سکتی تھی۔ ان دنوں ہاتھ کے بنے مصنوعی زیورات کی مارکیٹ میں مانگ بڑھ رہی تھی۔۔۔ فلاور میکنگ کے لئے میڈم اسے یوں بھی رکھنا چاہتی تھیں۔ وہ بہت اچھی نہ سہی لیکن مناسب تنخواہ دینے پہ آمادہ تھیں۔ اس نے کچھ سوچ کر حامی بھر لی تھی۔

ہر انسان کے اندر قدرت نے کوئی نہ کوئی تخلیقی صلاحیت پنہاں رکھی ہے۔ ضرورت محض اسے صحیح طور سے پہچاننے اور نکھارنے کی ہے۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ وہ جان ہی نہیں پاتا کہ اس کی پوشیدہ صلاحیت کیا ہے۔۔۔؟ وہ اسی رواج کی تقلید کرتا ہے جس پہ اکثریت چل رہی ہوتی ہے۔۔۔ اپنی سوچ، اپنی صلاحیت، اپنے ہنر پہ غور ہی نہیں کرتا۔۔۔ سمت مخالف ہو تو جتنا بھی چل لیا جائے منزل نہیں ملا کرتی۔

اس کا آرٹ سینس ہمیشہ سے لاجواب رہا تھا۔۔۔ اچھے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے کا اسے یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اس کی اس تخلیقی صلاحیت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ اسے قدم قدم پہ حوصلہ افزائی کرنے والے اساتذہ ملے تھے۔ میڈم شیریں اس کی آرٹ ٹیچر تھیں جن سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ پیروں کی ٹھوکروں میں پڑے پتھر کو بھی پارس بنانا جانتی تھی۔۔۔ مشکل سے مشکل اور بہتر سے بہترین انجام دیتے ہوئے وہ قومی سطح پہ آرٹ ایگزبیشن میں حصہ لے چکی تھی۔ انعامات اور ٹرافیز کی بھرمار تھی جو وہ اسکول کے لئے جیت کر لائی تھی۔ اسکول میں وہ آرٹ کونسل کی ایگزیکٹو رہ چکی تھی۔ گھر والے اس کے اس ہنر سے کبھی بھی خوش نہیں رہے تھے، نہ ہی کبھی اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ غیر نصابی سرگرمیاں ان کے نزدیک بے معنی اور وقت کا ضیاع تھیں۔ بھلا کیا ضرورت تھی اسے اس سب میں خود کو کھپانے کی۔ لیکن اب وہ سوچتی تھی کہ بہت ضرورت تھی۔ اب وہی ہنر اس کے لئے کارگر ہونے جا رہا تھا۔ ہنر تو کبھی رائیگاں جا ہی نہیں سکتا اگر اس پہ درست طریقے سے محنت کی جائے اور اب وہ وقت آ چکا تھا۔

"ہنر کوئی سا بھی ہو، اپنے ساتھ ہمیشہ نفع لاتا ہے۔ برے وقتوں میں فاقوں مرنے نہیں دیتا۔"

"فاطمہ تم نے کبھی بطخ دیکھی ہے۔۔۔؟ وہ پانی کی سطح پہ تیرنے کے لئے بڑی مشقت کرتی ہے، مسلسل پیر چلاتی ہے مگر اس کی یہ مشقت پانی کے اندر ہوتی ہے۔ باہر کسی کو دکھائی نہیں دیتا کہ وہ اندر

ہی اندر کتنی محنت کر رہی ہے اور جو دوسروں کو دکھتا ہے وہ اس کا پرسکون اور مسکراتا چہرہ ہوتا ہے۔۔۔ تمہیں بھی بطخ بننا ہے۔۔۔ کیا تم سمجھ رہی ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔۔۔؟'' وہ مسکرادی تھی۔نشست برخاست ہونے سے پہلے وہ سمجھ چکی تھی کہ میڈم اسے کیا سکھانا چاہ رہی تھیں۔

اپنا کام شروع کرنے کے لئے فاطمہ کو با قاعدہ جگہ درکار تھی جہاں وہ اپنا کام سکون سے کر سکے۔ اس مقصد کے لئے اس نے چھت کی ممٹی کو چنا تھا۔۔۔ کھلی، روشن اور ہوادار جہاں تسلی سے وہ اپنا کام بنا کسی مداخلت کے گھنٹوں کر سکتی تھی۔ان کا گھر سنگل اسٹوری تھا جو دادا اور دادی نے پائی پائی جوڑ کر بنایا تھا۔۔۔ چاچا اس گھر میں سے اپنا حصہ ابا کے لئے چھوڑ کر اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا شفٹ ہو چکے تھے۔ان کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی اور اس سے بڑھ کر اپنوں کے لئے احساس کی کہ اس پانچ مرلے کے مزید ٹکڑے کرتے۔سو وہ گھر اب ابا کی ملکیت تھا۔۔ اوپر چھت سے ملحقہ ممٹی میں پرانی پیٹی کے علاوہ کاٹھ کباڑ ہی پڑا تھا۔وہی امیوں کی پرانی عادت کہ کوئی چیز کبھی بھی کام آسکتی ہے سو اسے نہ پھینکا جائے۔سب کچھ قارون کا خزانہ ہی تو ہے۔۔۔۔خود اسے بچپن سے ہی چھوٹے بڑے خالی ڈبے جمع کر کے انھیں قابلِ مصرف بنانے کی عادت تھی۔ممٹی کا ایک کونہ اس کا ''ڈبہ ستان'' تھا۔۔۔ جہاں اوپر نیچے، ایک دوسرے کے اندر تہوں میں کئی ڈبے پڑے تھے۔کئی گتے جمع تھے۔وہ سب یہاں لا کر چھپا دیتی تھی تا کہ ضرورت پڑنے پہ ان کا استعمال کر سکے۔اس سے بڑی ضرورت اسے کب پڑ سکتی تھی۔وہاں رکھی کوئی بھی شے بیکار نہیں تھی، سب کا استعمال تھا، نہیں بھی تھا تو اسے بنانا تھا۔

ممٹی کی صفائی کر کے اس نے ایک پرانی دری لا کر بچھا کر اپنے کام کے لئے جگہ بنا لی۔اپنے بستر کے ساتھ رکھا ٹائم پیس لا کر ایک کونے میں سجا لیا تا کہ وہ ہمیشہ یاد رکھے کہ اسے وقت کو یاد رکھنا ہے۔اس ٹائم پیس کے ہر سیکنڈ کی اب وہ پابند تھی جسے پہلے وہ بڑی آسانی سے ضائع کر دیتی تھی۔ بھائی سے کہہ کر اس نے چھوٹا پیڈسٹل فین بھی ایک طرف رکھوا لیا تھا۔دو بڑے جسم کے انرجی سیور بھی لگوا لئے تھے جس سے ٹھیک ٹھاک روشنی ہو گئی تھی۔اسٹور سے اپنا آرٹ ورک کا سارا سامان بھی اٹھا کر وہ اوپر لے آئی تھی جو اس کی سالہا سال کی جمع پونجی تھا۔اب اس کی چھوٹی سی، آدھی ادھوری ورکشاپ کام کے

لیے تیار تھی۔اس نے ایک آسودہ سی مسکراہٹ سے اپنی اس دنیا کو دیکھا۔

"میری ورک شاپ تیار ہے کام کے لئے اور میں بھی۔" براوقت انسان کو تخریب کار بھی بنا سکتا ہے اور تخلیق کار بھی۔۔۔ اس کا براوقت اسے تخلیق کار بنانے جارہا تھا۔

گھر میں سے کسی نے یہ جاننے کی قطعاً کوشش نہیں کی کہ وہ چھت پہ کیا کر رہی ہے، کون سا ایٹم بم بنانے کی تیاری ہو رہی ہے، کون سی ایجاد وہ کرنے جارہی ہے، چھت پہ کھدائیاں کروا کر وہ تیل کے کون سے کنوئیں نکال رہی ہے۔سارا دن وہ کن سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھی، کسی نے نہیں پوچھا تو اس نے بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا۔جس کا سر درد ہو وہی بے چین ہوتا ہے، دوسرے کو کیا لگے۔

وقت ضائع کیے بنا وہ اپنے کام میں لگ گئی تھی۔اپنے کام اور صلاحیت کی جانچ کے لئے اسے کچھ نمونے بنا کر میڈم شیریں کے دیے گئے پتے پہ بھیجنا تھے تا کہ وہ اس کا کام دیکھ کر اسے جلد از جلد آرڈر دے سکیں۔اسے دو دن کا وقت ملا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اس کے لئے بہت زیادہ ہے، وہ یہ کام دو گھنٹے میں مکمل کر لینا چاہتی تھی۔جتنی وہ جلدی دکھائے گی، اتنا ہی متاثر کر سکے گی اور جتنا وہ متاثر کر سکے گی اتنا بڑا اور منافع بخش آرڈر اسے مل سکے گا۔یہاں ہر کوئی وقت سے پہلے اپنے دیے گئے کام کی تکمیل چاہتا تھا۔کام ہاتھوں کا چاہئے ہوتا تھا لیکن وقت مشین کا دیا جاتا تھا۔اسے انسان سے مشین بننا تھا جو ہر وقت چلتی رہے اور کام کرتی رہے۔آرام، سکون، نیند، تفریح، فراغت ان تمام ناموں کو وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔۔۔ پچھلی کتاب کے سبھی اوراق وہ پھاڑ کر دریا برد کر آئی تھی۔۔۔ اسے نئی کتاب کے نئے پنوں پہ ایک ہی بات درج کرنا تھی۔۔۔ "اسے محنت کرنا ہے کیونکہ محنت ہی واحد رستہ ہے۔"

اسے چار مختلف چیزوں کے آرڈر ملے تھے۔۔۔ ہینڈ میڈ پیپر بیگ، جیولری باکس، وال ہینگنگ اور آرٹسٹک واز۔۔۔

پیپر بیگ بنانے میں اسے کل ساڑھے بارہ منٹ لگے تھے۔وہ اس دورانیے کو دس منٹ تک لانا چاہتی تھی تا کہ بنا کسی تعطل کے وہ ایک گھنٹے میں اس جیسے چھ بیگز بنا لے۔یہ ہینڈ بیگ اس نے "لوکتا پیپر" سے بنایا تھا۔اس کے پاس کئی ڈیزائن اور رنگ کے لوکتا پیپر پڑے ہوئے تھے۔یہ ایک مخصوص قسم کا نیپالی

کاغذ ہوتا ہے جس کی اوپری سطح کھردری اور عام کاغذ کے مقابل موٹی اور جاندار ہوتی ہے تاہم اسے موڑنا یا کاٹنا بالکل بھی مشکل نہیں ہوتا۔ کچھ لوٹکا پیپر میں چمکیلی اس طرح سے گندھی ہوئی ہوتی ہے کہ ہاتھ پھیرنے پہ بھی ہاتھ سے چپکتی نہیں ہے۔ اس طرح اسے زیادہ سجاوٹ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔

پرانے لکڑی کے چھوٹے سے ڈبے پہ چمڑے کا کپڑا چڑھا کر اسے مختلف بٹنوں اور دھاگوں سے سجا کر اس نے جیولری بکس بنایا تھا۔

وضع وضع کے پیپر بیگ، ایک انتہائی خوبصورت جیولری باکس، ماچس کی جلی ہوئی تیلیوں کی وال ہینگنگ اور پرانے کنستر کا اسٹائلش واز بنا کر اس نے نمونے تیار کر لئے تھے۔ تمام نمونے تیار کرنے کے لیے اس نے پہلے سے موجود سامان کو ہی استعمال کیا تھا۔ اسے ایک روپیہ کا بھی خرچا نہیں کرنا پڑا تھا کہ ہمیشہ کا سنبھالا ہوا میٹریل کام آ گیا تھا۔ ایک آسودہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔

اپنے بنائے تمام نمونوں کو اس نے ہر ہر زاویے سے جانچا تھا۔ ایک تخلیق کار سے ہٹ کر اس نے اس کی جانچ پڑتال ایک گاہک بن کر کی تھی، ایک خریدار بن کر۔ اس کی مضبوطی اور پائیداری ٹھونک بجا کر دیکھی تھی۔ اس کی خوبصورتی کو ہر طرح سے کامل کیا تھا تب جا کر وہ نمونے بھجوانے کے لئے اس نے فائنل کئے تھے۔

اب اسے میڈم شیریں کے بتائے پتے پہ یہ سب بھجوانا تھا اور اس کام کے لئے انھوں نے اپنا ایک کاریگر بھیج دیا تھا جو آرڈر اس سے لے کر شاپس پہ دے آیا تھا۔ شاپس والوں نے کچھ دن تک بتانے کا کہا تھا اور یہ کچھ دن اس کے مصلہ بچھا کر دعائیں مانگنے میں گزر رہے تھے۔ اس نے دوا کر لی تھی اب دعا بھی ضروری تھی۔ دونوں کا امتزاج مل کر اسے کامیاب کرنے والا تھا اس بات کا یقین خود کو دلاتے وہ کافی پرامید تھی۔

"آسان تھا۔۔۔؟" میڈم نے اس کا کام دیکھے بنا پوچھا تھا، سراہا تھا، حوصلہ بڑھایا تھا۔

"مشکل بھی نہیں تھا۔" وہ خود اعتمادی سے مسکرائی۔

"سامان کہاں سے لائی۔۔۔؟"

''recycling۔۔۔'' وہ اس کی بات پہ مسکرا دی تھیں۔ اس فیلڈ میں کسی کو اتنی مہارت اور نفاست سے کام کرتے انھوں نے نہیں دیکھا تھا جتنا کہ اسے۔

بیکار کچھ بھی نہیں ہوتا۔۔۔ سب کار آمد ہے اگر ہم چاہیں تو۔

اسکول لائف میں ہی اس نے اس موضوع پہ کتنے لیکچرز لئے تھے۔ باقاعدہ ڈاکومنٹریز دیکھی تھیں۔ دنیا کے کئی ممالک میں اس کام کے لئے باقاعدہ فیکٹریاں اور پلانٹ موجود ہیں۔ کئی سو ٹن مواد جسے عوام بیکار سمجھتی تھی، اسی کو ان جگہوں پہ کار آمد بنا کر نہ صرف ماحولیاتی آلودگی کو کم کیا جاتا تھا بلکہ خرچا بھی بچایا جاتا تھا اور ہزاروں لوگوں کو روزگار بھی مل جاتا تھا۔ کئی لوگ گھروں میں چھوٹے موٹے پلانٹ لگا کر اپنی ضرورت آپ کے تحت یہ کام کر رہے تھے۔

'' ہمارے ہاں اب تک ایسا کیوں نہیں ہوا۔۔؟'' اس نے انسٹرکٹر سے سوال کیا تھا۔

''ہماری قوم اسٹیٹس کے پیچھے دیوانی ہو چکی ہے۔ محنت کا نام سننا پسند نہیں کرتی۔ ہر نئی چیز چار ماہ بعد پرانی لگنے لگتی ہے۔ یہاں یہ سب کون کرے گا۔۔۔؟'' اس نے سوچا تھا کہ وہ کبھی نہ کبھی چھوٹے پیمانے پہ سہی لیکن یہ کام ضرور کرے گی۔ کوئی چھوٹا موٹا کارخانہ نہ بھی ہو تو بھی وہ ایک کمرے سے ہی کام چلا لے گی لیکن کبھی نہ کبھی وہ اپنا ایک چھوٹا سا ریسائیکلنگ ہاؤس ضرور بنائے گی۔ یہ اس کی ''وش بک'' میں لکھی ایک اور خواہش تھی جسے اسے جلدی یا بدیر پورا کرنا تھا۔

آرٹ اینڈ کرافٹ کی شاپ سے اسے جواب موصول ہوا تھا۔

'' آپ اچھا کام کرنا جانتی ہیں لیکن ہمیں اس سے کہیں زیادہ اچھوتے کام کی تلاش ہے۔۔۔ منفرد۔۔۔ جو ابھی تک مارکیٹ میں نہ آیا ہو۔ اس سے بہتر بنا کر بھیجیں اور زیادہ محنت سے بنا کر بھیجیں۔ جلدی کسی کام کی نہیں ہے۔'' الفاظ اس کے لئے ناقابلِ یقین تھے۔ اپنے تئیں اس نے اچھا کام ہی کیا تھا لیکن جلدی میں کیا تھا۔ شاید اس کی عجلت اس کے کام میں جھلک رہی ہوگی تبھی انھوں نے ایسا کہا۔

اس نے پھر سے انھی پروڈکٹس پہ کام لیکن اس بار اس نے وقت کو کم محنت کو زیادہ اہمیت دی۔ دو

دن اسے ملے تو اس نے دو دن کا ہی بھرپور استعمال کیا۔۔۔ ایک اور کام اس نے کیا کہ آرڈر تیار کر کے انھیں میڈم شیریں سے چیک کروانے بھجوا دیا۔ وہ اس کی استاد تھیں، غلطیاں نکالنا جانتی تھیں۔ ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہوتا ہے۔۔۔ اسی علم والے نے اس کی پروڈکٹس کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھا تھا۔ پھر اسے اوکے کیا تھا۔۔۔ کام بھیج دیا گیا تھا۔ اب انتظار باقی تھا۔ دعا کا اہتمام ہر پل تھا۔

آرٹ اینڈ کرافٹ کی شاپ نے دو دن بعد اس کے کام کو اوکے کر دیا تھا۔ انھیں اس بار اس کا کام پسند آیا تھا۔ مزید آرڈر بھی دے دیا تھا لیکن اس میں منافع اس کی سوچ سے کم تھا۔

"اُس کو سب سے کم ملتا ہے جس کی محنت ہوتی ہے۔" میڈم شیریں سے شکوہ کرنے پہ اسے ایک سرد آہ کے ساتھ سننے کو ملا تھا۔

"شاید میں نے غلط فیصلہ لیا ہے۔۔۔ میں ناممکن کو ممکن بنانے کی ضد لگا بیٹھی ہوں۔" اسے لگا تھا کہ وہ اب مزید یہ کام نہیں کر سکتی۔ جلد بازی میں اس نے ایک بچکانہ فیصلہ لے ڈالا تھا جو اب حقائق کی بھٹی میں تپ کر کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ اتنے کم منافع سے تو سالوں لگ جائیں گے رقم جمع کرنے میں اور پھر بھی شاید ہی وہ کبھی جمع کر پائے۔ وہ پھر سے ایک بار اپنے فیصلے پہ نظر ثانی کرنے لگی۔

"میں تمہیں کسی سے ملوانا چاہتی ہوں۔" انٹر کام پہ بات کر کے انھوں نے کسی کو اندر بلوایا تھا۔

"اپنے ہاں آنے والے سبھی اسٹوڈنٹس کو میں ان سے ضرور ملواتی ہوں۔" دروازہ بجا اور اجازت لے کر آنے والا ایک نوعمر جوان تھا جس کا اعتماد قابلِ دید تھا۔ میڈم کے اشارے پہ وہ اپنی نشست گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"یہ نعمان ہیں۔۔۔ ہمارے ہاں ڈرائیونگ سکھاتے ہیں۔" یہ اسے ابھی معلوم ہوا تھا کہ وہاں ڈرائیونگ بھی سکھائی جاتی تھی۔

"نعمان نے میٹرک بورڈ میں ٹاپ کیا تھا، ایف اے میں تیسری پوزیشن لی، بی ایس سی میں یونیورسٹی میں ٹاپ کیا اور اب یہ میتھس میں ماسٹرز کر رہے ہیں۔۔ ماسٹرز میں بھی ان کا ارادہ ہر سمسٹر میں ٹاپ کرنے کا ہی ہے۔۔۔ لیکن اہم یہ نہیں ہے کہ یہ ٹاپر ہیں۔ اہم یہ ہے کہ یہ کسی اکیڈمی اور

اسکول کالج جائے بنا پرائیوٹ پڑھ کر ٹاپ کرتے رہے ہیں۔۔۔۔ شاید یہ بھی اہم نہیں ہے۔۔۔ اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ نعمان ایک رکشہ ڈرائیور کے بیٹے ہیں۔ان کے فادر کا تب انتقال ہوا جب یہ آٹھویں میں تھے۔۔۔ دو چھوٹی بہنوں اور ماں کی ذمہ داری بھی ان پہ تھی۔صاف الفاظ میں گھر کا خرچا ان کے کاندھوں پہ تھا۔۔۔ اپنے ابا کا رکشہ دن رات چلاتے انھوں نے اپنے ناتواں کاندھوں پہ گھر کی گاڑی چلائی۔۔۔ ساتھ پڑھائی بھی کی اور آج یہ کہاں ہیں ہم سب دیکھ سکتے ہیں ۔'' میڈم نے اس نوجوان کو اشارہ کیا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔اس کے کسی انداز سے وہ رکشے والا نہیں لگتا تھا۔تعلیم جو نکھار شخصیت میں لاتی ہے، اس میں لا چکی تھی۔

''سواریوں کو لیتے چھوڑتے میں ذہن میں اپنا سبق دہراتا تھا، بعض دفعہ تو کئی کئی بار دہرا لیا کرتا، اتنا کہ میں انگلیوں کی پوروں پہ گنتی بھول جاتا تھا۔۔۔ جب سواری نہیں ملتی تھی تو کتابیں کھول کر پڑھتا رہتا تھا۔۔ میں نے وقت کا کوئی ہندسہ برباد نہیں کیا۔۔۔ رات کو گھر جا کر کھانا کھا کر بھی نیند کا سوچنے کی بجائے میں کتابیں کھولتا تھا۔۔۔ چوبیس گھنٹوں میں سے میں نے چار گھنٹے آرام اور بیس گھنٹے کام کیا ہے۔کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ ہم جتنا نیند کو بڑھاتے ہیں وہ بڑھتی جاتی ہے اسی لئے میں نے اسے کم کیا اور اپنی مرضی کے مطابق کر لیا۔۔ کوئی انسان اتنی محنت کرے تو کیسے ممکن ہے کہ اللہ اسے دوست نہ بنائے اور اللہ جسے دوست بنا لے اسے ضائع کیسے کر سکتا تھا، ناکامی کیسے دکھا سکتا ہے۔۔۔ کوئی کہے بھی تو میں مان نہیں سکتا۔ ایسے انسان کا کوئی قدم غلط نہیں اٹھتا کیونکہ اس کی انگلی خدا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔۔۔ لوگ کہتے ہیں یہ کتابی باتیں ہوتی ہیں۔میں مانتا ہوں۔۔۔ لیکن تب تک جب یہ علم سے عمل کا سفر طے نہیں کرتیں۔۔۔ عمل کے سفر میں یہ زندگی کی باتیں بن جاتی ہیں۔۔۔'' فاطمہ کا سر جھک گیا، نظریں دھندلا گئیں، دل بھر آگیا، جسم ہی پتھرا گیا۔وہ کبھی کسی سیلف میڈ انسان سے نہیں ملی تھی۔۔۔ ایسے انسان سے جو صفر سے بہت نیچے سے اٹھ کر اوپر آیا ہو۔۔۔ اور ایسے سے بھی نہیں جو ناکامی کو ہاتھوں کی لکیروں سے حذف کرتا اسے کامیابی کی لکیروں سے بدل دے۔۔۔ آج مل رہی تھی۔۔۔ متاثر ہو رہی تھی اور خود کو بہت چھوٹا سمجھ رہی تھی۔

محنت میں عار نہیں لیکن ہم خود کو محنت کرتے مظلوم کیوں سمجھنے لگتے ہیں۔۔۔؟ محنت کش اللہ کا دوست ہے پھر ہم اللہ کے دوست بننے سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں۔ مشقت اٹھانا کامیابی سے جا ملنا ہے تو ہمیں یہ رستہ اپناتے اتنا خوف کیوں محسوس ہوتا ہے، ہم خود ترسی کا شکار کیوں ہو جاتے ہیں۔۔۔؟ یکدم مظلوم، بے بس، لاچار اور دکھی سے کیوں دکھائی دینے لگتے ہیں۔۔۔؟ محنت کوئی موذی مرض تھوڑا ہی ہے جو ہمیں زندگی کی آخری سیڑھی پہ جا کھڑا کرتا ہے اور وہاں سے موت کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

''میڈم اسٹوڈنٹس انتظار کر رہے ہیں۔۔۔'' اس نے اجازت چاہی۔ میڈم نے اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر چلا گیا۔

''تم تو خوش قسمت ہو کہ تم پہ کسی دوسرے کی ذمہ داری نہیں ہے۔۔۔ یہاں ایسے کئی لوگ ہیں جن پہ اپنی ذمہ داری کے ساتھ اپنوں کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ اسے مسکراتے ہوئے اٹھاتے ہیں اور ہنستے ہوئے نبھاتے ہیں۔۔۔ وہ ہارتے نہیں ہیں کیونکہ وہ ہار کو موت سمجھتے ہیں۔۔ پھر تم کیوں ہار کی بات کر رہی ہو۔۔۔؟'' وہ مزید شرمندہ ہوئی تھی۔

میڈم نے اس کی دائیں طرف اشارہ کیا۔

''وہ گھر واپسی کا دروازہ ہے اگر تم اسے چننا چاہو تو۔۔۔ یہ محفوظ، آسان اور آرام دہ ہوگا۔ تمہیں کام نہیں کرنا پڑے گا، نہ ہی لڑنا پڑے گا اور نہ ہی ایسا کام بوجھ بنے گا جو تم کرنا نہیں چاہتی۔۔۔ یا پھر تم ڈٹ جاؤ اور آگے بڑھو۔ اس سب میں بہت سی تربیت، محنت اور خطرہ مول لینے کی ضرورت ہے لیکن بالآخر تمہیں اس کی قوت معلوم ہو جائے گی۔ اس بات کی میں قسم کھاتی ہوں۔'' وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ اسے اب واپس نہیں پلٹنا تھا۔ قدم اسے بڑھانا تھا، چلانا رب کی ذات نے تھا۔

اس نے فی الحال اسی کو غنیمت جانا اور اپنا کام شروع کیا۔ مختلف سائز اور ڈیزائن کے جیولری باکس اور واز کا اسے آرڈر ملا تھا لیکن خریدار نے اس سے جو ڈیزائن بنانے کا کہا تھا اس کے لئے میٹریل اسے خریدنا تھا اور اسی لئے وہ میڈم شیریں کے کاریگر کے ساتھ بازاروں کی خاک چھاننے کو تیار تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ علمی زندگی اور عملی زندگی کا فرق کسے کہتے ہیں۔۔۔؟ اس کی ابھی علمی زندگی اختتام پذیر ہوئی کہاں تھی کہ عملی

زندگی شروع ہو گئی تھی۔ جب آپ کا عمل شروع تو عملی زندگی بھی شروع۔۔۔ جب آپ زندگی کی دوڑ میں دھوپ سر پہ تانے، پسینہ بہاتے، چپل گھسیٹتے شامل ہو جائیں تو یہی عملی زندگی کا آغاز ہے۔

صبح نو بجے گھر سے نکل کر پچھلے چار گھنٹے سے وہ ہول سیل ڈیلرز سے دماغ کھپا رہی تھی، اشیاء کے تخمینے لگا رہی تھی، چیزوں کی پائیداری اور کوالٹی چیک کر رہی تھی، ہاتھ میں تھامے کیلکو لیٹر اور کاغذ قلم سے حساب کتاب کر رہی تھی۔ گو اس کام کے لئے اس کے ساتھ رشید (میڈم کا کاریگر) تھا جو اس کام میں ماہر تھا لیکن تھوڑا بہت ماہر وہ خود بھی بننا چاہ رہی تھی۔ دوسروں کے کندھے پہ ہاتھ رکھے کب تک اندھوں کی طرح وہ چلتی رہے گی، کب تک دوسروں کے تجربات سے سیکھے گی۔۔۔ آنکھوں والے کو اپنی بینائی کو استعمال میں لانا چاہیئے اور عقل کو بھی۔۔۔ کچھ تجربہ اسے بھی ہونا چاہیئے۔۔۔ کچھ ہوشیار اسے بھی بننا چاہیے۔

رشید صبح میں اکیڈمی کے لئے میٹریل اور آرڈرز لے جانے کا کام کرتا تھا۔ وہ انیس بیس سال کا پھرتیلا اور ہوشیار لڑکا تھا جو مارکیٹ کی رمزیں خوب سمجھتا تھا۔۔۔ اکیڈمی کے لئے کام کرنے کے ساتھ وہ پڑھائی بھی کر رہا تھا۔ مارکیٹ میں جا کر وہ اپنا پینترا اس طرح بدلتا تھا جیسے دکانداروں کے درمیان ہی پلا بڑھا ہو۔ ان سے بھی بڑھ کر وہ اشیاء کی معلومات رکھتا تھا۔ اس معاملے میں وہ بڑا کائیاں تھا کہ مال کہیں ناقص یا زیادہ داموں نہ بیچا جا رہا ہو۔ یہ ہنر اس نے سالوں کی ریاضت سے پایا تھا۔

اکیڈمی میں نہ صرف لڑکیوں کو ہنر سکھایا جاتا تھا بلکہ جو لڑکیاں اس کام کو بطور پیشہ اپنانا چاہتی تھیں ان کو کام بھی دلوایا جاتا تھا۔ میڈم شیریں کے کئی چھوٹی فیکٹریوں، دستکاری اسکولوں، آرٹ اینڈ کرافٹ شاپس، گفٹ شاپس کے ساتھ روابط تھے۔ لڑکیاں اپنی سہولت کے مطابق کام کا انتخاب کر لیتیں۔ پھر جب ان کے لائق کام ملتا تو اسے پورا کر کے میڈم کے حوالے کر دیتیں۔

جب وہ ساز و سامان سے لدی پھندی رکشے سے اتری تو اس وقت شام کے چار بجنے کو تھے۔

"Welcome to practical life ..." خود سے کہتے اس نے سامان رکشے والے سے اتروا کر، خود سے اٹھاتے ممٹی میں رکھا تھا۔

اس نے بیس چھوٹے بڑے طرح طرح کے جیولری باکس، سو مختلف طرز کے پیپر بیگ اور پانچ واز کا پندرہ دن کا آرڈر دس دن میں مکمل کر لیا تھا۔۔۔اس آرڈر کو مکمل کرنے کے لئے اس نے کتنی جان ماری تھی یہ وہی جانتی تھی۔دس دن وہ کام کرنے کے دوران اکثر اوپر ممٹی میں ہی سو جاتی تھی۔دھوپ، گرمی کی اس نے پرواہ نہیں کی تھی۔مچھروں کے کاٹنے کے باوجود تھکاوٹ اس قدر ہوتی کہ چند گھنٹے کی نیند وہ ایسے پوری کرتی جیسے مردوں سے شرط باندھ کر سوئی ہو۔بھوک اسے محسوس نہیں ہوتی تھی۔کبھی وہ ناشتے کے بعد رات کے کھانے پہ ہی نیچے آتی اور پھر سے اوپر چلی جاتی۔اور کبھی دوپہر کو کمر سیدھی کرنے کچھ دیر نیچے چلی آتی تو کچھ کھا پی لیتی۔دن کے آغاز پہ جو ٹارگٹ اس نے خود کو دیا ہوتا وہ پورا کر کے ہی وہ کمر سیدھی کرنے کا سوچتی تھی۔اور ایسے میں بیٹھے بیٹھے کمر اور ٹانگوں سے اتنا درد اٹھتا کہ اس کی چیخیں نکلنے کو ہوتیں۔اس کے پاس سب سے قیمتی متاع ''وقت'' تھا۔جو شے جتنی کم ہو اتنی نایاب ہوتی ہے۔اس کے لئے ایک ایک سیکنڈ نایاب تھا۔یہ سیکنڈ ہی تو ہوتے ہیں جو مل کر منٹ اور پھر گھنٹے بناتے ہیں اور ہم کتنی آسانی سے انھیں ضائع کر ڈالتے ہیں۔

آرٹ اینڈ کرافٹ شاپ کا آرڈر مکمل کرنے سے پہلے ہی اسے ایک اور ہینڈ میڈ گفٹ شاپ سے کینڈل اسٹینڈ اور وال ہینگنگ کا آرڈر مل گیا تھا جس کے لئے میٹریل لینے رشید کے ساتھ ہی جانا تھا۔

اس کے بہن بھائی اس کی سرگرمیاں دیکھتے ضرور تھے کہتے کچھ نہیں تھے۔وہ ہمیشہ سے اپنی دنیا میں رہنے والے لوگ تھے۔ایک دوسرے کی زندگی میں مداخلت نہ انھیں پسند تھی نہ وہ چاہتے تھے۔۔۔ بس امی نے شروع شروع میں اس سے ایک مرتبہ پوچھا تھا۔

''اتنی گرمی میں اوپر سارا دن کیا کرتی ہو کہ تمہیں کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔۔۔؟'' گھٹنوں کے درد کے باعث وہ اوپر چڑھنے کی ہمت نہیں کر سکتی تھیں۔

''اپنی تعمیر کر رہی ہوں۔'' کھانا کھانے کی بجائے وہ نگلنے کا کام کر رہی تھی۔اس کے پاس سکون سے کھانے کا وقت بھی نہیں تھا۔

''کیسی تعمیر۔۔۔؟''

''زندگی کا مقابلہ کرنے کی۔۔۔ وہ جو مجھے پہلے نہیں سکھایا گیا، وہ سیکھنے کی۔'' امی کو اس کی بات بری لگی تھی۔

''تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ہم نے تمہیں ٹھیک سے کچھ نہیں سکھایا۔''

''نہیں۔۔۔ لیکن بہت کچھ ایسا تھا جو سکھانا بھول گئے، جواب میں خود دیکھ رہی ہوں۔''

اس روز امی ممٹی میں اس سے بات کرنے آئی تھیں۔ ان کے آنے پہ وہ بہت حیران ہوئی تھی۔ جب سے اس نے یہ کام شروع کیا تھا شاذ ہی کوئی اس کے پاس اوپر آتا تھا۔ وہ کھانا کھانے نیچے جاتی یا باتھ روم کے لئے۔۔۔ کبھی اوپر ہی سو جاتی اور کبھی نیچے۔۔۔ کوئی اب اس سے کچھ نہیں پوچھتا تھا۔ سب ہی ''جب یہ ہماری نہیں سنتی تو ہم بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے'' کا لیبل چہرے پہ چسپاں کیئے اسے دیکھتے اور نظرانداز کرتے۔ اسے اس کے حال پہ تو وہ پہلے ہی چھوڑ چکے تھے۔ اب تو لگتا تھا کہ کوئی اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

''مشکل میں جو چیز سب سے زیادہ درکار ہوتی ہے وہ اپنوں کا ساتھ ہوتا ہے اور مجھے وہی نہیں ملا۔'' بہت پہلے ہی اس نے آنکھیں رگڑ رگڑ کر صاف کرتے ان سب کے رویوں پہ کڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ دوسروں کے رویوں پہ رونا خود کو اذیت دینا تھا اور دنیا تھی نا اذیت دینے کے لئے، پھر وہ یہ کام کیوں کرتی۔۔؟

''تم سے ایک بات کرنا تھی۔۔۔'' امی نے اس کے جا بجا بکھرے سامان کو دیکھا جن کے درمیان ہی وہ گھسی بیٹھی انھی ڈبوں، گتوں، کاغذوں اور آرائشی اشیاء میں سے لگ رہی تھی۔۔۔ انھی کا ایک حصہ۔

اس نے سامان سمیٹتے ہوئے امی کے لئے ایک بڑے کنستر کو الٹا کر کے اس پہ چھوٹی گدی رکھ کر جگہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

''میں بیٹھنے نہیں آئی۔'' انھوں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

''برابر والی گلی سے مسز ممتاز آئی تھیں اپنے بیٹے کی ٹیوشن کی بات کرنے۔ میں نے منع کر دیا کہ

تمہارے پاس تو کسی سے بات تک کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اس گھر میں مسافر بن کر رہ رہی ہو۔ ہم سب تمہاری شکل دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ اتنا وقت کسی کے لئے کہاں نکال سکتی ہو کہ کسی کو پڑھا سکو۔'' نرمی سے شروع کی گئی بات طنز پہ ختم ہوئی۔

''اصرار کر رہی تھیں کہ تم سے پوچھ لوں۔ وہی پوچھنے آئی ہوں۔''

''میں پڑھا لوں گی۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''پڑھا سکو گی۔۔۔؟'' وہ کچھ حیران ہوئیں۔

''ان سے پوچھ لیں کہ کتنے گھنٹے پڑھانا ہے اور وہ کتنی فیس دیں گی۔'' اس نے مطلب کی بات ہی کی۔ بیٹھے بٹھائے اگر اسے کام کرنے کے دوران ہی ایک اور کام مل رہا تھا تو وہ کیوں انکار کرتی۔

''تھری میں ہے ان کا بیٹا۔۔۔ میں تو ایک بار ہی ملی ہوں لیکن وہ خود بتاتی ہیں کہ بہت شرارتی ہے۔۔۔ پڑھنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہوتا۔''

اسے ان زائد معلومات میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

''سارے مضامین پڑھانے ہیں۔ جب کام ختم ہو جائے تو بھیج دیا کرنا۔ پیسے کوئی اتنے خاص نہیں دے رہیں۔ بھلا ایک ہزار میں کون ایسے بچے کو سارے مضامین پڑھاتا ہے جو کسی سے پڑھنے کا نام نہ لے رہا ہو۔'' امی کو پیسے کم اور کام زیادہ لگ رہا تھا۔ مگر اس نے فوراً حامی بھر لی۔

''میں پڑھا دوں گی۔''

''بچہ بہت شرارتی ہے۔''

''ہے تو بچہ ہی نا۔'' لیکن جلد اسے پتا چلنے والا تھا کہ وہ بچہ درحقیقت شیطان کا بچہ تھا۔

❁ ❁

ناول سپاس گزار کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 3

اگلے ہی دن سے ایک صحت مند بچہ، چہرے پہ معصومیت اور آنکھوں میں شرارت لئے فاطمہ کے پاس موجود تھا۔ کاندھے پہ کراس بیگ پہنے وہ کچھ ناگواری سے اس کے اس کاٹھ کباڑ کو دیکھ رہا تھا جو اس کی کل متاع تھی۔

''آئی ایم ہمدان۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تھا جسے فاطمہ نے تھامنے سے گریز کیا۔ آدھے سر پہ بال اور باقی آدھے پہ اس نے تازہ استرا پھروا رکھا تھا۔۔۔ جو گنتی کے چند بال تھے وہ یوں کھڑے تھے جیسے ابھی ان میں کرنٹ چھوڑا گیا ہو۔۔۔ بلیو جینز جان بوجھ کر گھٹنوں سے پھاڑ کر فیشن کرنے کی کچھ کچھ کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ گلے میں دھاگا باندھ کر ایک چھوٹا سا چھلا نما پینڈنٹ اس نے پہن رکھا تھا۔ چپل ایک پاؤں میں کالی اور دوسری میں سرخ تھی۔۔۔ سویٹر سرخ رنگ کی تھی جس کا ایک آستین اس نے خود ہی قینچی سے کاٹ کر اسے اسٹائل دینے کی کوشش کی تھی۔ یہ تیسری جماعت کے بچے کا فیشن تھا؟

ایسا نمونہ دیکھ کر اسے کچھ ہنسی آ گئی جو وہ فوراً ہی چھپا گئی۔ ہنس کر اسے ننھے منے بچے کو سر پہ نہیں بٹھانا تھا۔ نجانے اس کی چھٹی حس کیوں کہہ رہی تھی کہ وہ اسے ناکوں چنے چبوانے وہاں آیا ہے۔۔۔

''welcome hamdan.... please have a seat.''

اپنے ہاتھوں سے بنایا ایک ڈھول نما اسٹول اس نے اس کی طرف سرکایا۔ اپنا بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کرتے اس نے ناک سکوڑی۔ اسے یہ برا لگا تھا کہ اس کا ہاتھ تھام کر خوش آمدید نہیں کہا گیا۔ اس کے رستے میں پھول نہیں بچھائے گئے۔ کوئی ہاتھی گھوڑے اس کے سامنے سلامی دینے آ موجود نہیں ہوئے۔ یہ اس کی کھلم کھلا بے عزتی تھی جو اسے پسند نہیں آئی تھی۔

''یہ سیٹ ہے کیا۔۔؟'' گھوم گھوم کر وہ اسٹول کا طواف کر رہا تھا کہ یہ جو ہر طرف سے گول ہے، اس پہ بیٹھنے سے کہیں وہی گول نہ ہو جائے۔

''بیٹھ جاؤ ہمدان۔۔۔ یہ بہت مضبوط اور نایاب ہے۔''

''میوزیم سے نکلا ہے۔۔؟''

''ہاں۔۔۔ جب تم میوزیم سے آزاد ہوئے تھے تو تمہارے ساتھ یہ بھی وہیں سے نکل رہا تھا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور تمہیں جانے دیا۔'' ہمدان نے اسے کچھ مسکرا کر دیکھا جیسے اس کا یہ جواب اسے پسند آیا ہو۔

''کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ مجھے بھی ساتھ ہی پکڑ لیتیں تو آپ یقیناً آج بہت فائدے میں ہوتیں۔'' اب کی بار فاطمہ نے اسے کچھ گھور کر دیکھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنا کراس بیگ اتار کر ایک طرف رکھ رہا تھا۔

''میں اس اونچے اسٹول پہ چڑھ گیا تو اتروں گا کیسے۔۔۔؟ کاپی کتابیں کہاں رکھوں گا، کہاں سنبھالوں گا۔۔۔؟ بیگ سے بکس کیسے نکالوں گا۔۔۔؟'' بچہ اسمارٹ تھا۔

''یہ گدی لو اور یہاں بیٹھ جاؤ۔'' اس نے دری پہ ایک طرف جگہ بنائی۔

''ای ی ی۔۔۔ یہاں۔۔؟'' اس نے سخت برا منہ بنایا تھا۔

''میں تمہارے لئے تخت نہیں بچھا سکتی۔۔۔ بیٹھنا ہے تو بیٹھو ورنہ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ وہ بڑے آرام سے تم جیسوں کے لئے جگہ بناتی ہے۔''

''تو آپ سنجیدہ ہیں۔۔۔؟ مطلب ہم اس جگہ بیٹھ کر پڑھا کریں گے جہاں میں کبھی ٹم اور میمی کو بھی بٹھانا پسند نہ کروں۔'' اب یہ کن بلاؤں کے نام تھے جو وہ لے رہا تھا۔ فاطمہ نے دائیں آبرو اچکائی۔

''میرے پالتو جانور ہیں۔ ٹم میرا کتا ہے اور میمی میری بلی ہے۔۔۔ میرے گھر میں ان کے رہنے کی جگہ اس سے بہت زبردست ہے۔'' برا منہ بنانے کی باری اب فاطمہ کی تھی۔

''میں یہاں بیٹھ کر کام کرتی ہوں تو تم یہاں بیٹھ کر پڑھ کیوں نہیں سکتے۔۔؟'' اب کی بار وہ

خاصی سختی سے بولی تھی۔ وہ جگہ ہر طرح سے صاف تھی۔ ہاں جو بھی سامان بکھرا ہوا تھا وہ سب کام کا تھا جسے وہ اٹھا کر پھینک نہیں سکتی تھی۔ لیکن کم از کم گندگی کا وہاں دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ وہ روزانہ کام شروع کرنے سے پہلے اس جگہ کو صاف کرتی تھی۔

اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ وہ کچھ سوچ کر وہیں دری پہ بچھی گدی پہ بیٹھ گیا۔۔۔ فاطمہ نے اس کی ڈائری کھول کر اس کا کام دیکھا۔ تب تک وہ سوالات کرتا اس کے کان کھاتا اور دماغ پکاتا رہا۔

''یہ کام آپ کیوں کر رہی ہیں۔۔؟''

''یہاں آپ کو ٹھنڈ نہیں لگ رہی۔۔۔؟''

''کیا آپ یہیں سوتی ہیں۔۔؟''

''ایسی جگہوں پہ تو بہت کیڑے ہوتے ہیں، چھپکلی اور کن کھجورا۔۔۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے ان سے۔'' اس نے خوف سے جھرجھری لی حالانکہ یہ کام چھپکلی اور کن کھجورے کو کرنا چاہئے تھا۔

''کیا آپ کسی کباڑیے کے ساتھ کام کرتی ہیں، مطلب پارٹنر شپ وغیرہ۔۔۔؟''

''ٹین ڈبے والا اپنی ریڑھی کو یہیں خالی کر کے تو نہیں جاتا۔۔۔؟''

کتابوں کا ایک پہاڑ بنا کر وہ اس کے سر پہ دے مارنے کی شدید خواہش رکھتی تھی یا کم از کم ایک آدھ جلتا کوئلہ ہی اس کی زبان پہ رکھ دینے کا۔۔۔ اور نہیں تو سرخ مرچیں اس کے منہ میں ٹھونسنے کا۔۔۔ کم از کم وہ اس کے کان کترنے سے تو باز آ جائے گا۔

''ہمدان! اب میں تمہاری آواز نہ سنوں۔۔۔ چلو اپنا کام شروع کرو اور یہ جو مشکل الفاظ ٹیچر نے دیے ہیں ان کو رف کاپی پہ لکھو پھر میں زبانی لکھواتی ہوں۔''

''میں کام کرنے کے دوران چپ نہیں بیٹھ سکتا۔'' کاپی اور کتاب سامنے رکھتے اس نے نئی پریشانی کا تذکرہ کیا۔

''اور مجھے کام کے دوران بولنا سخت برا لگتا ہے۔''

"پھر تو ہمارا سفر یہیں تمام ہوا۔ اچھا لگا مجھے آپ سے مل کر۔۔۔اور بھی اچھا ہوتا اگر ہم ساتھ کام کر سکتے۔۔۔" کھلی کتاب اور کاپی اس نے فوراً بند کر دیں۔ انھیں بیگ میں رکھتے دانت نکالے۔ فاطمہ کا تو دماغ ہی گھوم گیا۔ ایسا بچہ یعنی بچے کے بھیس میں ایسا شیطان وہ بھی چرب زبان اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

"مجھے تمہیں چپ کرانا آتا ہے۔۔۔؟" چندھیائی آنکھوں سے، ناک سکوڑتے اس نے اس بچے کو گھورا جو ایک عدد "دادا بچہ" تھا۔

"ممی میرے کان کھینچتی ہیں لیکن مجھے اس سے خاص فرق نہیں پڑتا۔ لیکن سب کہتے ہیں کہ میرے کان کھینچنے کی وجہ سے لمبے ہو گئے ہیں۔۔۔ تو آپ کیا کریں گی جس سے میری زبان بند رہے۔۔۔؟ جسٹ فار انفارمیشن پوچھ رہا ہوں۔"

فاطمہ نے چند لمحے اسے خاموشی سے گھور کر دیکھا اور پھر اپنے سامان میں سے ماسکنگ ٹیپ نکال کر اس کے دو بڑے بڑے ٹکڑے کاٹ کر اس کے منہ پہ چسپاں کر دیے۔ وہ ہلکی پھلکی مزاحمت ہی کر سکا اور پھر خاموشی سے اپنا کام کرنے لگا۔

"اگر آج کا کام ختم نہ کیا تو میں گھر نہیں جانے دوں گی۔۔۔ میں خود بھوکی سارا دن اسی جگہ بیٹھ کر کام کرتی ہوں، تمہیں بھی بٹھائے رکھوں گی۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ تم شرافت سے اپنا کام مکمل کرو اور وقت سے گھر جاؤ۔" ہمدان نے کچھ برہمی سے اسے دیکھا پھر سر جھکا کر کاپی پہ لکھنے لگا۔

"and listen ....." اس نے سر اٹھا کر یوں دیکھا کہ اب کچھ اور بھی ہے تو کہہ دو۔ کوئی نئی دھمکی، کوئی عمدہ سزا۔ ابھی وہ اسے باری دے رہا تھا، پھر وہ اپنی باری لے گا۔

"میں تمہاری ممی نہیں ہوں کہ جو تمہارے کان کھینچ کر چھوڑ دوں گی۔ میں رکھ رکھ کر دو تین تھپڑ لگاؤں گی تو تمہارے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ میرا ہاتھ بہت سخت ہے اور جب پڑتا ہے تو نانی دادی اور ان کی بھی نانی دادی یاد آ جاتی ہیں۔" ہمدان نے اس کے کام کرتے سخت اور کھردرے ہاتھوں کو دیکھا جو واقعی کسی فولاد کی مانند تھے۔ وہ کسی لڑکی کے ہاتھ تو نہیں تھے۔

اس کے بعد وہ اپنا کام ختم کر کے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارے کرنے لگا۔ اس کی بات فاطمہ کو سمجھ نہ آئی تو اس کا منہ کھول دیا۔

"ہر کام ختم ہونے کے بعد مجھے کچھ دیر بولنے دیں ورنہ میں مر جاؤں گا۔ زندہ رہنے کے لئے میرا بولنا بہت ضروری ہے۔" فاطمہ نے اپنے اندر ابلتے قہقہے کا گلا گھونٹ کر بس سر ہلا دیا۔ اب وہ اس سے ادھر ادھر کے بے مقصد سوالات کرتا رہا۔ اس کی چیزیں اٹھا اٹھا کر احتیاط سے دیکھتا رہا۔

وہ شرارتی تھا، حد کا باتونی تھا لیکن بدتمیز نہیں تھا۔ بدتمیز ہوتا تو اس کے ٹیپ لگانے پہ اسی وقت اتار بھی سکتا تھا۔۔۔ اس کے ہاتھ کھلے تھے اور وہ یہ باسانی کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔۔۔ یہی سوچ کر فاطمہ کو کچھ کچھ اطمینان ہو گیا جو جلد ہی رخصت ہونے والا تھا۔ تین گھنٹے کا کام وہ ڈیڑھ گھنٹے میں کر کے جا چکا تھا۔ فاطمہ کو لگا کہ یہ اس کی کامیابی ہے۔ وہ ایسے بچے کو قابو کر کے کام کروانے میں کامیاب ہی تو ہوئی تھی لیکن اسے غلط لگا تھا۔

اگلے دن وہ پورے وقت پہ اس کے پاس تھا۔ اس دن کا حلیہ پچھلے دن سے کچھ مختلف تھا۔ سر پہ اونی ٹوپی پہنے اس نے چمڑے کا عجیب خلقت لباس پہن رکھا تھا جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ گھوڑے کی پیٹھ سے کاٹھی اتار کر گلے میں ڈال لی ہو۔ پاؤں میں بھی گھٹنوں تک آتے چمڑے کے جوتے تھے اور ہاتھوں میں چمڑے کے بنے بنا انگلیوں کے دستانے جن پہ کانٹے دار اسپرنگ لگے تھے۔

"تم کہیں شوبز میں جانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے۔۔۔ ماڈلنگ شاڈلنگ۔۔ ڈریس ڈیزائنر۔۔ میک اپ آرٹسٹ۔۔۔"

"رکھتا ہوں لیکن بالی ووڈ تک رسائی کیسے ہو یہ سوچ رہا ہوں۔۔۔"

فاطمہ نے آنکھوں کو پٹپٹاتے اس تیسری جماعت کے بچے کی خود اعتمادی کی نظر اپنی نظروں سے اتاری۔۔۔ اس نے واقعی اب تک اس جیسا بچہ نہیں دیکھا تھا۔

ابھی وہ اپنی کتابیں کھول کر بیٹھا ہی تھا کہ فاطمہ نے سب سے اوپر رکھی اس کی ڈائری اٹھائی تاکہ اس کا ہوم ورک چیک کر سکے۔ ڈائری کھولتے ہی زبردست دھماکہ ہوا، ڈھیروں دھوئیں کے

بادل اٹھے اور فاطمہ کی چیخوں اور ہمدان کے قہقہوں نے ممّی کو یقیناً اپنی جگہ سے سوفٹ اوپر پہنچا دیا۔

دھواں چھٹا تو فاطمہ کے ہواس بحال ہوئے، کچھ نظر آیا تو معصوم صورت لئے ہمدان کو اس نے غصے سے دیکھا۔

"یہ کیا تھا۔۔؟" وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکی تھی کہ دراصل ہوا کیا تھا۔

"یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں۔ سب کچھ آپ نے خود کیا ہے۔۔۔ میں تو اپنی کتابیں نکال رہا تھا۔" وہ یکدم بہت بے چارہ سا بن گیا۔ دنیا پہ موجود سب سے معصوم روح۔۔۔

"تمہاری اس ڈائری نے سب کیا ہے نا۔۔۔؟" وہ ڈری ڈری نظروں سے اس ڈائری کو دیکھ رہی تھی۔

"لیکن وہ تو بے جان ہے۔ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی۔ وہ کیسے یہ سب کر سکتی ہے۔۔۔؟ بھلا ڈائریز بھی دھماکے کرتی ہیں کیا۔۔۔؟ میں نے تو کبھی ایسی ڈائری نہیں دیکھی۔ یقین نہیں آ رہا تو اسے کھول کر دیکھیں۔۔۔" فاطمہ نے ڈائری کی جانب بڑھتا اس کا ہاتھ پرے کر کے اس کا کان مروڑا۔۔۔

"میں بتا بھی چکا ہوں کہ کان مروڑنے سے کچھ نہیں ہوگا سوائے ان کی لمبائی زیادہ ہونے کے۔۔ میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔" بروں میں سب سے برا منہ بناتے اس نے فاطمہ کو دیکھا۔

"اب اگر ایسی کوئی شرارت کی تو۔۔۔۔"

"میں اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں ۔۔۔ ڈائری آپ نے اٹھائی، آپ نے کھولی اور الزام مجھ پہ ۔۔۔ کیا اب دن رات مجھ پہ الزام بھی لگائے جائیں گے۔" منہ بسورے، ناک سکوڑے وہ فاطمہ کو دیکھ کر اب کام کرنے لگا تھا۔

اس روز بھی اس نے وقت سے پہلے کام ختم کر لیا تھا۔ جانے سے پہلے اس کے ہاتھ سے ایک پرانا جیومیٹری باکس گرا تھا جو اس نے جلدی سے سمیٹ کر بیگ میں رکھا اور بھاگ گیا۔۔۔ اس کے جانے کے بعد کالے چیونٹوں کی ایک فوج تھی جو ادھر ادھر، یہاں وہاں ہر طرف سے نکلتی چلی آ رہی تھی ۔ وہ بس یہی سوچ رہی تھی کہ اس سے پہلے کبھی ایک آدھ چیونٹا بھی دیکھنے کو نہیں ملا تو اب اتنی لائن کہاں

سے لگ گئی۔۔۔اور گلی میں عظیم قہقہوں کا مالک اپنے سکیٹنگ بورڈ پہ چڑھا، بیگ کمر پہ ٹکائے اس منظر کو سوچتے طرح طرح کے کرتب دکھا رہا تھا۔ پورا گھنٹہ لگا تھا فاطمہ کو ان چلتے پھرتے حشرات کو لاشوں میں تبدیل کرنے میں اور اس بل کا کھوج لگانے میں جہاں سے یہ انڈ انڈ کر نکل رہی تھیں۔ وہ ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی جس کے داہنے پہ سوراخ تھا اور وہ سامان کے نیچے سے برآمد ہوئی تھی۔

''ہمدان ن ن ن ن۔۔۔۔'' اس کا فشار خون بلند ہونے لگا۔

''تو تم شرارت سے باز نہیں آؤ گے۔۔۔؟'' اگلے دن جیسے ہی وہ آیا فاطمہ نے اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دیے۔

''آپ مجھے پڑھانے سے باز آجائیں میں شرارتوں سے توبہ کر لوں گا۔'' اب تو فاطمہ کو لگنے لگا تھا کہ اسے پڑھانے کا فیصلہ اس کی زندگی کا بھیانک فیصلہ تھا۔ امی ٹھیک کہہ رہی تھیں کہ چند ہزار اس شیطان نما انسان کو پڑھانے کے لئے ناکافی تھے لیکن اب مسئلہ انا کا تھا۔ وہ کیسے پیچھے ہٹ جاتی۔ وہ پیچھے ہٹ جاتی، اسے پڑھانے سے معذرت کر لیتی تو وہ سمجھتا کہ وہ ڈر گئی ہے۔۔۔ اس ننھے منے بچے سے ڈر تو وہ گئی تھی لیکن ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کتنی سبکی ہوتی کہ وہ ایک چھٹانک بھر کے بچے سے ڈر گئی ہے۔

'' وہ تو کبھی نہیں ہوگا لیکن میں تمہیں انسان بنا کر دم لوں گی۔۔۔'' اس کے ہاتھ پیچھے باندھ کر ہی اس نے کتابیں اس کے سامنے کھول دیں۔۔۔ آج اس نے کچھ بھی لکھنا نہیں تھا، سب زبانی یاد کرنا تھا۔ سب یاد کر لینے کے بعد فاطمہ نے اس کے ہاتھ کھول دیے تاکہ وہ کتابیں سمیٹے اور گھر جائے۔۔۔ اس دن اس کا بہت حساس آرڈر تھا جو اسے مکمل کرنا تھا۔ وقت کم تھا اور کام سمٹنے میں نہیں آرہا تھا۔ اسی لئے وہ ہمدان پہ مسلسل نظر رکھے ہوئے تھی کہ وہ کسی قسم کی گڑبڑ نہ کرے۔ وہ بڑی سعادت مندی سے اپنا سارا سامان سمیٹ کر جانے کے قریب تھا۔

''مس ببل کھائیں گی۔۔۔؟'' جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے جیسے ہی ببل نکالا فاطمہ یوں اچھلی جیسے اس کی جیب سے ریوالور برآمد ہوا ہو۔

''میں نہیں کھاتی ببل۔۔۔ اور کھاتی بھی ہوتی تو بھی مجھ پہ اتنا برا وقت نہیں آیا کہ تم سے لے

کر کھاتی۔۔۔ اب جاؤ یہاں سے۔ مجھے بہت سا کام کرنا ہے۔"

"چلیں مت کھائیں۔۔۔ اتنا تو بتا دیں کہ میں یہ ببل کہاں پھینکوں۔۔۔؟" اپنے منہ سے ببل نکال کر اس نے ایک چھوٹے سے کاغذ میں لپیٹا اور اسے پھینکنے کے لئے ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

"وہ سامنے کوڑے کا ڈرم ہے، اس میں ڈال دو۔" ایک کونے میں اس نے چھوٹا سا ڈرم رکھا تھا جس میں وہ کچرا ڈال دیتی تھی۔ سر ہلاتے اس نے دور سے ہی کاغذ ڈرم کی طرف اچھالا اور جونہی وہ ڈرم میں گرا ایک شعلہ بلند ہو کر باہر گرا اور پاس پڑے اس کے تازہ بنائے واز سے جا ٹکرایا۔ ایک سیکنڈ کے اندر واز نے آگ پکڑ لی۔۔۔ فاطمہ بت بنی سب دیکھ رہی تھی۔ ہمدان کی پتلیاں بھی ساکت تھیں۔ اسے قطعاً امید نہیں تھی کہ یہ سب ہو گا۔ لیکن یہ سب ہو چکا تھا۔

اپنی پانی کی بوتل کھول کر اس نے سارا پانی اس پہ انڈیل دیا۔ آگ بجھ گئی لیکن واز تباہ ہو گیا۔

فاطمہ اپنی جگہ سے اٹھی، ہمدان کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف موڑا اور ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پہ جڑ دیا۔

"مذاق کی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔ اب تک جو تم نے کیا میں نے برداشت کیا کیونکہ وہ بے ضرر حرکتیں تھیں لیکن اب جو ہوا۔۔۔ پیسے والے ماں باپ کی بگڑی ہوئی اولاد، تمہارے نزدیک ہر بات مذاق ہے، دوسروں کا نقصان بھی شرارت ہے۔۔۔ میں نے کتنا وقت لگا کر وہ واز بنایا تھا۔۔۔ کتنے پیسے لگ گئے اس کا سامان خریدنے میں۔۔۔ کتنی محنت کی تھی میں نے اور تم نے ایک چبائی ہوئی ببل گم سے اسے خاک کر دیا۔۔۔ میرا وقت، میرا پیسہ، میری محنت خاک کر دی۔" جملے کے اختتام تک اس کی آواز پھٹ گئی تھی، آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ اور وہ وہیں ایک طرف کھڑی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو دی تھی۔

ہمدان گال پہ ہاتھ رکھے بالکل فریز ہو گیا تھا۔

اس قسم کی شرارتیں اس کا معمول تھیں۔۔۔ اسکول میں بھی اس نے اپنے کلاس فیلوز اور ٹیچرز کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کتنی بار اس کے والدین اس کا اسکول بدل چکے تھے اور کتنی بار وہ اسکول سے

نکالا بھی گیا تھا باوجود اس کے کہ وہ ایک بے حد ذہین اسٹوڈنٹ تھا۔ سب سے زیادہ زچ اس نے ہمیشہ اپنے ٹیوٹرز کو ہی کیا تھا۔۔۔ وہ ایسی ویسی حرکتیں کر کے انھیں پہلے نہیں تو دوسرے دن تو بھگا ہی دیا کرتا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس کی ٹیوٹر مستقل مزاج ثابت ہو رہی تھی۔ نہ وہ اسے بھگانے کو تیار تھی نہ خود بھاگنے کو۔۔ اور یہ بھی پہلی بار تھا کہ اس کی

کسی شرارت پہ کسی کا ایسا نقصان ہوا تھا کہ وہ اس کے سامنے یوں رو دی تھی۔ وہ بالکل سانس روکے اسے روتے دیکھ رہا تھا۔ حلق میں جیسے کانٹے اگ آئے تھے کہ اس سے کچھ بولا تک نہیں جا رہا تھا۔

''آئی۔۔۔ ایم۔۔۔ سوری۔۔۔'' یہ سب کہتے اسے بے حد شرمندگی ہوئی تھی۔ اتنی کہ اس کا دل کیا کہ وہ بھی خاک ہو جانے والے واز، وقت، محنت اور پیسے کے ساتھ شامل ہو جاتا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے اور دوبارہ مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا۔'' وہ بری طرح چلائی تھی۔

''میم۔۔۔''

''کہا نا جاؤ۔۔۔ تمہیں مجھ سے نہیں پڑھنا تو مجھے بھی تم جیسی عفریت کو نہیں پڑھانا۔''

ہمدان تیزی سے بیگ کاندھے پہ پہن کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ فاطمہ نے راکھ بنے واز کو ڈبڈبائی نظروں سے دیکھا اور پھر سے رونے لگی۔

اگلے دن وہ پورے وقت پہ پہنچ گیا تھا۔ اس دن اس کا لباس بالکل عام تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پہلی بار شیطان انسان کا بہروپ اپنائے تشریف لایا تھا۔

''میں تمہیں واضح کہہ چکی تھی کہ مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔'' چٹان ساخت لہجہ اس نے اپناتے انگارہ برستی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بھولی تھی۔

''اسی لئے میں شکل چھپا کر آیا ہوں۔'' اس نے چہرے کو مکھوٹے میں چھپا رکھا تھا۔

''میں تمہیں مر کر بھی نہیں پڑھاؤں گی۔'' دوٹوک انداز۔

''میں بھی مر جاؤں گا لیکن آپ سے ہی پڑھوں گا۔'' ہٹ دھرم انداز۔

وہ ہالی ووڈ میں چلا جاتا تو آسکر جیت کر ہی دم لیتا۔۔۔

''ٹھیک ہے تو مر جاؤ پھر۔۔۔ کیونکہ میں تمہیں پڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔''

مکھوٹا اس نے چہرے سے ہٹا کر ایک طرف گرا دیا تھا۔ سر جھکائے وہ زمین پہ ہی بیٹھا اپنے بیگ کی زپ سے کھیلنے لگا۔ پہلے دن جو سرے سے وہاں بیٹھنے پہ ہی رضا مند نہیں تھا وہ اب مزے سے زمین پہ بیٹھ گیا تھا۔۔۔ اس کا چہرہ افسردہ تھا اور وہ ہونٹ لٹکائے بالکل خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

فاطمہ نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا تو اسے اس کی آنکھوں میں نمی واضح دکھائی دی۔

''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' فاطمہ نے اس کا جملہ سنا ان سنا کر دیا۔

''میں نے ہمیشہ بہت لوگوں کو ستایا ہے لیکن کبھی کسی نے مجھ سے اتنی نفرت نہیں کی کہ مرنے کی بد دعا دے سوائے آپ کے۔'' ضبط کی کوشش میں فاطمہ نے لب بھینچ لئے۔اسے احساس ہوا کہ جو بھی تھا اسے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ جتنا بھی وہ شیطان تھا، تھا تو بچہ ہی۔

اس نے آج تک کبھی کسی بچے سے اتنی سختی سے بات نہیں کی تھی۔

''ممی بابا سے جب بھی میری شکایت کرتیں کہ یہ بہت شرارتی ہے تو بابا ایک ہی بات کہتے کہ بچے شرارتیں کرتے، اچھلتے کودتے ہی سب سیکھتے ہیں۔ بابا ٹھیک کہتے تھے، میں نے اپنی شرارتوں اور مستیوں میں بہت کچھ سیکھا۔۔۔ آج یہ بھی سیکھ لیا کہ کوئی آپ کی شرارت سے اتنا بھی تنگ آ سکتا ہے کہ وہ آپ کی موت کی تمنا کرے۔'' اپنی ہاتھ کی پشت سے رگڑ رگڑ کر اس نے اپنے چہرے پہ پھیلنے والے آنسوؤں کو صاف کیا۔ فاطمہ کا دل جیسے ڈوب گیا۔

''لیکن ایک بات بتا دیں بس۔ پھر بیشک مجھے مت پڑھانا۔ میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ آپ بھی سمجھنا کہ واقعی ہمدان مر گیا۔'' اس کے دل کو کچھ ہوا۔

''اگر میں مر جاؤں تو کیا آپ کو خوشی ملے گی۔۔۔؟'' اس نے آنسو بہاتے اسے دیکھا تو فاطمہ نے سر نفی میں ہلایا۔

''میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا جو ابھی میں نے کہا۔۔۔'' وہ اپنے کہے پہ پشیمان تھی۔

''میں نے بھی ایسا کبھی نہیں چاہا تھا جو کل میں نے کیا۔۔۔'' وہ بھی اپنے کئے پہ نادم تھا۔

''میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا ہمدان۔'' وہ نرم پڑی۔

''میرا مقصد بھی آپ کو نقصان پہنچانا نہیں تھا میم۔'' وہ اپنی غلطی تسلیم کر رہا تھا۔ فاطمہ نے سب سمجھتے جیسے اثبات میں سر ہلایا۔

''دونوں طرف سے حساب برابر ہوا۔۔۔ تو چلو یوں کرتے ہیں کہ سب بھول جاتے ہیں۔ جو تم نے کیا، جو میں نے کہا۔۔۔ اور ہم دوست بن جاتے ہیں۔۔۔'' وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اتنے قریب کہ اس کی نم آنکھوں سے گرتے سبھی قطروں کو اس نے اپنی ہتھیلی میں چن لیا۔ ہمدان نے اثبات میں سر ہلایا اور نرمی سے مسکرا دیا۔ فاطمہ نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا جو ہمدان نے تھام لیا۔

''لیکن پڑھوں گا اب میں آپ سے ہی۔۔۔''

''میرے علاوہ تو اب تم کسی سے پڑھ ہی نہیں سکتے۔۔۔'' وہ کھل کر مسکرا دی۔

''ویسے اگر میں اتنا شاندار اسکرین پہ رو دوں اور یہی سب کہہ دوں تو ہالی وڈ کی اگلی فلم میں مجھے کاسٹ تو کر لیا جائے گا نا۔۔۔؟'' فاطمہ نے بے یقینی سے آنکھیں پھیلائیں۔

''یہ ایکٹنگ تھی۔۔۔؟''

''سچ تھا لیکن اگر میں ایسا رو دوں تو۔۔۔؟'' فاطمہ نے گہری سانس خارج کی۔ سچ میں اس جیسا بچہ اس نے نہیں دیکھا تھا۔

یہ ان کی دوستی کا آغاز تھا۔

اس کا رزلٹ بہت شاندار آیا تھا۔ امی نے آگے ایڈمیشن لینے کی بات کی تو وہ خاموش رہی تھی۔ وہ امی بابا کی اکھٹے موجودگی کی صورت میں انھیں اپنے فیصلے کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔ یقیناً وہ ناخوش ہوں گے۔ خوش تو وہ بھی نہیں تھی لیکن مجبور تھی بالکل ویسے ہی جیسے وہ مجبور تھے۔

ابا نے ایک رات اس کے کمرے کا رخ کیا تھا۔

''تم یہ چھت پہ کیا کباڑ خانہ کھول کر بیٹھی ہو۔۔۔؟ یہ سامان کیوں جمع کر رکھا ہے۔۔۔؟ جو کارٹن بھر بھر کر آئے دن سامان خرید کر لاتی ہو اس کے لئے پیسہ کہاں سے لا رہی ہو۔۔۔؟'' اسے

کہیں سے تو شروع کرنا تھا اور شروعات کے لئے پیسہ ایک بڑی حقیقت تھی۔ پیسہ اس نے میڈم شیریں سے ہی ادھار لیا تھا کہ وہ آرڈرز کی پے منٹ ملنے پہ لوٹا دے گی اور وہ یہ کام ساتھ ساتھ کر رہی تھی۔ بتدریج اتارنے والے بوجھ یکدم اتارنے والے بوجھ سے بہتر ہوتے ہیں۔ اس سے جھٹکا کم لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

'' میں نے کچھ آرڈرز لئے ہیں۔ انھی پہ کام کر رہی ہوں۔'' اس نے یوں بتایا جیسے بہت عام سی بات ہو، جیسے وہ انھیں بتا رہی ہو کہ وہ کھانے میں اپنی پسندیدہ بریانی کھا رہی ہے، وہ ابھی اپنا من پسند ڈرامہ دیکھے گی، کچھ دیر آرام کرے گی نہیں تو فون پہ بات۔ اتنی ہی عام سی باتوں کی طرح اس نے وہ ایک عام سی بات بھی کر ڈالی تھی۔

ابا یقیناً اس کی غیر حاضری میں اوپر گئے تھے جب وہ بازار سے میٹریل اٹھانے گئی ہوئی تھی۔ اب وہ اکیلے ہی سامان خرید لاتی تھی۔

رشید نے اسے اپنے واقف کار ڈیلرز سے ملوا کر ساری تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ سب اچھے معقول لوگ تھے۔ اس کے کم عمر یا لڑکی ہونے کا کبھی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ سب اسے پہچاننے لگے تھے اور اس کا مطلوبہ سامان باندھ کر رکشے پہ رکھوا دیتے تھے۔ گھر پہنچ کر رکشے والا ہی اس کا سامان اوپر ممٹی تک چھوڑ آتا تھا۔ اب وہ بڑی کامیابی سے ہر کام خود کر رہی تھی۔ کبھی تھوڑی بہت مشکل پیش آتی تو وہ رشید کو کال کر کے ہی سب معلومات لے لیا کرتی تھی۔

''تم یہ سب کر کے پیسہ جمع کر رہی ہو؟'' ان کے سوال پہ وہ خاموش رہی تھی۔ نہ ہوں نہ ہاں۔

''اور اس پیسے سے تم میڈیکل کی تعلیم حاصل کرو گی۔۔۔؟'' اسے لگا وہ ابھی قہقہے لگا کر اس پہ ہنسیں پڑیں گے۔ یہ سب دیوانے کا خواب ہے اسے تنبیہ کریں گے۔

''میڈیکل کی مہنگی تعلیم کے لئے روپیہ اکٹھا کرنا کیا اتنا آسان ہے۔۔۔؟ اگر اتنا آسان ہے تو لاؤ میں اکٹھا کر لاتا ہوں وہ چندہ جس سے تم ڈاکٹر بن سکو۔'' اس کے کام کرتے مگن سے ہاتھ تھمے۔ وہ جو لاپرواہ بنی اپنا کام کر رہی تھی، مزید لاپرواہ نہ رہ سکی۔ ابا نے بڑی بات کر دی تھی۔ انھیں نہیں کرنا چاہیے تھی۔

''چڑیا چونچ میں پانی بھر بھر کر کسی جگہ پہ اکٹھا کرے تو اس سے گھڑا تو بھر سکتی ہے لیکن دریا نہیں بہا سکتی اور تم دریا بہانا چاہ رہی ہو میری بیٹی۔ یہ سب مت کرو۔۔۔ اس سے وہ نہیں ہو سکتا جو تم حاصل کرنا چاہتی ہو۔'' کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اس پہ ہنس دیتے، جی بھر کر مذاق اڑا لیتے لیکن جاتے ہوئے اس کا شانہ تھپک کر اسے نیک خواہشات کی دعا دے جاتے۔ اتنا کہہ دیتے کہ انھیں اس کی محنت پہ فخر ہے۔۔۔ اس کی ہمت کے وہ قائل ہو گئے ہیں۔۔۔ اس کی بہادری پہ انھیں رشک آ رہا ہے کہ وہ اتنا اونچا سوچ سکتی ہے، اس اونچی سوچ کے لئے اتنی محنت کر سکتی ہے، اتنی طاقت سے حالات کا مقابلہ کر سکتی ہے لیکن انھوں نے کہا بھی تو کیا۔

ماں باپ تو بچوں کی ڈھارس ہوتے ہیں، حوصلہ اور ہمت بنتے ہیں۔ پھر ابا نے ایسے کیوں کیا؟ زندگی کو امید، رنگوں کا نام دینے والے اتنے ناامید اور بے رنگ کیوں ہو گئے تھے کہ اسے ہی بانٹنے، تقسیم کرنے کا کام کر رہے تھے۔ یہ اس کے ابا نہیں تھے۔ شاید ایک تلخ حقیقت نے کہ اب وہ اس گھر کے لئے مزید کچھ نہیں کر سکتے انھیں تلخ بنا دیا تھا۔ لیکن وہ اپنی تلخی اسے تو منتقل نہ کرتے۔

وہ انھیں بتانا چاہتی تھی کہ چڑیا اپنی چونچ میں دن رات پانی بھرے، روزانہ بھرے، کئی ماہ بھرے اور کئی سال بھرے تو دریا نہ ہی سہی کوئی چھوٹا موٹا ندی نالہ تو بہا ہی سکتی ہے۔ پھر ایسی پیاری معصوم چڑیا پہ قدرت بھی کچھ تو ترس کھائے گی۔ کچھ تو اس کا ساتھ دے گی۔ کچھ تو حالات اور سہولیات کو اس کی مدد کے لئے ہموار کر ڈالے گی۔۔۔ اور کچھ نہیں تو اس کے لئے قدرت میں موجود ہر شے دعا گو ہو گی کہ اللہ اسے کامیاب کرے۔ کیا قدرت بھی انسان جیسی بے رحم ہو جائے گی۔ نہیں، یہ بے رحمی کی صف بس انسان تک محدود ہے۔ لیکن وہ کہہ نہیں سکی۔

اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ابا جا چکے تھے۔ اس کی پہاڑ جیسی ہمت جو بڑی دقتوں سے اس نے جمع کی تھی، کو ایک ہی ٹھوکر میں کنکر بنا کر وہ جا چکے تھے۔ اس کی تھوڑی سی بہادری کو کمزوری میں ڈھال کر۔۔۔ عزم کو مٹی کر کے۔۔۔ آس کو یاس میں بدل کر اس کے ابا جا چکے تھے۔ وہ ساری رات روتے ہوئے گزری تھی۔ اس نے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کے غم نے اس کا سارا دن ضائع کر دیا۔ غم

ایسے ہی ذہن اور دل کو ناکارہ بنا ڈالتے ہیں کہ انسان پھر کسی کام کا نہیں رہتا۔

اگلی صبح اپنے ریزہ ریزہ کنکریوں کو یکجا کر کے اس نے خود کو واپس چٹان بنایا تھا کہ کوئی اس کام کے لئے وہاں موجود نہ تھا۔

آہن اور فولاد بنی اپنا کام مکمل کرنے لگی تھی۔ کل سے اسے میڈم شیریں کی اکیڈمی میں دو نئے کورسز شروع کرنا تھے۔ اس سے پہلے وہ اپنے اس آرڈر کو کسی حد تک مکمل کرنا چاہتی تھی۔

''میں بڑی لڑکیوں کی ہینڈ میڈ جیولری کے ساتھ ساتھ بچیوں کی recycling کلاس لینا چاہتی ہوں تاکہ وہ بچپن سے ہی جان سکیں کہ جو بیکار سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے اسے کارآمد کیسے بنایا جا سکتا ہے۔'' زندگی کے قدم قدم ہمیں یہی سیکھنے کی ضرورت ہے پھر چاہے وہ چیزیں ہوں یا لوگ۔۔۔

''لیکن اس کام کے لئے شاید ہی کوئی فیس بھرنے کو تیار ہو۔ ایک ناکارہ چیز پہ محنت کرنے کو کوئی باقاعدہ کیوں سیکھے گا وہ بھی پیسے دے کر۔۔۔'' ایک پہلو یہ بھی تھا جو وہ اسے دکھا رہی تھیں۔ اس قوم کی سوچ، اس قوم کی ذہنیت ۔۔۔

''ہر کام پیسے کے لئے نہیں ہوتا۔ یہ میری ہمیشہ سے خواہش رہی تھی اور اب میں اسے پورا کرنا چاہتی ہوں۔'' ایک ایک گھنٹے کی وہ دو کلاسز لینے لگی تھی لیکن پھر بھی نہیں تھکتی تھی۔ یہ سب ضرورت تو تھی ہی لیکن شوق بھی تھا اور شوق سے کیا کام کبھی تھکاتا نہیں ہے۔

''میں نے ایک دو این جی اوز ڈھونڈی ہیں فاطمہ جو قابل اسٹوڈنٹس کی فیس بھرتی ہیں۔ وہ تمہارا رزلٹ دیکھ کر تمہاری فیس بھی پے کریں گی ۔'' اگلے دن میڈم شیریں اسے آفس میں بلا کر بتا رہی تھیں۔ کچھ تفصیلات بھی اس کے سامنے رکھی تھیں جو اس نے کھول کر نہیں دیکھیں۔ ان کی بات پہ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

''تم جو محنت کر رہی ہو اسے جاری رکھو۔ یہ رقم میڈیکل کی مہنگی کتابیں، نوٹس اور دیگر ضروریات پوری کرنے کے کام آئیں گی۔

فیس این جی اوز بھر دیں گی لیکن اس کے لئے تمہیں ہر سال بہترین رزلٹ لانا ہوگا جو تم لے آؤ

گی اس کا مجھے یقین ہے۔'' اپنے احساسات سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔ اس بات پہ اسے خوش ہونا چاہئے کہ اتنی بڑی مدد اسے ملنے جا رہی تھی یا اداس کہ وہ مکمل طور سے اپنی مدد آپ نہیں کر سکی۔

''ہم اس بارے میں سوچ سکتے ہیں فاطمہ۔ یہ ایک اچھی آپشن ہے جسے اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔'' وہ اس کے بجھے ہوئے چہرے سے یہی نتیجہ اخذ کر سکی تھیں کہ اسے یہ بات بہت پسند نہیں آئی۔ اس نے سر ہلا دیا۔

''پہلے مجھے اپنی قوت آزما لینے دیں۔ میں نہ کر سکی تو سہارا لوں گی میڈیم۔'' میڈیم مسکرا دیں۔ وہ اس کا دل برا کر کے اس کی ہمت توڑنا نہیں چاہتی تھیں۔

مکمل کیے گئے آرڈر کی رقم جلد ہی اسے مل گئی تھی۔ سرمایے کی رقم نکال کر اس نے اپنا منافع گنا تھا۔ ایک ماہ میں وہ چند ہزار ہی سہی لیکن کما چکی تھی۔ اپنی کمائی کا ہاتھ میں آنا ہی الگ بات ہوتی ہے۔ بند سرنگ کے دوسرے دہانے پہ رکھا پتھر اپنی جگہ سے سرک گیا تھا، روشنی کی باریک ہی سہی لیکن لکیر اب اسے نظر آنے لگی تھی۔

فاطمہ کی بہن کی شادی کی تیاریاں شروع تھیں لیکن وہ ان تیاریوں کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے پاس اس سب کے لئے بالکل وقت نہیں تھا۔

''جو آپ کو ٹھیک لگے آپ شادی پہ بنوالیں میرے لئے۔'' امی کو عجلت میں جواب دیتے اس نے بابا کو دیکھا تھا۔ اسے بلی کو اب تھیلے سے باہر نکالنا ہی تھا۔ یہی مناسب وقت تھا۔ مزید تاخیر وہ نہیں کر سکتی تھی۔

''میں اس سال کالج نہیں جوائن کر سکتی۔'' دونوں حیران زیادہ اور پریشان کم ہوئے تھے۔ وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

''ایک سال ضائع کرنے سے میں اپنے خواب اور مقصد کے قریب ہو سکتی ہوں تو مجھے ایسا خسارہ جان سے عزیز ہے۔'' وہ دونوں سناٹے میں آ گئے تھے۔

''اور تمہیں لگتا ہے کہ ایسے چھوٹے موٹے کام کر کے جو تم بچپن سے شوق کی خاطر کرتی آ رہی

ہو، تم اتنا پیسہ اکٹھا کر لوگی کہ میڈیکل جیسی مہنگی تعلیم افورڈ کر سکو گی۔۔۔؟ حماقت، سراسر حماقت۔ اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو یہ کام ہم تمہارے لئے کر لیتے۔" ابا خاموش رہے اور امی نے جی بھر کر غصہ نکالا۔ امی روایتی ماں تھیں، نہ آگے دیکھا نہ پیچھے اور بس بے عزت کر ڈالا۔

"حماقت ہی سہی میں یہ حماقت کرنا چاہتی ہوں۔ بعض حماقتیں وقت کے ساتھ زندگی کے بڑے فیصلے ثابت ہوتی ہیں۔"

رات کمرے میں سب موجود تھے اسے لیکچر دینے اور یہ بتلانے کے لئے کہ وہ اپنی توانائی اور وقت ضائع کر رہی ہے۔ وہ اب کی بار بھی خاموشی سے سنتی رہی۔ کچھ باتوں کے جواب وقت کے سپرد کر دینا دانائی ہوتی ہے کیونکہ وقت کے جواب زیادہ زور آور اور لاجواب ہوتے ہیں۔۔۔ ایسے جواب پھر کوئی سوال، کوئی ابہام اپنے آگے ٹھہرنے نہیں دیتے۔

دنیا عارضی تو اس کی تکلیفیں بھی عارضی ہوئیں۔ دن میں بہت بار وہ یہ سب خود کو سمجھاتی کیونکہ کچھ باتیں ہمیں خود کو خود سمجھانا پڑتی ہیں۔ ہر بار کوئی حوصلہ بڑھانے ہمارے آس پاس نہیں ہوتا۔ ایسے میں ہمیں خود کو خود ہی تھپکی اور میٹھا سادلاسہ دینا پڑتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا اور مخلص ناصح وہ "خود" ہوتا ہے۔

کالج کے ایڈمیشن ہو کر بند بھی ہو گئے لیکن اس نے سب کے سمجھانے کے باوجود ایڈمیشن نہ لیا۔ وہ اپنے فیصلے پہ قائم رہی۔ سب کی باتوں کو سنا ضرور لیکن کیا وہی جو اس نے سوچ رکھا تھا۔ جو وہ دیکھ سکتی تھی وہ کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس کی بڑی بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں خوش تھی کیونکہ اسے بنا کسی محنت اور کوشش کے سب کچھ پلیٹ میں رکھ کر زندگی نے دیا تھا۔ جو بننا چاہا وہ بن گئی، اچھے خاندان میں رشتہ ہو گیا، شادی کے کچھ عرصے بعد ہی وہ مزید تعلیم بھی حاصل کرنے لگ جائے گی یہ بات وہ جانتی تھی۔ اسے اسپیشلسٹ بننے کا شوق تھا اور وہ اس شوق کی ہر ممکن تکمیل کرے گی۔ اس کا اسٹیٹس تبدیل ہوا تھا اور اس کے ساتھ عادات و اطوار بھی۔۔۔ ہر بیٹی کا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ جیسے اس کا تھا، جیسے اس کی بہن کا تھا۔

ہر ماہ اس کے پاس کچھ بڑے اور کچھ چھوٹے آرڈر ضرور ہوتے تھے جنہیں وہ پہلے سے کہیں

زیادہ مہارت سے مکمل کرنے لگ گئی تھی۔ دن بدن کام میں نفاست اور نکھار آتا جا رہا تھا۔ اب وہ کم محنت میں بہتر کام کر کے اپنا وقت بچا لیتی تھی۔۔ بہت زیادہ محنت سے کہیں زیادہ ڈھنگ سے صحیح سمت میں کی گئی محنت زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے۔۔۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ معاوضہ پہلے سے اچھا ملنے لگا تھا۔ اکیڈمی میں تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ جو بچیاں اس سے کورس کر کے جاتیں وہ اپنے مزید جاننے والوں کو بھی اس کے پاس بھیجتیں۔ میڈم چاہتی تھیں کہ وہ ہینڈ میڈ چیزیں بنانے کی بجائے سلائی کا کام شروع کر دے۔ اس میں کم محنت میں وہ بہتر کما سکتی ہے۔ اکیڈمی کو بھی زیادہ فائدہ ہونا تھا۔

"زندگی میں ہر کام ہر کسی کے کرنے کا نہیں ہوتا۔ انسان کی مہارت اور عبوریت ایک خاص شعبے سے وابستہ ہو سکتی ہے، ہر شعبے سے نہیں۔ آپ بہت سے میدان مارنے کی کوشش کریں اور ناکام رہیں اس سے بہتر ہے کہ آپ کسی ایک میدان کے کھلاڑی بن جائیں۔۔۔ سلائی سیکھنے کے لئے پہلے مجھے کسی بڑے ادارے میں کام سیکھنا پڑے گا جس میں کچھ ماہ لگ جائیں گے۔ پھر بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ ماہر بن کر نکلوں گی۔ جس کام میں مجھے مہارت ہے ہی نہیں اس کی مہارت میں کسی دوسرے میں کیسے پیدا کر سکتی ہوں۔ جو کام میں کر رہی ہوں وہ سیکھنے کی مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ میرے خون میں پہلے سے دوڑ رہا ہے۔" اسے یہ آئیڈیا بیکار لگا تھا۔ میڈم نے دوبارہ اسے ایسا کوئی مشورہ نہیں دیا تھا۔

اس ساری محنت اور کام کے دوران بھی وہ ہفتے اور اتوار کو پارک جانا نہیں بھولتی تھی۔۔۔ ہفتے اور اتوار کو اکیڈمی کا آف ہوتا تھا۔ یہی وقت پارک میں گزارتے، لوگوں کو دیکھتے، انھیں جانچتے اسے اچھا لگتا تھا۔ دنیا کی سب سے دلچسپ اور قابلِ مطالعہ شے انسان ہے۔ اسے بھی انسان کا مطالعہ مزہ دیتا تھا۔ پارک میں موجود مختلف چیزیں بیچتے، بچوں سے باتیں کرتے وہ ہر بار ان سے یہی سیکھتی تھی کہ محنت میں کوئی عار نہیں، دکھ نہیں۔۔۔ وہ سب بچے جو اسے ملتے وہ فخر سے سینہ چوڑا کیے، اپنی جگمگ کرتی آنکھوں سے دنیا کو یہ پیغام دیتے تھے کہ ہم اپنا کماتے ہیں، ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ ان کا یہ پیغام اسے اچھا لگتا تھا۔

اس کام سے جڑے اسے چھ ماہ ہو چلے تھے۔ دن رات کا فرق مٹا کر اس نے یہ چھ ماہ گزارے تھے۔ اکیڈمی کے چار گروپس وہ بھگتا چکی تھی۔۔۔ اس کو اکثر کام کی زیادتی سے کمر درد رہنے لگا تھا اور کبھی کبھی وہ سوچتی کہ ابا کی طرح اس کی کمر کا بھی کوئی مہرہ ہل گیا تو۔۔۔؟ اس ''تو'' کا اس کے پاس نہ کوئی جواب تھا نہ ہی حل۔۔۔ اپنے بٹنوں والے صندوق میں دبے پیسے نکال کر وہ دھیان سے گنتی تھی۔ ہر ماہ ان پیسوں میں اچھا اضافہ ہوتا تھا۔ چھ ماہ میں وہ ایک معقول رقم جمع کر چکی تھی۔

''لوگ ایک ماہ میں اس سے کم محنت میں اس سے کہیں زیادہ جمع کر لیتے۔'' شیطان کے حربے صدیوں سے وہی ہیں۔ وسوسے ڈالنا، بددل اور مایوس کرنا۔

''کچھ لوگ اس سے زیادہ محنت کر کے اتنا بھی نہیں کما سکتے۔'' سر پہ چپت لگا کر اس نے خود کو سرزنش کی۔۔۔ اپنی ناصح، اچھی ناصح، فاطمہ ناصح۔

ابھی اسے قریباً چھ ماہ مزید محنت کرنا تھی۔۔۔ جمع شدہ رقم سے بھی زیادہ رقم جمع کرنا تھی۔ اسے اسی شہر کے میڈیکل کالج میں داخلہ چاہیے تھا۔ دوسرے شہر میں کسی بھی میڈیکل میں داخلے کا مطلب ہوسٹل کا اضافی خرچا تھا جو وہ نہیں اٹھا سکتی تھی۔

ابھی ایک سال اسے رقم اکھٹی کرنے کے لیے محنت کرنا تھی۔ اگلے دو سال اسے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے لئے محنت کرنا تھی۔ زندگی اس کے لئے ''محنت'' کا دوسرا نام رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

وہ رات میں کالونی سے ملحقہ مارکیٹ تک ناشتے کے لئے انڈے لینے گیا تھا۔ گاڑی اس نے پارکنگ ایریا میں کھڑی کرتے کسی نمبر پہ میسج کیا تھا اور موبائل گاڑی میں ہی چھوڑ کر وہ نکل آیا۔ اپنے لئے پیزا آرڈر کر کے وہ پے منٹ کرنے کاؤنٹر تک آیا۔ اس وقت مارکیٹ میں معمول کا ہی رش تھا۔ پے منٹ کر کے وہ بیکری سے نکل ہی رہا تھا جب باہر کھڑے گارڈ نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔۔۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کا برگر تھا جو وہ رغبت سے کھا رہا تھا۔ سموئیل نے مسکرا کر اس کا اپنے لئے دروازہ کھولنے پہ شکریہ ادا کیا۔

"دنیا کا ہر وہ محنتی شخص جو ڈھیروں محنت کے عوض ذرا سا کماتا ہے، ہمارے شکریہ کا حقدار ہے۔"

پچھلے سات سالوں میں اس کی زندگی کا معمول بن چکا تھا کہ وہ سڑک پہ ملنے والے ہر کوڑا اچننے والے، مزدور، ریڑھی بان، گارڈ اور اسی قسم کے دوسرے محنت کشوں کو سلام کرتا اور ان کی خدمات کے صلے میں شکریہ ادا کرتا تھا۔

گاڑی کا لاک کھولتے اسے یاد آیا کہ ممی نے کافی کا جار بھی منگوایا تھا جو لینا وہ بھول گیا تھا۔ ہاتھ میں موجود بیگز وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ رکھ کر پھر سے بیکری کی طرف گیا۔ گارڈ نے اسے آتا دیکھ کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ اس نے کافی کا مطلوبہ جار اٹھا کر پے منٹ کی تو اس کی نظر گارڈ پہ پڑی جو اب برگر ختم کرنے کے بعد ڈونٹ کھا رہا تھا۔

"آپ اپنے ایمپلائیز کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ یہ جان کر اچھا لگا۔" والٹ جیب میں رکھتے وہ کہہ رہا تھا۔ کاؤنٹر پہ موجود لڑکے نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"میں باہر کھڑے گارڈ کی بات کر رہا ہوں جو بیکری آئٹمز سے لطف اٹھا رہا ہے۔ ہماری خاموش خدمت کرنے والے کا اتنا حق تو بنتا ہے۔"

"نہیں سر۔ ہمارے ہاں ایسی کوئی پالیسی نہیں ہے۔ وہ تو ایک میڈم روز آتی ہیں۔ اپنے لئے کچھ خریدنے کے ساتھ باہر کھڑے گارڈ کے لئے بھی کچھ خرید لیتی ہیں چاہے کوئی بھی گارڈ ڈیوٹی پہ موجود ہو۔"

"یہیں کالونی سے آتی ہیں۔۔۔؟"

"معلوم نہیں سر۔ دو ہفتے ہو گئے روز ہی آتی ہیں۔ خود کچھ نہ بھی لینا ہو گارڈ کے لئے ضرور لیتی ہیں۔" وہ اپنا شاپنگ بیگ تھام کر شکریہ ادا کرتا باہر نکلا جب گارڈ نے اس کے لئے دروازہ کھولا تھا۔

"سر کیا آپ اس لڑکی کو جانتے ہیں جو آپ کو یہ باکس دے کر گئی ہیں۔۔۔؟" اب وہ گارڈ سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں بیٹا۔۔۔ کچھ دنوں سے جب بھی میری ڈیوٹی ہوتی ہے وہ یہاں آتی ہے۔ آپ ہی کی

طرح شکریہ ادا کرتی ہے اور ڈبہ دے کر چلی جاتی ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ وہی تھی۔ یہ اسی کی ادا تھی اتنا تو وہ اسے پہچانتا تھا۔ لیکن وہ تھی کہاں۔۔؟

گاڑی میں بیٹھ کر اس نے موبائل نکلا جہاں اسکرین پہ ایک پیغام چمک رہا تھا۔

''آخری بار جب میری بات ہوئی تو اس کے پاس موبائل نہیں تھا۔ پھر اس کے گھر کا نمبر بھی بدل گیا۔ اس کے بعد کسی کے پاس بھی اس کا کانٹیکٹ نمبر نہیں رہا۔'' اس نے گہری سانس بھری۔

''کہاں تلاش کروں تمہیں اب۔۔۔؟'' خدا کی اتنی بڑی دنیا پہ چھائے اس وسیع آسمان پہ چمکتے ستاروں کو دیکھتے اس نے سوچا۔ وہ بھی ایک ستارے کی تلاش میں تھا جسے وہ کئی سال پہلے کھو چکا تھا۔ کالج سے وہ کئی بار معلومات نکلوانے کی کوشش کر چکا تھا لیکن ایڈمن سٹاف صاف معذرت کرتا تھا کہ وہ کسی بھی اسٹوڈنٹ کی ذاتی معلومات کسی کو نہیں دے سکتے۔ یہ ان کی پالیسی کے خلاف تھا۔ تمام کلاس فیلوز میں سے کوئی بھی اس سے رابطے میں نہیں تھا۔ زمین تلے جا چھپی تھی یا سیڑھی لگا کر آسمان پہ چڑھ گئی تھی۔ وہ جہاں بھی تھی اس کی حدود سے نکل چکی تھی۔ پھر اچانک اسے کرنل سدھو یاد آ گئے تھے۔۔۔ ان کی ڈاکٹر بہو کا سوچ کر پھر سے اس کی سانس رک سی گئی تھی۔

☆......☆......☆

''وادیِ سوات کا قدیم نام ''اودیانہ'' تھا مطلب گلستان۔۔۔ سکندرِ اعظم کے دور میں یہ ''سواستو'' کے نام سے جانی جاتی تھی جو لفظ ''سویتا'' سے نکلا ہے جس کے معنی سفید یا شفاف پانی کے ہیں۔ بعد میں اس کا نام ''سواد'' اور پھر ''سوات'' پڑ گیا۔'' وہ کھانے کا آرڈر کر کے وہیں ایک بڑے ٹیبل کے گرد کرسیوں کو پھول کی پتیوں کی شکل میں رکھے بیٹھے تھے۔ ہوٹل میں سامان اپنے اپنے مختص کمروں میں رکھ کر، فریش ہو کر وہ اب ایک بجے کھانا کھانے ایک عام سے ہوٹل میں آئے تھے۔ عباد، سیرت اور تحریم گروپ اکھٹا تھا۔ کھانا تیار ہونے میں ابھی وقت تھا سو وہ انھیں سوات کی تاریخ سنانے لگ گیا تھا۔

''اپنی زرخیزی اور حسن کی وجہ سے یہ سرزمین ہمیشہ حملہ آوروں کی دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ مہاتما بدھ کی کئی سرگرمیوں کو اس علاقے سے منسوب کیا گیا ہے۔''

"سکندرِ اعظم کی فتوحات میں سے ایک یہ علاقہ بھی تھا یہ کیسے پتہ چلا۔۔۔؟" سب دلچسپی سے سوات کی تاریخ سن رہے تھے۔ یوں تو تاریخ میں کسی کو دلچسپی نہیں تھی لیکن چونکہ وہ اس علاقے میں گھوم پھر کر سب آنکھوں سے دیکھ رہے تھے سو اس علاقے کی تاریخ انھیں خود بخود کھینچ رہی تھی کہ اسے سنا جائے۔

"منگلور جو اب سوات کا ایک مشہور گاؤں ہے اور منگورہ سے بحرین کی طرف آتے ہوئے سڑک کے دائیں طرف واقع ہے وہاں بہت سے آثارِ قدیمہ میں سکندرِ اعظم کے دور کی نوادرات دریافت ہوئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۳۲۶ قبل مسیح سکندرِ اعظم ہندوستان پر حملے کے لئے افغانستان کی طرف سے اسی علاقے سے ہو کر گیا تھا۔ اس وقت اس علاقے میں بدھ مت عام تھا۔"

"تو اسلام کب پھیلا یہاں۔۔؟" ویٹر سب سے پہلا رائتہ سلاد رکھ کر گیا تو وہ سب سلاد پہ ہی ٹوٹ پڑے۔ بھوک اب برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے دیگر کلاس فیلوز آگے پیچھے کئی ریسٹورنٹس میں دکھائی دے رہے تھے۔

"اسلام تو سلطان محمود غزنوی کے حملے کے بعد ایک افغانستانی سردار پیر خوشحال کی بدولت اس خطے میں داخل ہوا تھا۔" اشتہا انگیز خوشبو نے بھوک کو چمکا دیا تھا۔

"اور والئی سوات، جن کا وہ وائٹ پیلس ہے۔ وہ کون تھے۔۔؟" عتیق کے سوال پہ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھوں کو سر کے پیچھے باندھ کر پر سکون حالت میں بیٹھ گیا۔

"سوات کے علاقے میں ایک ہی کامیاب ترین حکمران گزرا ہے۔۔۔ میاں گل عبدالودود المعروف بادشاہ صاحب جن کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ وہ بانیٔ سوات ہیں جنھوں نے اس ریاست میں عدالتیں قائم کیں، فوج اور پولیس کا انتظام کیا، تجارت کی جانب توجہ دی اور جاہلانہ رسوم کا خاتمہ کیا۔ ہاں ان کے بعد ان کے صاحبزادے جہانزیب والئی سوات بنے مگر ان کی حکومت ویسی نہ تھی جیسی بادشاہ صاحب کی۔"

کھانا آ چکا تھا۔۔۔ بڑی سی کڑھائی میں "چکن کڑاھی" سرو کی گئی۔ خستہ نان، سلاد، رائتہ، کولڈ ڈرنکس۔۔۔ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ سوات کی مٹی میں سوندھی خوشبو، مکینوں کے ہاتھ کی

لذت وہ کبھی نہیں بھولنے والے تھے۔

''چائے نہ ہو جائے اب ۔۔؟'' رؤف نے کھانا ختم ہونے کے بعد سب کی جانب باری باری دیکھا۔

''چائے ہم دریا کے کنارے بیٹھ کر پئیں گے۔'' تحریم نے فرمائش کی۔

''پھر تم لوگ نکلو۔ میں اور عباد بل پے کر کے آتے ہیں۔'' وہ اور عباد کالج سے دوست تھے۔ اس کے بقول وہ میڈیکل میں آیا ہی عباد کی وجہ سے تھا۔

بل پے کرتے ہوئے اس نے وہاں کے ''چھوٹے'' کو ٹپ دینا چاہی تو اس نے لینے سے منع کر دیا۔

''وہ باجی دے گئی ہیں۔'' نو لڑکیوں کے ٹولے میں سے وہ کس کی بات کر رہا تھا بھلا۔ اس نے ایک چمکیلا کاغذ دکھایا جس کی چمکیلی اس کی ڈیزائننگ میں گندھی ہوئی تھی۔ عباد نے کاغذ الٹا پلٹا کر دیکھا ۔اس پہ کوئی عبارت نہیں تھی۔ لیکن ڈیزائننگ بہت کمال کی تھی۔

''وہ اسکارف والی باجی۔'' اسکارف تو نو میں سے چار لڑکیوں کے سروں پہ تھا۔ رؤف ہنس دیا۔ عباد نے کاغذ لڑکے کو واپس کر دیا۔ یہ لڑکے کی عزت نفس کا محافظ تھا جس میں رقم لپیٹ کر لڑکے کو دی گئی تھی۔ عباد کو یہ طریقہ متاثر کر گیا۔

''اچھا تو اب یہ بھی رکھ لے۔'' رؤف نے کچھ چھوٹے نوٹ اس کی طرف بڑھائے، کندھا تھپکا اور آگے بڑھ گئے۔

''اچھا تو والئی سوات کے بعد اس علاقے کا کیا ہوا۔۔؟'' بل دینے کے بعد وہ دونوں کالام روڈ پہ نکل آئے تھے۔ سڑک ڈھلوان تھی میں تھی۔ سو وہ تیزی سے نیچے آ رہے تھے۔

''۱۹۴۷ میں جب پاکستان بنا تھا تو دیگر ریاستوں کی طرح ریاست سوات کا پاکستان سے الحاق کر دیا گیا تھا۔ پھر ۱۹۶۹ میں پاکستان کی بہت سی ریاستوں کی طرح سوات کو ضلع کی حیثیت سے مدغم کیا گیا۔ عوام کا خیال تھا کہ اب شاید مسائل کم ہوں گے مگر کم کیا ہونا تھے مسائل تو اور زیادہ ہی ہوتے

گئے۔" وہ اب دریا کی جانب جاتے چھوٹا سا لکڑی کا پل پار کر رہے تھے جو دونوں جانب سے رسیوں کی مدد سے باندھا گیا تھا اور مقامی لوگ اسے دریا پار کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔

عباد اور رؤف باقی رستے بھی سوات کے انتظامی مسائل پہ بات کرتے رہے تھے۔

"چائے آرڈر کی ہے۔۔۔؟" وہ سب دریا کے کنارے بچھی چارپائیوں پہ بیٹھے تھے۔ پیر دریا کے ٹھنڈے پانی میں تھے۔ یہاں پانی کا بہاؤ کم تھا تو کئی ڈھابے کنارے پہ آباد تھے۔ لوگ دریا میں اترتے، چارپائیوں پہ بیٹھتے فطرت کے حسن کا مزہ لیتے تھے۔

"مری کے مقابلے میں یہاں اشیاء سستی ہیں۔ اتنے سستے کمرے مل گئے ہمیں جو مری میں آف سیزن میں بھی ممکن نہیں۔" سیرت نے بال کھولتے انھیں ہاتھ کی مدد سے ٹھیک کر کے پھر سے باندھ لیا۔

"مری کے لوگوں کو چیزوں کی قیمت اور مارکٹنگ کا اندازہ ہے، یہاں کے لوگوں کو نہیں ہے۔ ابھی تو گرمیاں ہیں، سیزن شروع ہوا ہے۔ سردیوں میں برف باری کی وجہ سے سب جام ہو جاتا ہے۔ مری میں تو سردیوں میں بھی ٹورسٹ آتا رہتا ہے۔ ان کے لئے تو کمائی کے بس یہی چھ ماہ ہیں۔"

"بڑی ہمت ہے ان لوگوں کی جو یہاں رہتے ہیں۔ ہمارے لئے تو حیات ممکن نہیں۔" سائرہ نے سر تک ہاتھ لے جاتے انھیں سلام پیش کیا۔ تبھی رہبر دو لڑکوں کے ساتھ چائے لے آیا تھا۔

"آتے ہوئے جو ہم نے وہ ٹرالی دیکھی تھی نا جس پہ بیٹھ کر لوگ دریا پار کر رہے تھے۔ میں نے اس پہ لازمی بیٹھنا ہے عباد۔" تحریم کو اچانک یاد آیا۔

"وہ خاصی خطرناک ہے۔ تم لوگوں سے نہیں بیٹھا جائے گا۔" رہبر پانی میں ہی کھڑے کھڑے چائے پی رہا تھا۔ پانی تیزی سے بہتے ہوئے پیروں کو یخ ٹھنڈا کر رہا تھا۔ کبھی وہ ایک پاؤں پہ کھڑا ہو جاتا اور کبھی دونوں پہ۔

"ایڈونچر کے لئے یہ محترمہ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔" تحریم سمیت سب تیار تھیں سوائے آئینور کے۔

"آپ نہیں بیٹھیں گی۔۔۔؟" اس کی طرف دیکھ کر رؤف نے پوچھا۔

"انھیں ہائٹ فوبیا ہے۔" جواب عباد نے دیا تھا۔ اس نے سر ہلا دیا کہ اب کوئی مزید اسے

اونچائی والی جگہوں پہ جانے کا نہ کہے۔

"تم لوگ انجوائے کرو۔ میں نماز پڑھ آؤں۔" چائے کا کپ ٹرے میں رکھ کر وہ دریا کے پتھروں پہ پنجوں کے بل بیٹھ کر وضو کرنے بیٹھ گیا۔

"کیا ہو جائے گا اگر سفر میں نماز قضا کر لو گے تو۔ سب انجوائے کر رہے ہیں۔" سائرہ کے ٹوکنے پہ وہ بس مسکرا دیا۔

"یہاں کہاں نماز پڑھو گے۔۔۔؟" ہما نے اردگرد پتھروں پہ نگاہ دوڑائی۔

"اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ کہیں بھی پڑھ لوں گا۔" لڑکے جیب میں موبائل اور والٹ لئے پھرتے تھے اور وہ ایک چھوٹی سی سفری جائے نماز بھی رکھتا تھا۔۔۔ پتھروں پہ بچھائی اور نماز شروع۔

وہ اندر سے متاثر ہو رہی تھی۔ کاش وہ بھی یوں کسی کی باتوں کی پرواہ کیے بنا سرِ عام نماز پڑھ سکتی۔ انسان پہ نماز کے معاملے میں بہت سستی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ بھی ایسی سست تھی۔

سب اپنی گفتگو میں مگن قہقہے لگا رہے تھے اور وہ کن اکھیوں سے عباد کو نماز پڑھتے دیکھ رہی تھی۔ وہ کوئی مذہبی حلیے کا حامل لڑکا نہیں تھا۔۔۔ سادہ سے نقوش، کلین شیو، پینٹ ٹی شرٹ پہنے عام سا لڑکا۔۔۔ پینٹ کے پائنچے فولڈ کیے، سر پہ رومال باندھے وہ اتنا پر سکون سا نماز پڑھ رہا تھا جیسے اس ایک کام کے سوا اسے کوئی کام نہ ہو۔ آنکھوں کی ٹھنڈک شاید ایسی ہی نماز ہوتی ہے۔ اسے رشک آیا۔

"کبھی تم بہت عجیب بی ہیو کرتے ہو عباد۔" سائرہ نے اس کے لوٹنے پہ، دوبارہ سب میں شمولیت پہ آبرو اچکاتے ہوئے دیکھا۔

"اچھا وہ کب۔۔۔؟" وہ یوں مسکرایا کہ جواب تو میں جانتا ہوں لیکن پھر بھی تم بتا دو۔

"ابھی جو تم نے کیا وہ۔۔۔ کیا ہو جاتا اگر دوستوں کی بات سن لیتے۔"

"ضرور سنتا اگر وہ زیادہ اہم ہوتی۔ انسان وہی کرتا ہے جو اسے زیادہ اہم لگتا ہے۔" وہ پینٹ پہ لگی ہلکی پھلکی مٹی کو جھاڑ رہا تھا۔ لیکن انداز ایسا تھا کہ اس نے بالکل برا نہیں منایا تھا۔ وہ ایسی باتوں کا شاید عادی ہو چکا تھا۔

"دیکھو یہ ایک فضول بحث ہے۔ مانا کہ تم بلکہ میں بھی نماز نہیں پڑھتا لیکن جو پڑھ رہا ہے اسے

روکنا نہیں چاہئے۔تم سب سر پہ دوپٹہ نہیں لیتیں، آئینور لیتی ہے لیکن وہ تم سب کو یہ تو نہیں کہتی کہ تم سب بھی دوپٹہ کرو۔۔۔اگر ہم غلط ہیں تو کم از کم اتنا ظرف تو رکھیں کہ یہ مان سکیں کہ ہاں ہم غلط کر رہے ہیں۔الٹا جو ٹھیک کر رہا ہے ہم اسے ہی لتاڑنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" رہبر کے چند جملوں پہ سب خاموش ہو گئے۔وہ بہت منہ پھٹ مشہور تھا۔اس کے بقول وہ صاف گو تھا۔

"اب چلیں یہاں سے۔کچھ اور بھی دیکھنا ہے یا نہیں۔" رؤف نے اٹھتے ہوئے کہا تو سب اپنی جگہ سے اٹھنے لگے۔

"دھیان سے چلنا۔دریا کی مٹی بہت نرم ہوتی ہے۔پاؤں اندر ہی نہ دھنس جائیں کہیں۔" جہاں پتھر نہیں تھے وہ وہاں تاکید کر رہا تھا۔وہی سب کا خیال رکھنے والی، آگے آگے ہونے والی عادت۔

اس رات وہ دیر تک کالام روڈ پہ ہی گھومتے رہے تھے۔لڑکیاں تو یوں شاپنگ کر رہی تھیں جیسے پہلی بار کر رہی ہوں اور یہی آخری بار ہو۔آئینور بس چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔اس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں خریدا تھا۔لڑکیاں شاپنگ کر رہی تھیں اور عباد، رؤف بھاؤ تاؤ کرتے قیمتیں کم کروا رہے تھے۔

"آپ نے کچھ نہیں لیا۔۔۔؟" رؤف نے اس کے خالی ہاتھ اور باقی سب کے شاپرز دیکھتے پوچھا۔

وہ بس ہولے سے مسکرا دی۔جس بات کا وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی اس پہ بس مسکرا کر خاموش ہو جایا کرتی تھی۔

ایک سواتی شال سنٹر پہ رک کر اس نے ایک گہرے کالے رنگ کی سواتی شال خریدی تھی۔تبھی اس نے بیگ کھولا اور اس کے بیگ سے عباد کو وہ دکھائی دیا جس سے اسے اپنے ایک سوال کا جواب مل گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس نے عجلت بھرے انداز سے پانی گلاس میں انڈیلا اور نظریں اسکرین سے ہٹائے بغیر گلاس اذکار کو تھمایا۔اس کی انگلیاں بڑی تیزی سے کی بورڈ پہ چل رہی تھیں۔وہ چند سیکنڈ اپنی ماں کے اس انداز کو خائف ہو کر دیکھتا رہا اور پھر اپنے اور اخبا کے مشترکہ کمرے میں آ گیا جس کا دروازہ اس کے ماں باپ کے کمرے سے گزر کر ایک طرف کو تھا۔وہ کارپٹ پہ کتابیں بکھرائے کل کے ٹیسٹ کی تیاری کر رہا تھا جب اخبا نے اس سے پانی مانگا تھا۔اخبا کو پانی دیتے ہوئے اس نے اس کے جسم کی حدت اور

آنکھوں کی سرخی کو محسوس کیا تھا۔

''ماما اخبا کو ٹمپریچر ہے۔'' وہ بھاگا ہوا ماں کے پاس گیا تھا۔

''کیا ہوا میری بیٹی کو۔۔۔؟'' وہ فوراً اپنا کام چھوڑ کر اخبا کی طرف بھاگی تھیں۔اس کے ہاتھ پاؤں، ماتھا چھو کر دیکھا تھا۔وہ واقعی بخار میں پھنک رہی تھی۔

''مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا زکی۔۔؟''

''مجھے پہلے پتا ہی نہیں تھا۔میں تو اپنا ٹیسٹ یاد کر رہا تھا اور یہ سو رہی تھی۔ابھی اٹھی ہے تو پانی دیتے ہوئے میں نے دیکھا۔'' اپنی صفائی پیش کرتے اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''کل میری presentation ہے۔اب میں وہ دیکھوں یا اسے۔۔؟'' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے وہ اپنے کمرے کی جانب گئی۔اپنے کمرے کی الماری سے دوائیوں کا ڈبہ نکالا اور اس میں سے سیرپ نکال کر دو چمچ بھر کے اسے پلائے۔ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اس کے بازو اور ماتھے پہ رکھیں۔

''مجھے سائنس کی اسائنمنٹ سمجھ نہیں آ رہی ماما۔'' کارپٹ پہ الٹا لیٹے اس نے معصومیت سے اپنی ماں کو اپنی پریشانی بتائی۔

''Zaki ! will you please shut up...?'' وہ سخت جھنجھلاہٹ کا شکار تھی۔

''کل میرا ٹیسٹ ہے ماما۔'' وہ حد درجہ بے چارگی سے ماں کو دیکھتے کہہ رہا تھا۔اس میں اس کا کہاں قصور بنتا تھا کہ اسے ٹیسٹ میں شامل کورس سمجھ نہیں آ رہا تھا یا اس کی ماں کی کل ضروری presentation تھی یا اب اخبا کو بخار ہو رہا تھا۔۔۔ لیکن ماما کو کون سمجھاتا جو سارا غصہ اس پہ اتار دیتی تھیں۔

''تو دفع ہو اور اپنے باپ کو فون کر دو نا کہ جلدی گھر آئے۔ماں کو تم لوگوں نے نوکرانی سمجھ رکھا ہے۔تمہارے باپ کو تو جیسے ہوش ہی نہیں کہ گھر بار کی بھی کوئی ذمہ داری ہوتی ہے۔وہ جاب کرتا ہے نا تو میں بھی جاب کرتی ہوں۔۔۔وہ کما کر احسان نہیں کرتا۔سبھی باپ کماتے ہیں۔لیکن سبھی مائیں نہیں کماتیں اس لئے یہ میرا احسان ہے کہ میں کما بھی رہی ہوں اور تم لوگوں کو بھی دیکھتی ہوں۔۔۔ جاؤ جا کر اپنے باپ کے منہ لگو، میرا دماغ مت کھاؤ۔۔'' ہذیانی انداز سے چلاتے اس نے اردگرد پڑی چیزوں کو اٹاخ پٹاخ کرتے واپس کمرے کا رخ کیا۔اذکار ایسے میں بالکل خاموش ہو گیا تھا۔

یہ پہلی دفع نہیں تھا کہ وہ یوں چلائی تھیں۔ایسے ہسٹریائی دورے اس کی ماں کو پڑتے رہتے تھے۔ایسے میں وہ بالکل خاموش ہو جاتا تھا۔وہ اس لئے بھی خاموش ہو جاتا تھا کہ اس کی ماں مزید مت چلائے۔وہ اس سے زیادہ خود کے لئے ڈانٹ اور اپنے باپ کے لئے بے عزتی نہیں سہہ سکتا تھا۔لیکن اس کا خاموش ہو جانا بھی اس کی ماں کو خاموش نہیں کرا سکتا تھا۔اسے جو بولنا ہوتا تھا وہ بول کر دم لیتی تھی۔۔۔ مغلظات کا ایک طوفان۔۔۔ اس کے باپ اور اس کے خاندان کی شان میں ہرزہ سرائی۔۔۔ اپنی نادیدہ مظلومیت کے رونے۔۔۔

وہ بچپن سے ان کے درمیان اسی قسم کے جھگڑے ہوتے دیکھ رہا تھا۔اس کی موجودگی میں اس کا باپ لب بھینچ کر ضبط کی کوشش کرتا، ممکن حد تک ہونے والی لڑائی کو ختم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔لیکن اس کی ماں کو کوئی چپ نہیں کرا سکتا تھا۔وہ نہ صرف چلاتی تھیں بلکہ کوسنے اور گالم گلوچ پہ بھی اتر آتی تھیں۔پرکا کو ابنانا ان کی عادت بن چکی تھی۔نتیجے میں اس کا باپ اسے گود میں لئے کمرے سے نکل جایا کرتا تھا۔وہ دونوں کیوں لڑتے تھے اسے وجہ سمجھ نہیں آتی تھی۔بچپن میں وہ ڈر سہم کر رو پڑتا تھا۔اپنے غصے اور ناپسندیدگی کو بھی وہ رو کر آنسوؤں کی صورت باہر نکالتا تھا۔پھر اس نے اپنے اندر اٹھتے وبال اور غصے کو خاموش رہ کر پینا شروع کر دیا۔اسے لگتا تھا کہ اب وہ ڈھیٹ ہو چکا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔۔۔۔ نرم اور حساس دل زمانے کی کتنی ہی سختی سہہ لیں وہ کبھی پتھر نہیں بن سکتے۔۔۔ ان کی حساسیت کم ہو سکتی ہے، مٹ نہیں سکتی۔اور وہ ایک بے حد حساس بچہ تھا۔کچھ وہ فطری حساس تھا اور کچھ ماں باپ کے جھگڑوں نے اس کی حساسیت میں اضافہ کیا تھا۔

جوں جوں وہ بڑا ہو رہا تھا اسے ان کے جھگڑوں کی نوعیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔۔۔ اس کی ماں میں قوتِ برداشت صفر تھی۔وہ معمولی معمولی باتوں پہ بھی طعنے تشنوں پہ آجاتی تھی۔اس سے کم میں وہ کم ہی بات کرتی پائی جاتی تھی۔۔۔ وہ بداخلاق بھی تھی اور بدلحاظ بھی۔اپنے کئی دوستوں کی ماؤں سے وہ ملا تھا۔کوئی بھی ویسی نہیں لگی تھی جیسے اس کی ماں تھی۔وہ ماں کی نسبت باپ سے زیادہ قریب تھا۔حتیٰ کہ وہ سوتا بھی انھی کے پاس تھا۔اسے لگتا تھا کہ پاپا اکثر حق پہ ہونے کے باوجود صرف ان دونوں کی خاطر

خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ کام کبھی اس کی ماں نے نہیں کیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ پاپا ماما کی نسبت ان سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ ہر وہ کام جو کسی بھی بچے کے لئے اس کی ماں کرتی ہے، اس کا باپ کیا کرتا تھا۔۔۔ اس کی ماں کو تو بس خود سے محبت تھی یا اپنے پروفیشن سے۔۔۔ شوہر، بچے، گھر۔۔۔ یہ اس عورت کی ترجیحات میں کبھی شامل نہیں رہا تھا۔ دن بدن اسے لگتا تھا کہ وہ ماں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

ابھی بھی ماں کے اس طرح چلانے پہ اس نے اپنی کتابیں سمیٹیں اور کمرے سے نکل کر ٹیرس پہ چلا گیا۔ ٹیرس پہ نکل کر اس نے کتابیں ایک طرف ڈال دیں اور گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔

"یقیناً میں ماما کا بیٹا نہیں ہوں۔ انھوں نے مجھے گود لیا ہے۔" ایک نیا خیال اس کے ذہن پہ ابھرا تھا۔

❁ ❁

ناول سپاس گزار کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 4

وقت کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی دوستی گہری ہوتی گئی تھی ۔ فاطمہ کے ساتھ رہ کر وہ سیکھ گیا تھا کہ اگر اسے وقت سے چھٹی چاہئے تو اسے جلدی جلدی اپنا کام ختم کرنا ہوگا۔ پھر وہ گھر جا سکے گا اور اپنی مرضی سے جتنا چاہے کھیل سکے گا۔

پہلے دن کے اور بعد کے ہمدان میں بہت فرق آچکا تھا۔

''شروع میں تم اتنے عجیب سے حلیے میں کیوں آتے تھے۔۔۔؟''

''وہ تو آپ کو ڈرانے اور رعب ڈالنے کے لئے۔۔۔میں اپنے ٹیوٹرز کو اسی طرح سے بھگاتا تھا ۔بہت ساراستا کر اور ڈھیروں تپا کر۔''

''تمہاری فیشن سینس بہت عجیب ہے۔''

''آپ اسے یونیک بھی کہہ سکتی ہیں۔۔۔ایسا فیشن جو کبھی کسی نے کیا نہ ہو۔۔۔مطلب میری عمر کے کسی بچے نے تو بالکل نہ کیا ہو۔۔۔'' وہ اس کی سوچ سے بڑھ کر ذہین تھا۔ ہمدان چھوٹی چھوٹی باتوں کو نہ صرف نوٹ کرتا بلکہ اس سے سوال بھی کرتا تھا۔

''آپ پڑھتی نہیں ہیں۔۔۔؟''

''پڑھوں گی لیکن ابھی مجھے کام کرنا ہے۔''

''آپ یہ کام کیوں کرتی ہیں۔۔؟'' اب وہ اسے کیا اور کیسے سمجھاتی۔

''مجھے ضرورت ہے پیسوں کی۔'' صاف گوئی سے اس نے جواب دیا۔

''آپ کبھی تیار کیوں نہیں ہوتیں۔۔۔؟ اچھے کپڑے، جیولری، میک اپ۔'' وہ سر تا پیر اسے نوٹ کرتا تھا۔

''میرے پاس یہ سب نہیں ہے اور ہو بھی تو وقت نہیں ہے۔''

''تو پیسے کیوں چاہیں آپ کو۔۔؟ میری ممی کو تو بابا سے پیسے یہی سب کرنے کے لئے چاہیے ہوتے ہیں اور میری تائی امی کو بھی۔ آپی راحمہ بھی تایا ابو سے شاپنگ کے لئے پیسے مانگتی ہیں۔ بھلا لڑکیوں کو شاپنگ کے علاوہ پیسوں کا کیا کرنا ہوتا ہے۔'' وہ مسکرا دی۔

کل تک وہ بھی باپ سے اسی لئے پیسے مانگتی تھی۔ عورت عموماً اسی لئے پیسے چاہتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکے جس میں سرفہرست کپڑے جوتے ہی آتے ہیں۔ کبھی اسے بھی بہت شوق تھا ۔اب لگتا تھا فالتو کا شوق تھا، پیسے کا ضیاع تھا، اچھا ہوا وقت سے چھوٹ گیا۔۔۔ وہ اس سب سے نکل کر بہت آگے جا چکی تھی۔

ہمدان اسے بہت مزے کے قصے سناتا تھا جو سب کے سب اس کی شرارتوں سے بھرے ہوتے تھے۔۔۔ کام کے دوران وہ اب ہنستی رہتی تھی۔ ہمدان کبھی کبھار اسے اتنا ہنساتا کہ وہ پھٹنے کے قریب ہو جاتی۔ اتنے عرصے مسلسل کام کرتے ہوئے کسی تازہ جھونکے کی ضرورت تھی، ہم سب کو ہی ہوتی ہے۔ ۔۔ ہمدان اس کے لئے ایسا ہی تازہ جھونکا ثابت ہوا تھا جس کا ساتھ اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ اس کا پہلا ننھا منا سا دوست تھا۔ جان سے عزیز، دل کے قریب، بہت ہی پیارا۔۔۔

آٹھ ماہ میں اس نے پہلی بار اپنے گھر والوں سے ان کے رویے کا شکوہ کیا۔ نہیں کرنا چاہیے تھا اس کا احساس اسے بعد میں بہت شدت سے ہوا تھا۔۔۔ کاش کہ وہ اس دن بھی ہمیشہ کی طرح خاموش رہتی جیسے وہ وہاں ہے ہی نہیں۔ کم از کم لہجوں کی چبھن سے تو بچی رہتی جو بہت درد دیتی ہے۔

عموماً وہ کھانا دیر سے اور اکیلے ہی کھاتی تھی۔ کھانے پہ اس کا انتظار کرنا سب چھوڑ چکے تھے۔ حتیٰ کہ اسے بلانے کا بھی اب کوئی تردد نہیں کرتا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر جب وہ نیچے آتی تو سب کھانا کھا چکے ہوتے۔ اس دن وہ جلدی کام بنٹا کر نیچے آگئی۔ دسترخوان چنا جا رہا تھا۔ ایک عرصے کے بعد وہ اس روز سب کے درمیان تھی، سب کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ کھانے کے دوران ہی امی نے کسی بات کے دوران بابا سے ذکر کیا۔

''رامین کے سسرال فون بھی کرنا ہے۔نکاح کی تاریخ بس فائنل کر دیں۔''

اس نے اچھنبے سے امی، بابا اور پھر رامین کو دیکھا۔کسی نے بھی اس کی حیرت کو حیرت سے تو کیا دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

''آپی کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔۔۔؟''اب سب نے اسے ایسے دیکھا جیسے وہ ابھی جیل سے چھوٹ کر آئی ہو اور اب پوچھ رہی ہو کہ اتنے برس جب وہ جیل کاٹ رہی تھی تو پیچھے کیا کیا ہو گیا۔۔۔؟

''تم گھر میں یا کسی بات میں دلچسپی لو تو تمہیں کوئی کچھ بتائے نا۔'' باجی کی طرح، آپی بھی طنز کرنا سیکھ گئی تھی۔وہ جو پہلے تھوڑی بہت اس کی پرواہ کر لیتی تھی، اب باجی جیسی بالکل لاپرواہ لگ رہی تھی۔

''لیکن اس گھر کا حصہ تو ہوں، فرد ہوں۔رشتہ آیا، اٹس او کے فائن۔۔۔مجھے نہیں بتایا گیا۔لیکن طے کرتے ہوئے تو بتا سکتے تھے۔چلیں وہ بھی نہیں بتایا۔۔۔اب نکاح کی تاریخ طے ہونے جا رہی ہے تو بھی۔۔۔مطلب اگر میں کھانے پہ نہ آتی تو وہ بھی مجھے نہ بتایا جاتا۔میں پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے اس خاندان کا فرد مانا بھی جاتا ہے یا اس سے بھی باہر لا کھڑا کیا ہے۔۔۔؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گئی تھی۔اسے دکھ ہوا تھا، تکلیف ہوئی تھی۔اجنبیوں کی باتیں بھی قابل برداشت ہوتی ہیں اور اعمال بھی۔فرق تو اپنوں کے رویوں سے پڑتا ہے۔

''تم اس دنیا میں رہتی ہو جو تمہاری خود ساختہ ہے۔ایک طرف تم جا کھڑی ہوئی ہو، ہم نے نہ تمہیں کہیں کھڑا کیا ہے، نہ کہیں سے نکالا ہے۔یہ فضول اور نکمے شوق تم نے خود پالے ہیں اور اب چڑھائی ہم پہ کی جا رہی ہے۔گھر کا فرد تم نے خود بن کر دکھایا ہے کیا جو ہم تمہیں سمجھیں۔ہم تمہیں وہی سمجھتے ہیں جو تم خود بن گئی ہو۔''امی کے الفاظ کسی تیزاب کی طرح اس کا چہرہ جھلسا گئے تھے۔

''وہ دنیا اور اس کا کام میری مجبوری ہے۔۔۔پاگلوں کی طرح محنت کرنا کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا۔سب کی طرح میں بھی آرام چاہتی ہوں، فراغت چاہتی ہوں۔۔۔گھومنا پھرنا، عیش کرنا کسے برا لگتا ہے۔مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔لیکن اگر میں یہ سب کروں گی تو وہ کیسے کروں گی جو میں کرنا چاہتی ہوں۔''

''تو کس نے کہا ہے یہ سب کرو۔۔۔؟ہم نے تو مجبور نہیں کیا نا۔یہ پاگل پن کا رستہ تمہارا اپنا چنا

ہوا ہے۔ دنیا میں ہزار بچے ہیں جو ڈاکٹر نہیں بن سکتے تو کیا وہ کچھ نہیں بن سکتے۔۔۔؟ وہ تو ایسے جنونی نہیں ہو جاتے، اپنا رستہ بدل لیتے ہیں، ایک در بند ملتا ہے تو دوسرے کو چن لیتے ہیں لیکن تم ہو کہ۔۔۔ دنیا ڈاکٹر بننے اور نہ بننے پہ ہی ختم نہیں ہو جاتی۔۔'' امی بہت تلخی سے کہہ رہی تھیں۔ یہ سب نا قابل قبول تھا۔

''لوگوں کے خواب ہوتے ہیں، کئی سو، کئی ہزار اور وہ انھیں پورا کرتے ہیں۔ میرا ایک خواب ہے جو جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے اور سوتی سے بھی۔ میں اس کی تکمیل کے لئے آخری حد تک جاؤں گی۔ اگر یہ جنون ہے تو ٹھیک ہے کہ میں مجنوں ہوں۔''

وہ انھیں جتانا نہیں چاہتی کہ جو سب وہ کر رہی ہے، سب کے لئے وہی سب ان کے ماں باپ کرتے ہیں۔ لیکن وہ ان چند ایک میں سے تھی جسے اپنے پیروں کی زمین کے لئے خود جدوجہد کرنا تھی۔ سر پہ آسمان تنا رہے، اس کے لئے وہ خود ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں۔ وہ باجی کی طرح خوش قسمت نہیں تھی جسے زندگی نے سب کچھ ایک قیمتی خوان میں سجا کر پیش کیا تھا۔ اسے یہ خوان خود اپنے لئے سجانا تھا۔

''لوگوں کی اولاد اہل نہیں ہوتی تو بھی کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ آپ کی اولاد اہل ہے تو بھی کیا جھجکی، ڈری کھڑی رہے۔۔۔؟'' بابا اب کھانا نہیں کھا رہے تھے۔ وہ خاموش ہو گئے تھے۔ رامین ڈھیٹ بنی کھا رہی تھی جیسے اس سب بکواس سے جو وہ کر رہی ہے اسے رتی بھر فرق نہ پڑتا ہو۔ امی غصے سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ انھیں وہ پہلے سے کہیں زیادہ بدتمیز لگی تھی۔

''بس ایک بات مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میری کوشش اور لگن کو دیکھ کر میرے والدین مجھ پہ مان کرنے کی بجائے مجھ پہ طعنہ زنی کیوں کرتے ہیں۔۔۔؟ میرے بہن بھائی مجھے سپورٹ کرنے کی بجائے مجھے منہ کے بل گرانے کے ہی درپے کیوں ہیں۔۔۔؟ ہو سکتا ہے میں ہار جاؤں، کامیاب نہ ہو سکوں۔۔۔ وہ سب بعد کی بات ہے۔ لیکن جتنا میں کر رہی ہوں اس پہ میری کمر پہ تھپکی کیوں نہیں دی جا رہی۔۔۔؟ اس معاشرے میں محنت کرنے والے کسان، نائی، موچی، درزی، ترکھان کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ ان کے پاس ڈگریوں کے ڈھیر نہیں ہوتے۔۔۔۔ ان کی کمائی چند ہزار ہوتی ہے یا چند سو، لیکن ان کے ہنر مند ہاتھوں پہ کسی کی نظر نہیں جاتی۔۔۔۔ مجھے فخر ہے خود پہ کہ میں ان مزدوروں

میں ہوں جو معمار ہیں۔ ہاتھ ہلا کر کماتے ہیں، ہاتھ پھیلا کر مانگتے نہیں ہیں۔'' وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کمرے میں آ کر باتھ میں گھس کر کتنی دیر روتی رہی تھی۔ دل اتنا وسیع نہیں ہوتا کہ سب کچھ سمو لے۔۔۔ کبھی نہ کبھی غبار نکلتا ہی ہے۔۔۔ آنسوؤں کی صورت، زبان کی صورت۔۔۔ کچھ غبار زبان سے اتر گیا تھا، باقی آنسوؤں سے وہ نکال رہی تھی۔

وہ اس لیے ان سب کی نفرین سہہ رہی تھی کیونکہ وہ چند روپے کی چیزیں بنا رہی تھی۔۔۔ بھلا ایسی اولاد پہ کون فخر کرتا ہے۔۔۔ کبھی کسی نے سینہ چوڑا کر کے کہا کہ اسے اپنے ریڑھی لگانے والے بیٹے پہ فخر ہے۔۔۔ کسی نے اپنے چرواہے بچے کا شانہ تھپکا۔۔۔ بڑھئی کا باپ کبھی اس کے گلے میں ہار پہناتا ہے کیا۔۔۔؟ کون ہے جو اپنی بیٹی کا ہاتھ ہنر مند کے ہاتھ میں دے گا، سب ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، پروفیسر داماد چاہتے ہیں۔ پیغمبروں کے پیشوں سے لوگ حقار کھاتے تھے۔۔۔ محنت ہمارے معاشرے میں قابل فخر نہیں جانی جاتی۔ قابلیت کا الگ کھاتا ہے اور مشقت کا الگ۔۔۔ نہ دونوں ترازو ایک سے ہو سکتے ہیں نہ ان کے لئے دلوں میں عزت۔

رامین کے نکاح والے دن اسے احساس ہوا کہ امی ساری مصروفیت میں اسے بھول گئی تھیں۔۔۔ اس ایک فنکشن پہ پہننے کے لئے اس کے لئے کوئی جوڑا نہ بن پایا تھا۔ جب اس نے اپنی میٹرک کی پارٹی کا فراک نکال کر پہنا تو امی چونکیں۔ ایک سوٹ بنانا تھا اس کے لئے بھی لیکن عین وقت پہ ذہن سے نکل گیا تھا۔ انھیں خود پہ افسوس ہوا لیکن اس کا اظہار کرنے پہ دل راضی نہیں ہوا۔ اس نے بھی دل پہ نہیں لیا۔۔۔ کیا فرق پڑتا تھا جوڑا نیا تھا یا پرانا۔۔۔ اسے رویوں نے اتنا توڑا تھا کہ چیزوں کا بننا ٹوٹنا اب بے معنی تھا۔

رطابہ شہزادیوں سی آن بان لئے بے حد مہنگا سوٹ، بھاری زیور پہنے، پارلر سے تیار ہو کر سارے ماحول پہ چھائی ہوئی تھی۔۔۔ وہ بڑے گھر کی بہو تھی، افورڈ کر سکتی تھی۔ امی فخر سے اسے سب سے ملوا رہی تھیں۔ ان کی اس بیٹی کے پاس ایسا سب کچھ تھا کہ وہ سب کے درمیان قابلِ فخر انداز میں سب سے متعارف کروائی جاتی۔

☆......☆......☆

اگلی شام وہ اسپتال سے جلدی فارغ ہو گیا تھا۔ ابھی عصر کی آذان بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ کالونی میں داخل ہو رہا تھا۔ گاڑی اپنی لین سے باہر پارک کر کے وہ پارک کی دوسری سمت والی لین کی جانب آیا تھا۔ وہاں ہر گھر کے باہر نیم پلیٹ اور ہاؤس نمبر درج تھا لیکن ان میں سے کسی پہ بھی کرنل سدھو کا نام نہیں لکھا تھا۔ بابا جی جس پیلی کوٹھی کے باہر بیٹھتے تھے اس کے باہر بس "سکون کا مسکن" لکھا تھا۔

اپنی ذہن سازی کر کے اس نے گھر کی بیل بجادی۔ دور اندر کہیں بیل بجنے کی آواز سنائی دی تھی۔

"کون ۔۔۔؟" گیٹ کے اندر سے کسی بچی کی آواز آئی تھی۔ وہ وہیں اندر قریب میں ہی کھیل رہی تھی تبھی اتنی جلدی گیٹ کے پاس آگئی تھی۔ غالباً وہ وہی بچی تھی جسے اس نے ایک بار کھیلتے دیکھا تھا اور ابا نے بتایا تھا کہ وہ کرنل سدھو کی پوتی ہے۔

"ہیلو لٹل گرل! مجھے آپ کے گرینڈ پا سے ملنا ہے۔" گیٹ کی درز سے اسے چھوٹی بچی جھانکتی دکھائی دی۔

"یو مین ۔۔۔ کرنل پاپا۔" وہ شاید دادا کو اسی نام سے پکارتی تھی۔ اس نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے "جی" کہا۔

"وہ گھر پہ نہیں ہیں۔" اسی درز سے جھانکتے اس نے جواب دیا۔

"یور گڈ نیم پلیز ۔۔۔؟" وہ کچھ بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس سے کام کی بات اگلوا سکے۔ بچے گھر کے بھیدی ہوتے ہیں۔ ان سے دوستی کر کے انسان بہت کچھ جان سکتا ہے۔

"آپ کیا کریں گے ۔۔۔؟" اس نے بھی کھٹاک سے سوال کیا۔ سموئیل گڑبڑا گیا تھا۔ اتنا بھی آسان نہیں تھا اس سے راز نکلوانا جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ وہ بچی تھی، چھوٹی تھی لیکن پٹاخہ تھی ۔۔۔

"یونہی ۔۔ آپ کیوٹ ہو نا اس لئے۔"

"آپ نے مجھے کہاں دیکھا ۔۔؟" اب تو اسے لگا وہ اس سے کیا نکلوائے گا، وہی اس سے ہر اگلا پچھلا اگلوا کر رہے گی۔

"میں نے آپ کے گرینڈ فادر کے فیس بک پہ آپ کی پکچر دیکھی تھی۔" اس وقت یہی جھوٹ

اس کے کام آسکتا تھا۔

"تو نام کیوں نہیں دیکھا۔" بڑی پکی تھی۔

"نام بھول گیا۔۔ یاد کروادیں۔" اب کی بار وہ مسکرادیا۔

"کرنل پاپا کے دوست اتنے بھلکڑ کیسے ہو گئے۔۔۔؟"

"بس میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

"لیکن آپ تو ینگ ہیں۔ کرنل پاپا کے دوست اتنے ینگ کیسے ہو گئے۔۔۔؟"

"دوست ینگ اور اولڈ دونوں ہو سکتے ہیں۔ کیا میں جان سکتا ہوں کہ کرنل صاحب کی اتنی انٹیلیجنٹ پوتی کا نام کیا ہے۔" تعریف پہ وہ مسکرائی تھی۔ اسی لئے جلدی سے اگلا اعتراض، اگلا سوال کئے بنا اس نے نام بتادیا۔

"ازما۔"

"ازما کیا آپ گیٹ کھولیں گی۔۔۔؟"

"وائے۔۔۔؟ جب کرنل پاپا گھر پہ ہیں نہیں تو آپ نے آکر کیا کرنا ہے۔۔؟"

"یہاں کھڑا رہنا برا لگ رہا ہے۔" وہ یکدم بیچارہ سا بن گیا۔ اخبا کو بھی جیسے اس کی بیچارگی پہ رحم آ گیا تو اس نے کھٹ سے گیٹ کھول دیا۔ اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے گیٹ کھول دے گی۔

سفید ٹی شرٹ اور بلیو نیکر میں ملبوس، چھوٹی چھوٹی پونیاں بنائے وہ پانچ برس کی بچی اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتی پوسٹ مارٹم کر رہی تھی۔

"جی فرمائیں۔۔۔" کمر پہ ہاتھ رکھے وہ اسے دیکھتے ہوئے دادی اماں لگ رہی تھی۔

سموئیل مسکرانے پہ مجبور ہو گیا۔ وہ کیوٹ تھی اور اس کو یہ حرکت سوٹ کر رہی تھی۔

"آپ کے گھر پہ کوئی نہیں ہے کیا۔۔۔؟" اس نے ازما کے پیچھے اندر تک نظر دوڑائی جہاں گیراج میں کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی۔ شاید وہ گھر پہ اکیلی تھی۔ یا گھر کے نوکروں کے ساتھ تھی۔

''نہیں۔'' اس کے منہ سے پھسلا۔ پھر اپنے سر پہ ہاتھ مار کر وہ اپنی کم عقلی پہ جیسے خود کو کوستے ہوئے کہنے لگی۔

''مجھے آپ کو یہ نہیں بتانا چاہئے تھا۔ کیا پتا آپ مجھے پکڑ کر لے جائیں اور پھر پاپا کو کال کر کے بتائیں کہ آپ نے مجھے اغواء کر لیا۔'' اس سوچ کے ساتھ ہی اس نے جھرجھری لی اور وہ جلدی سے اندر ہوتے گیٹ بند کرنے لگی تو سموئیل نے آگے بڑھ کر اپنی ٹانگ اڑا لی۔ وہ اس حرکت کی توقع نہیں کر رہی تھی اسی لئے گبھرا گئی۔ جو بھی تھا، وہ تھی تو بچی ہی نا۔

''میں آپ کی فیملی کو جانتا ہوں ازما۔ میں وہاں سامنے رہتا ہوں۔ میرے ڈیڈ بھی کرنل ہیں۔ کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ گھر پہ کوئی کیوں نہیں ہے۔ سب کہاں چلے گئے؟'' اب کے وہ نرم ہوا تھا کہ اس کا مقصد اسے ڈرانا نہیں تھا۔ اس سے کوئی بات پوچھنے کے لئے اسے نرمی دکھانا تھی، اس سے دوستی کرنا تھی۔

''میرے بھائی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ سب ہاسپٹل گئے ہوئے ہیں۔''

''وہ آپ سے بڑا ہے۔۔۔؟'' ازما نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وہ دس سال کا ہے۔'' سموئیل کو لگا اسے کسی نے زندگی دے دی ہو جیسے۔ دس سال قبل وہ اس کے ساتھ تھی۔ تو ازما کی ماں، کرنل سدھو کی بہو وہ نہیں تھی یہ پکا تھا۔ جو وہ جاننا چاہتا تھا جان چکا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جس لڑکے کو وہ اپنا بھائی بتا رہی تھی وہ تو اس کا کزن تھا، بھائی نہیں۔

اب اسے واپس لوٹ جانا چاہیے تھا۔ یونہی دل کیا جاتے جاتے تھوڑا سا اس ''ہٹلر کی نانی'' کو تپا کر جائے۔ اسی سوچ کے ساتھ وہ مسکرا دیا۔

''آپ گھر میں اکیلی ہو اور مجھے جانتی بھی نہیں ہو۔ گیٹ آپ نے یونہی کھول دیا ہے۔ اگر میں آپ کو اٹھا کر لے گیا اور پھر پاپا کو کال کی کہ اخبا میرے پاس ہے، دو کروڑ دیں اور اسے لے جائیں تو۔۔۔؟'' بڑے خبیث سے انداز میں وہ مسکرایا۔ شاید وہ ڈر گئی تبھی روانکھی سی ہو گئی۔

''میں آنٹی کو بلا کر لاتی ہوں پھر وہ بتاتی ہیں آپ کو۔'' جلدی سے اندر کی طرف دوڑ لگا کر وہ چلی گئی۔

''مذاق مہنگا بھی پڑ سکتا ہے بیٹا۔۔۔نکل جا اب۔'' پھرتی سے وہ پلٹ گیا اور تیز تیز ڈگ بھرتا ان کی لین سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ آنٹی کا ہاتھ تھامے گیٹ تک آئی تھی۔

''کہاں گئے وہ انکل۔۔۔یہیں تو تھے۔'' باہر کوئی نہیں تھا۔

''آپ کو منع کیا ہے نا گیٹ نہیں کھولتے ایسے۔اب چلو اندر۔'' اس نے ازما کو اندر کرتے گیٹ سے باہر جھانکا۔لین خالی تھی۔پارک کی طرف اسے ایک ہیولا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔اسے گمان ہوا وہ اسے پہلے مل چکی ہے پھر سر جھٹک کر گیٹ بند کر دیا۔

☆......☆......☆

وہ اور اخبا کافی عرصے بعد ماما کے ساتھ نانو کے گھر رہنے آئے تھے۔پاپا کو آفس کا کوئی ضروری کام تھا جس کی وجہ سے وہ ان کے ساتھ نہیں آسکے تھے۔پاپا کو چھوڑ کر ماما کے ساتھ جانے کا اس کا بالکل بھی دل نہیں کر رہا تھا مگر ماما اسے زبردستی لے کر جا رہی تھیں۔ماما کہتی تھیں کہ بچے وہیں رہتے ہیں جہاں ان کی ماما رہتی ہیں۔اخبا تو سر ہلاتے فوراً مان جاتی تھی کیونکہ وہ ابھی کافی چھوٹی تھی لیکن وہ ماں سے اب بحث کرنے لگ گیا تھا۔اس نے پاپا سے بھی یہی کہا تھا۔

''بڑے ہمیشہ وہی کام کرتے ہیں جو ان کا دل چاہتا ہے تو بچے وہ کیوں نہیں کر سکتے جو ان کا دل چاہے۔زبردستی انھی کے ساتھ کیوں کی جاتی ہے۔۔۔؟ کیونکہ وہ چھوٹے اور کمزور ہوتے ہیں، کچھ کہہ نہیں سکتے۔'' پاپا کو لگتا تھا کہ وہ اپنی عمر سے پہلے ہی میچور ہو چکا ہے۔اپنے ہم عمر بچوں کی نسبت وہ خاصی پختہ گفتگو کرنے لگ گیا تھا۔شاید ان میاں بیوی کے آپس کے اختلافات نے اسے وقت سے پہلے بڑا کر دیا تھا جس کا انھیں افسوس تھا۔تبھی انھوں نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔

''آپ کو ماما کے ساتھ ان کی سپورٹ کے لئے جانا ہے۔جب بیٹے بڑے ہو جاتے ہیں تو ماما کو سپورٹ کرتے ہیں اور اب آپ بڑے ہو گئے ہو۔۔۔ماما اور بہنا اکیلے سفر نہیں کر سکتیں اس لئے آپ ان کے ساتھ جائیں گے۔'' اس بات سے اسے عجیب سی خوشی ہوئی تھی کہ وہ اب بڑا ہو گیا ہے۔اتنا بڑا

کہ اس کا باپ اسے اس کی ماں اور بہن کی حفاظت کے لئے ساتھ بھیج رہا ہے بالکل ویسے جیسے اس کے دوستوں کے بھائی اپنی ماؤں اور بہنوں کو کہیں لے کر جاتے تھے، ان کے ساتھ رہتے تھے، ان کی حفاظت کرتے تھے۔ یہ احساس ذمہ داری تو اسے عجیب سی خوشی میں مبتلا کر رہا تھا۔ بس مسئلہ وہی تھا کہ وہ باپ کے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔

''میں آفس کا کام ختم کر کے آؤں گا آپ کو لینے۔'' پاپا نے اس کے بال سہلاتے اس کا سر چوما۔

وہ رات میں پاپا کے ساتھ سونے کا عادی تھا۔ اپنے بستر، تکیے اور پاپا کے بنا اسے نیند نہیں آتی تھی۔

''بستر اور تکیے تو بدلتے رہتے ہیں بیٹا۔ ان کی عادت نہیں ڈالنی چاہئے۔''

''پاپا تو نہیں بدلتے نا۔۔۔'' اس کی بات سن کر دانش خاموش ہو گیا۔ کبھی کبھی وہ اپنے چھوٹے سے بیٹے کی بڑی باتوں کے جواب نہیں دے پاتا تھا۔

اس بار وہ کوئی نو دس ماہ بعد نانو کے گھر آیا تھا۔ اس کی ماں اپنی نوکری سے کم ہی وقت نکال پاتی تھی کہ کہیں ادھر ادھر جا سکے اور دوسرے شہر جانا تو قریباً ناممکن تھا۔ یوں بھی انھیں لگتا تھا کہ وہ دنیا کی مصروف ترین بندی ہیں جن کی بدولت آدھی دنیا چل رہی ہے۔ وہ کام نہیں کریں گی تو ایک بڑا سسٹم رک جائے گا۔۔۔ اپنی مصروفیت کا رونا وہ آئے دن کسی نہ کسی کے سامنے روتی ہی رہتی تھیں۔ از کار کو اتنی وہ مصروف نہیں لگتی تھیں جتنا وہ واویلا کرتی تھیں۔ انھیں ہر بات میں show off کرنے کی عادت سی پڑ چکی تھی۔

''میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ میں کھانے پکانے اور لانڈری میں برباد کروں۔'' چلتے پھرتے اس کے کانوں میں یہ جملہ بکثرت پڑتا تھا۔

''میں بہت بزی ہوتی ہوں امی۔۔۔ ہر دو مہینے بعد آپ کی طرف نہیں آ سکتی۔ بہت سوچ سمجھ کر وقت نکالنا پڑتا ہے آپ کو کیا پتا۔ آپ نے کبھی جاب کی ہو تو میری مصروفیت کا احساس ہو آپ کو۔'' فون پہ وہ ماں سے اکثر ہی کہتی پائی جاتی۔

''اب میں آپ کی دوسری بیٹی جیسی تو نہیں ہوں نا کہ جب دل کیا میکے چل پڑی۔ مجھے بہت

سوچ سمجھ کر وقت نکالنا پڑتا ہے۔'' وہ امی کے شکوہ کرنے پہ بڑی نخوت سے کہتی۔

''میرے سر پہ سوار مت ہوا خبا۔ میرے پہلے ہی بہت کام پڑے ہیں۔ جا کر ریشم سے کہہ دو جو بھی کھانا پینا ہے۔'' وہ ہر بات کا جواب کم و بیش اسی قسم کے جملے سے دیا کرتی تھیں۔ ایٹ ٹو تھری کی جاب کرنے والی اس کی ماں اتنی محنتی نہیں تھی جتنا اسے خود کو محنتی ظاہر کرنے کی عادت تھی۔ اتنی مصروف نہیں تھی جتنا اس کا پرچار کرتی تھی۔ اس نے بہت سی خواتین کو ان سے زیادہ مصروف دیکھا تھا، اس کی دوستوں کی مائیں اور ان کی بہنیں وغیرہ۔ جو اتنا کام کر کے بھی اس کی ماں سے زیادہ خوش اخلاق بھی تھیں اور کبھی اپنی مصروفیات کو جتاتی بھی نہیں تھیں۔

وہ نانی کے گھر آ کر بھی اداس ہی رہا۔ اسے اپنے ننھیال جانا پسند تھا کیونکہ وہاں نانو تھیں جو اس کا بہت خیال کرتی تھیں، ماما سے کہیں زیادہ۔۔۔ نانا ابو تھے جو پاپا کی طرح شفیق تھے، دادا کی طرح سخت مزاج نہیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں جھٹ پٹ پوری کر دیتے تھے۔۔۔ شہیر ماموں تھے جن سے اس کی خاصی دوستی تھی۔ اپنی ساری مصروفیت کے باوجود وہ اسے وقت دیتے تھے۔ اکثر اسے فون بھی کرتے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں دلچسپی سے سنتے تھے۔ اس کو ساتھ بٹھا کر ایکشن مویز دکھاتے تھے۔ اس کے من پسند کارٹونز دیکھتے تھے۔ ریسلنگ تو اس کی اور ماموں کی فیورٹ تھی۔ اسے سارے نئے اور پرانے ریسلرز کے نام ازبر تھے، ان کے ایکشنز، میچز، میوزک۔۔۔ وہ ماموں کے ساتھ ان کے جم بھی جایا کرتا تھا۔ ان سے باڈی بلڈنگ کے متعلق باتیں کرتا ان سے ٹپس بھی لیا کرتا تھا۔ وہ بھی اسے ماموں نہیں لگتے تھے۔ ان سے بے تکلفی کا عالم ہی یہ تھا کہ جیسے وہ اس کے ہم عمر ہوں۔ وہ انھیں کوئی ماموں شاموں بلانے کا تردد نہیں کرتا تھا۔ سیدھا سیدھا شہیر کہتا تھا۔۔۔ لیکن اس بار شہیر آفس کے کسی کام سے کچھ دن کے لیے شہر سے باہر تھا۔ یہ جان کر اسے اور بھی برا لگا تھا۔

اس کی چھوٹی خالہ سے بھی بہت دوستی تھی۔ وہ بالکل بھی ماما جیسی نہیں تھیں۔ نرم، سادہ لیکن بے حد سنجیدہ۔۔۔ وہ ہمیشہ سے اس کے لئے اسٹیشنری اور کتابیں خرید کر رکھتیں۔

''میں چاہتی ہوں تم دوسرے بچوں کی طرح موبائل اور ٹیب کی بجائے بکس پڑھو۔۔۔ ان سے

اچھا کوئی دوست نہیں ہوتا۔"

"تمہیں فری ٹائم میں کوئی آرٹ ایکٹیویٹی شروع کرنا چاہئے۔ یہ تمہارے بہت کام آئے گی۔" اس کے لئے کلرنگ باکس اور بکس جمع کرنے والی خالہ بہت اچھی ڈرائنگز بناتی تھیں۔

وہ اپنی ننھیال سے ماں کا موازنہ کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کی ننھیال میں سب سے الگ تھیں۔ مہربان اور پیارے لوگوں میں ایک سخت دل، بدمزاج۔۔۔ اس کی ماں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں اور ماں باپ سے بھی کسی حد تک رکھائی سے ہی پیش آتی تھیں۔ بداخلاقی گویا ان کے مزاج کا مستقل حصہ بن چکی تھی۔ وہ نہیں سمجھ پاتا تھا کہ اس کی ماں کا مسئلہ کیا ہے۔۔۔؟

پہلی رات وہ کافی دیر تک جاگتا رہا تھا۔ باپ کے بغیر سونے کی اسے عادت نہیں رہی تھی اوپر سے ماں نے اسے نیچے میٹرس پہ اکیلا سلا دیا تھا۔ وہ دیگر بچوں کی طرح یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں سے کوئی جن یا روح نہ نکل آئے خاص کر اس سائیڈ سے جہاں دروازہ تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ماما اور اخبا بیڈ پہ سو رہی تھیں۔ نائٹ بلب کی مدھم سی روشنی میں سب مبہم دکھائی دے رہا تھا۔ اسے لیٹے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اب اس کی بس ہو چکی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے رونا شروع کر دیا۔ اندھیرے، خاموشی اور اکیلے پن سے اسے گھٹن ہونے لگی تھی۔ ساری ڈراؤنی کہانیاں اور فلمیں یاد آ رہی تھیں۔

"ماما۔۔۔" روتے ہوئے اس نے آنکھوں کو مسلتے ہولے سے ماں کو پکارا تھا۔ آواز مدھم تھی۔ کہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ بچے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائیں، گھبراہٹ، تکلیف اور پریشانی میں انھیں ماں ہی چاہئے ہوتی ہے۔

وہ ماں کو جھنجھوڑ کر اٹھانا چاہتا تھا۔ ان سے لپٹ کر رونا اور سونا چاہتا تھا لیکن ان کی ڈانٹ کے خوف سے وہ ایسا نہیں کر سکا۔

"ماما جی۔۔۔" اب کی بار وہ زور سے روتے میں چلایا تھا۔ ماما نے نیم وا آنکھوں سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا ہوا ذکی۔۔۔؟" آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''ماما مجھے نیند نہیں آ رہی۔''

''آ جائے گی نیند۔ آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔'' انھوں نے کروٹ بدل لی۔ وہ انھیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے سونے کی ناکام کوشش کر رہا ہے لیکن وہ سو نہیں پا رہا۔

''نہیں آ رہی نا۔۔۔کیا کروں۔۔۔؟''

''مرو جان چھوڑو میری۔ آٹھ سال سے دونوں باپ بیٹا نے زندگی عذاب بنا رکھی ہے۔ نہ دن کو سکون نہ رات کو آرام۔ ماں کے گھر میں آرام کے لئے آئی ہوں تم مجھے یہاں بھی سکون سے نہ رہنے دو۔'' لفظوں کی مار مار کے وہ پہلو بدل کر سو گئی تھی۔ وہ منہ پہ ہاتھ رکھے اپنی بلند ہوتی سسکیوں کو دبانے لگا۔

کمرے سے ملحقہ اسٹور میں اس کی خالہ سو رہی تھیں جو اب اٹھ کر اس کے پاس آ گئیں۔ اسے گود میں اٹھا کر اپنے ساتھ اسٹور میں لے گئیں۔ اپنے ساتھ لگا کر وہ اسے کتنی دیر خاموشی سے تھپکتی رہیں۔ بالآخر اسے نیند آ ہی گئی۔

اس عورت کے پاس زندگی کی ہر آسائش ہے۔ تعلیم، نوکری، گھر، شوہر، بچے لیکن اس نے کبھی اس عورت کو کسی ایک بات پہ بھی شکر کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی چیزوں کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی تھی۔ شکر پھر کیوں کرتی۔۔۔؟ ہر کامیابی اسے اپنی قابلیت کا نتیجہ لگتی تھی، وہ کبھی خدا کا کرم نہیں سمجھی تھی۔ وہ پوری رات فاطمہ نے جاگتے ہوئے گزاری تھی۔

اگلی صبح وہ ماں سے سخت ناراض تھا۔ بجھے دل سے نانو کے ساتھ ناشتہ بنوایا تھا، بے دلی سے ناشتہ کر کے وہ اٹھ کر باہر صحن میں چلا گیا تھا۔ پاپا کا فون آیا تھا لیکن اس نے ماما کی شکایت نہیں کی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ دونوں اس بات کو لے کر آپس میں جھگڑیں گے۔ اپنے ماں باپ کے جھگڑے اس نے کبھی ننھیال میں نہیں بتائے تھے لیکن وہ سب پھر بھی کسی حد تک جانتے تھے۔

''کچھ ہوا ہے کیا۔۔۔؟'' فاطمہ دوپہر میں لوٹی تو وہ وہیں سیڑھیوں پہ اونگھ رہا تھا۔ فاطمہ نے اس کے بال سہلائے تو وہ جاگ گیا۔

''یہاں کیوں بیٹھے ہو۔۔؟''

''کہاں بیٹھوں۔۔۔؟''

''اندر۔۔'' وہ خاموش رہا۔اسے اندر نہیں جانا تھا۔اندر ماما تھیں اور وہ ماما کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔

''چلو ایسا کرتے ہیں میں تمہیں اپنے دوست سے ملوانے لے جاتی ہوں۔'' وہ جھٹ تیار ہو گیا۔

''رکو میں امی کو بتا آؤں اور بیگ رکھ آؤں۔'' وہ جب تک اندر سے آئی وہ ہشاش بشاش گیٹ پہ کھڑا تھا۔وہ اس کی انگلی تھامے چلنے لگی۔

''تم ماما سے ناراض ہو۔۔؟''

اس کے سوال پہ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر سر اثبات میں ہلا دیا۔

''انھوں نے کہا کہ میں مر جاؤں۔'' ایسا کہتے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔فاطمہ کو برا لگا تھا۔اسے کوئی یاد آیا تھا۔۔۔کوئی اپنا،ننھا منا سا،روتا بسورتا۔

''غصے میں کہہ دیا ہو گا۔ماما غصے میں اگر کچھ کہہ دیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ واقعی ایسا کہہ رہی ہیں۔''

''پاپا نے تو کبھی غصے میں ایسا نہیں کہا۔وہ اخبا اور مجھ پہ غصہ نہیں کرتے۔'' وہ تقابلی جائزہ پہ اتر آیا تھا۔

''ماما پاپا میں سے ہمیشہ ایک زیادہ غصہ کرتا ہے تا کہ بچے بگڑ نہ جائیں۔اگر دونوں میں سے کوئی بھی ڈانٹے گا نہیں تو بچے گندے بچے بن جاتے ہیں۔۔۔ان کی شرارتیں زیادہ ہو جاتی ہیں اور وہ بات بھی نہیں مانتے۔اس لئے ایک کو تو سختی کرنا پڑتی ہے۔''

''آپ ماما سے کہیں کہ اذکار کبھی گندا بچہ نہیں بنے گا بس وہ مجھے ڈانٹا نہ کریں۔'' وہ خاموش ہو گئی تھی۔یہ دنیا کا مشکل ترین کام تھا جو وہ اسے کرنے کو کہہ رہا تھا۔اس کی ماں سمجھنے سمجھانے کے دائرے سے باہر تھی۔

''چلو میرے دوست کا گھر آ گیا۔'' بڑے سارے گھر کے سامنے پہنچ کر وہ بیل دے رہی تھیں۔

"آپ کے دوست لڑکے ہیں۔۔۔؟" اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ "ہا ہائے، لڑکوں سے دوستی ہے خالہ آپ کی"۔۔۔فاطمہ کو ہنسی آ گئی۔

"ہاں لڑکے ہیں۔"

"آپ کے فرینڈز میں لڑکے بھی ہیں۔۔۔؟" اب کی بار وہ حیرت سے سوال کر رہا تھا۔

"he is my only friend ..." اس نے کچھ توقف کے بعد زور دیتے ہوئے کہا۔۔۔

"only male friend...." کچھ سمجھتے، کچھ نہ سمجھتے اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"you mean boyfriend...." فاطمہ کا رنگ اڑ گیا۔

"only friend ..." اس نے تصحیح کی۔

"yes only boy friend ..." وہ اپنی معصومیت سے بولا۔

اب وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ اس کا دوست لڑکا ہے مطلب کہ بوائے لیکن وہ نہیں ہے جو وہ کہہ رہا ہے یعنی بوائے فرینڈ۔۔۔یہ سمجھانے بیٹھتی تو اسے یہ بھی سمجھانا پڑتا کہ بوائے فرینڈ اور اونلی فرینڈ میں کیا فرق ہے۔۔۔وہ الٹا لٹکنے، پیروں کے بل سڑک پہ چلنے، پورا دن مرغا بن جانے کو تیار تھی لیکن یہ فرق سمجھانا۔۔۔اونہوں۔۔۔

"کیوں تمہارے فرینڈز میں لڑکیاں نہیں ہیں۔۔۔؟"

"ایک بھی نہیں۔۔۔لڑکیاں بہت شکایتیں لگاتی ہیں، مجھے سخت بری لگتی ہیں، اس لئے میں ان سے دوستی نہیں کرتا۔" بری سی شکل بناتے اس نے جواب دیا۔

"میں بھی لڑکی ہوں۔" لڑکیوں کی ایک برائی پہ اس کے اندر کی لڑکی جھٹ سے برا مان گئی تھی۔

"آپ تو خالہ ہیں۔" مطلب وہ باقی لڑکیوں میں اسے نہیں شامل کرتا تھا۔

تبھی سامنے کا گیٹ کھلا اور ایک لمبا چوڑا لڑکا برآمد ہوا جس نے سلیولیس شرٹ اور برمودہ پہن رکھا تھا۔ذکی نے ایکسرے مشین کی طرح اس کا ایک سیکنڈ میں ہی جائزہ لے ڈالا۔

"Dounold duck" ایک خوشگوار حیرت کا احساس اس کے چہرے اور لہجے سے عیاں تھی۔

فاطمہ مسکرا دی۔

وہ اسے اسی نام سے پکارتا تھا تب سے جب سے وہ کام کرتے، اسے پڑھاتے نم آنکھوں سے خود کلامی کرتے کہہ رہی تھی۔

''میں بطخ کیوں نہیں بن جاتی۔۔۔؟''

''آپ بطخ بننا چاہتی ہیں۔۔۔۔؟'' وہ پنسل منہ میں دبائے بڑے اشتیاق سے اسے دیکھتے پوچھنے لگا۔

''تم کام کرو اپنا۔'' فاطمہ نے اسے گھورا۔

''میں بھی بندر بننا چاہتا ہوں تاکہ میں درختوں سے لٹک سکوں۔۔۔''

''بننا چاہتا ہوں۔۔۔؟'' اس کی آنکھیں باہر کو حیرت سے ابل آئیں۔

''تمہارا مطلب ہے کہ مزید بننا چاہتا ہوں۔۔۔؟'' دائیں آبرو اچکا کر اس نے جتایا تھا کہ وہ پہلے سے ہی اس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

''اب آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں۔ میں اتنا بھی بندر نہیں ہوں۔۔۔'' فاطمہ نے ابرو اچکائے، ہمدان نے سر کھجایا کچھ اور سوچا اور جھٹ سے اپنے جملے میں ترمیم کی۔

''مطلب اتنا زیادہ والا بھی نہیں ہوں۔۔۔''

''ویسے آپ کی پرسنالٹی کو ڈونلڈ ڈک بننا سوٹ کرتا ہے۔۔''

''وہ کیوں۔۔؟''

''کیونکہ روتے ہوئے آپ بالکل اس جیسی لگتی ہیں۔'' فاطمہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تو وہ جھٹ سے معصوم صورت بنائے کام کرنے لگا۔ وہ بس ایک بار ہی اس کے سامنے روئی تھی جب اس کے واز کو آگ لگی تھی اور اسی بات کو ہمدان نے ذہن سے نہیں نکالا تھا۔

اور یہ تب ہوا تھا جب وہ اپنے آرڈرز میں مصروف اسی طرح دن رات کام کر رہی تھی۔ انھی دنوں رطابہ رہنے آئی تھی۔ رامین کی رخصتی کے بعد وہ پہلی بار آئی تھی۔ مزاج خراب ہی لگتا تھا اور دماغ

اس سے زیادہ خراب۔۔۔آتے ہی امی ابا سے نجانے کس بات پہ جھگڑنے لگ گئی تھی۔اسے نیچے سے آتا شور ہی سنائی دیا تھا بس۔۔۔معاملے کی تہہ تک وہ نہیں پہنچ سکی تھی اور وقت کی کمی کے باعث پہنچ سکتی بھی نہیں تھی۔کل تک اسے آرڈر پورا کرنا تھا۔

''تو یہ ہے وہ دو ٹکے کا کام جو تم کر کے مجھ سے مقابلہ بازی کرنا چاہتی ہو، میری طرح ڈاکٹر بننا چاہتی ہو۔۔۔''اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ گھر سے لڑ کر آئی تھی اور اب ہر کسی سے لڑنا چاہتی تھی۔۔۔امی ابا کو دس سنا کر بھی اسے سکون نہیں آیا تھا تو اس پہ مزید دل ہلکا کرنے اوپر چلی آئی تھی۔جو بھی رستے میں آئے گا اسے وہ سنائے بنا چین نہیں لے گی، جو رستے میں نہیں آئے گا اس تک وہ رستے بنا لے گی تا کہ اس کا چین سکون برباد کر سکے۔۔۔سب پہ اپنے اندر بھرا زہر انڈیلے گی اور اندر لگی آگ میں سب کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

''یہ کاغذ کے ٹکڑوں اور گتے کے ڈبوں کو جوڑ جوڑ کر تم میری برابری پہ آنا چاہتی ہو۔۔۔میرے جیسی بننا چاہتی ہو۔۔۔سوچ ہے تمہاری کہ تم اس میں کامیاب ہو گی۔خواب وہ دیکھو جو اوقات کو جچتے ہوں، جسم پہ ڈھنگ کا کپڑا ہے نہیں اور چلی ہیں دنیا سر کرنے۔۔۔۔یہ دو دو روپے کی ردی بیچ کر ڈگری لو گی، وہ بھی میڈیکل کی۔۔''اس کا غرور چیخ رہا تھا کہ وہی سب کچھ ہے اور کوئی کچھ بھی نہیں۔۔۔حقارت تھی، نفرت تھی، جو بھی تھا سگی بہن کے لئے تھا اور بہت تکلیف دہ تھا۔

''اتنا آسان سمجھ رکھا ہے کیا کہ ٹکے ٹکے کا انسان ڈاکٹر بن سکتا ہے۔۔۔؟ ملک کی کروڑوں کی آبادی میں چند ہزار ہوتے ہیں جو چنے جاتے ہیں۔ہر گلی کا کوڑا کرکٹ نہیں اٹھا لیا جاتا۔وہ کام کرو جو اپنی اوقات کے مطابق ہو۔''واپس پلٹی اور نیچے جانے کے لئے پہلی سیڑھی پہ قدم رکھا۔

''آپ اس قابل کہاں ہیں کہ کوئی آپ کو آئیڈیلائز کرے۔اللہ نہ کرے کہ مجھ پہ کبھی اتنا برا وقت آئے کہ میں آپ جیسی بن جاؤں۔۔۔ویسے اوقات تو آپ کی بھی نہیں تھی جو کچھ آپ کو مل گیا ہے ،شاید تبھی آپ اپنے آپ میں نہیں رہیں۔یہ تو وقت ہی بتائے گا کس کی کیا اوقات ہے۔''

''میں تمہارا منہ نوچ دوں گی۔۔۔''وہ جھپٹنے کے لئے ہی پلٹی تھی۔

''بڑے شوق سے۔۔۔میرے ہاتھ سلامت ہیں اور کام کرتے رہنے سے آپ سے کہیں زیادہ مضبوط بھی ہو چکے ہیں۔''

''تم مجھے دھمکا رہی ہو۔۔؟''اس کی چلاتی آواز مٹی کی دیواروں میں گونج رہی تھی۔

''میں بس اپنا دفاع کر رہی ہوں جو میرا حق ہے۔''

رطابہ غصے سے بالکل پاگل ہو جانے کو تھی۔۔۔فاطمہ جس اعتماد سے ہاتھ سینے پہ باندھے، بہت ٹھنڈے انداز میں، تپا دینے والی مسکراہٹ لئے اسے دیکھ رہی تھی، اس نے اسے آگ کی لپیٹ میں لے لیا تھا لیکن وہ اس کا منہ نوچنے کی ہمت نہیں دکھا سکی۔۔۔کسی کا منہ اس کی ملکیت نہیں تھی کہ نوچتی کھروچتی پھرے اور اگلا ایک گال آگے کرنے کے بعد خوشی خوشی دوسرا گال آگے کر دے۔

''میں دیکھ لوں گی تمہیں''جیسا منہ بنائے وہ نیچے چلی گئی تھی اور وہاں سے سامان باندھ کر اپنے گھر۔

رطابہ کے سامنے ہمت دکھانے والی فاطمہ کا دل دکھا تھا، اپنے لئے بہن کے خیالات، الفاظ اور انداز سے۔وہ اگلے کئی دن ڈسٹرب رہی تھی۔کام کی زیادتی اسے کبھی اتنا نہیں تھکاتی تھی جتنا ایسی باتیں جو اس کے گھر والے ہی اس پہ آتے جاتے کرتے تھے۔آپ پہلے سے ایک چٹیل اور سخت رستے پہ ہوں اور ماضی کی کوئی لہر آ کر آپ سے ٹکرا جائے تو زندگی ایسے میں نہ ختم ہونے والا ساحل اور کبھی نہ ختم ہونے والا سفر لگنے لگتی ہے۔

وہ میڈم شیریں کو بتانا چاہتی تھی کہ بطخ اس لئے بھی محنت کے باوجود مسکراتی ہے کیونکہ وہ بطخوں میں ہی بستی ہے جو اس جانور کی طرح زہریلی نہیں ہوتیں جس کا نام انسان ہے۔۔۔لیکن وہ بطخ نہیں بن سکتی تھی۔وہ ہمیشہ محنت کرتے ہوئے بظاہر مسکرا نہیں سکتی تھی۔یہ مشکل تھا کیونکہ دل دکھتا تھا۔

''وہ ہمیں الزام دے رہی ہے کہ ہم نے ایک نالائق انسان سے اس کی شادی کر دی جو کسی قابل نہیں ہے۔صرف اس کے باپ کا پیسہ دیکھا، فوج کا نام دیکھا۔۔۔وہ تو اپنے جیسا ڈاکٹر ڈیزرو کرتی تھی۔ہم نے اس کی شادی کرنے میں جلدی کر دی، اس کے ساتھ زیادتی کر دی۔''میاں سے لڑ کر آنے کے بعد وہ زبان کے حربے ماں باپ پہ آزما گئی تھی۔ان کا دل زخمی کر گئی تھی۔

''یہ رشتہ اس کی منشا پہ گل رخ لائی تھی۔اس کی سب سے بڑی حامی وہ خود تھی۔۔۔فوج کا نام اور باپ کا پیسہ اسے نظر آیا تھا۔ہمیں تو دانش کی شرافت دکھائی دی تھی۔'' ابا کی آواز نم تھی۔بڑھاپے میں انھیں یہ تذلیل بھی سہنا تھی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہے کیونکہ وہ دانش بھائی جیسا اچھا انسان ڈیزرو نہیں کرتی تھی۔اسے اپنے جیسا بد دماغ ملنا چاہئے تھا جو اس کا دماغ درست کر دیتا۔'' فاطمہ نے بس اتنا ہی کہا تھا۔

امی ابا کا بھی اس کی باتوں پہ دل برا ہوا تھا لیکن وہ ایک دوسرے سے نظریں چھپائے پھرتے رہے۔ان کی ذہین فطین بیٹی کی ڈگری اور علم کسی کام نہیں آیا تھا سوائے اس کا دماغ خراب کرنے کے۔جس بیٹی کی ڈاکٹری پہ انھیں فخر ہوا کرتا تھا، آج اسی نے ان کا سر جھکا دیا تھا، دل دکھا دیا تھا۔

خیر تو ملاقات ہو رہی تھی ذکی اور ہمدان کی۔۔۔ہمدان ذکی کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔فاطمہ سے اس نے بہت ذکر سنا تھا اذکار کا اس لئے پہچاننے کی غلطی نہیں کی تھی۔

''میں ایک نیا دوست لائی ہوں تمہارا۔'' ذکی نے اسے دیکھا جیسے کہتا ہو ابھی تو سوچوں گا کہ دوستی کروں یا نہیں۔

''میرا نام ہمدان ہے۔۔۔آپ کی خالہ میری ٹیچر بھی ہیں اور دوست بھی۔۔۔ہم کافی پرانے دوست ہیں۔جب یہ چھوٹی تھیں اور میں بہت ہی چھوٹا تھا تب ہماری دوستی ہوئی تھی۔تو کیا ذکی اب ہمدان کا دوست ہے۔۔۔؟'' اس نے اپنا دوستی بھرا ہاتھ مسکراتے ہوئے آگے بڑھایا۔اذکار کچھ سنجیدہ تھا، کچھ متامل تھا اور کچھ گھبرایا ہوا۔ہمدان اور فاطمہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔۔۔پھر اس نے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

''فرینڈز۔۔۔'' اب کی بار مسکراہٹ اذکار کی تھی۔وہ تینوں مسکرا دیے۔

''اندر چلیں۔''

''تم جانتے ہو میں اندر نہیں جا سکتی۔'' فاطمہ نے کچھ یاد دلایا تھا۔ہمدان نے تاسف سے ہونٹ بھینچے اور سر ہلایا۔اسے یاد تھا بس وقتی طور پہ بھول گیا تھا۔

"پارک تک چلتے ہیں۔ واک بھی ہو جائے گی۔" موسم اچھا تھا، وہ تینوں واک کرتے قریبی پارک تک گئے اور وہاں سے پلٹ آئے۔ سارے رستے وہ اذکار سے چھوٹے موٹے کئی سوال کرتا رہا تھا۔۔۔ اس کے اسکول، دوستوں، پڑھائی، کھیل سب کے بارے میں ڈھیروں باتیں کرتا وہ اسے اپنی دلچسپیوں کے بارے میں بھی بتاتا رہا۔ اذکار کو وہ شہیر ماموں جیسا ہی اچھا لگا تھا۔ جو بات اسے سب سے زیادہ اچھی لگی تھی وہ ہمدان کے مسلز تھے۔۔۔

"کیسا لگا تمہیں نیا دوست۔۔۔؟" گیٹ سے اندر جاتے وہ پہلے کی نسبت خوش تھا۔ ہشاش تھا۔

"اچھا۔۔۔ اور ان کی باڈی اس سے بھی زیادہ اچھی۔" فاطمہ سے اپنی ہنسی دبانا مشکل ہو گیا۔

"میں انھیں کیا بلاؤں۔۔۔؟" دوست تھا لیکن ہم عمر نہیں تھا۔ نام لینا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"دانی۔ جو میں بلاتی ہوں۔" ذکی کو یہ نام پسند آیا تھا۔ گھر داخل ہوتے دونوں خوش تھے۔ ذکی اپنا نیا دوست بننے پہ اور فاطمہ اس کا موڈ ٹھیک ہونے پہ۔

شام میں فاطمہ کو پھر سے ہسپتال جانا پڑ گیا تھا۔ کوئی ایمرجنسی تھی۔ جانے سے پہلے وہ اسے سمجھا کر گئی تھی کہ وہ رات واپس نہیں آئے گی اور شاید اگلا دن بھی۔۔۔ ایسے میں وہ اچھا بچہ بن کر، کلمہ اور ساری دعائیں پڑھ کر سوئے۔ رات کو ڈر لگے تو بس اللہ کو بتا دے کہ اسے ڈر لگ رہا ہے، ماما کو بالکل مت جگائے۔ اللہ اس کا سارا ڈر بھگا دیں گے۔

"اللہ سے نیند مانگو گے تو اللہ نیند دے دیں گے۔۔۔" اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

اس کا دل نہیں کر رہا تھا کہ خالہ جائیں لیکن اسے جانا تھا۔ یکدم اس کی خالہ سے اٹیچمنٹ بڑھ گئی تھی۔۔۔ رات جب اسے "کسی" کی ضرورت تھی تو وہ "کسی" خالہ بن گئی تھیں اور اب وہ اس کسی کے ساتھ ہی جڑ کر رہنا چاہتا تھا۔

بچے محبت چاہتے ہیں، قربت چاہتے ہیں اور جب یہ انھیں والدین سے نہیں ملتا تو وہ اسے کسی اور میں تلاش کرتے ہیں۔ گھر سے نہیں ملتا تو باہر ڈھونڈتے ہیں۔۔۔ بچوں کو یہ پیار، توجہ، محبت اور چاہت والدین سے ملنا چاہئے، یہ ان کا حق ہے۔۔۔ جنھیں یہ حق نہیں ملتا، وہ پھر حق دینا بھول جاتے ہیں۔

اگلی صبح وہ ناشتہ کر کے جلدی جلدی تیار ہونے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو۔۔۔؟'' رطابہ نے اپنے موبائل سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔

''ماما میرا نیا دوست بنا ہے۔۔۔دانی۔۔۔فاطمہ خالہ کا دوست۔ میں آج ان کے ساتھ جاؤں گا۔'' وہ پرجوش ساماں کو بتا رہا تھا۔

''کس کی پرمیشن سے۔۔۔؟''

''فاطمہ مجھے بتا کر گئی تھی کہ آج یہ ہمدان کے ساتھ جائے گا۔ گھر پہ بور ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بہل جائے گا۔'' امی نے فوراً سے اس کا دفاع کیا۔

''اس کی ماں میں ہوں یا فاطمہ۔۔۔اس کی زندگی کے فیصلے میں کروں گی۔ اور وہ لڑکا ہمدان تو ہے ہی بدتمیز۔۔۔اس کے ساتھ جا کر یہ بھی بگڑ جائے گا۔''

''تم نے اسے بچپن میں دیکھا تھا۔ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔'' امی کو اس کی زبان درازی بری لگ رہی تھی، ذکی کا اترا چہرہ اس سے کہیں زیادہ برا لگ رہا تھا۔

''بدتمیز انسان بدتمیز ہی رہتا ہے۔'' امی نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ ہاں ٹھیک کہتی ہو۔ کیونکہ تم اس بات پہ پوری اترتی ہو۔

''آپ جا کر تیار ہو جاؤ بیٹا۔ ہمدان آتا ہوگا۔'' ذکی خوش خوش ماں کو چور نظروں سے دیکھتا بھاگ گیا۔ رطابہ کچھ کہنے لگی تو امی نے سختی سے اسے کہنے سے روک دیا۔

''اس پہ میرا بھی کچھ حق ہے۔۔۔تم اس کی ماں ہو تو میں تمہاری ماں ہوں۔'' رطابہ پھر خاموش ہو گئی۔

''ماما ناراض ہیں نانو۔۔۔'' کپڑے بدل کر وہ باہر آیا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

''وہ کب کسی سے راضی ہوئی ہے۔۔۔'' منہ میں بڑبڑاتے امی نے اسے پیار کیا۔

''وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔۔۔آپ جاؤ۔'' ہمدان کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو نانو اسے اپنے ساتھ گیٹ تک چھوڑنے گئیں۔

ہمدان نے کل کی طرح ہی برمودہ اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی شرٹ پہ انگریزی میں بڑا بڑا cheater لکھا تھا۔۔۔

سفید کلٹس کے پیچھے سرخ روشنائی سے "The closer you get, the slower i drive..." لکھوایا گیا تھا۔

"آپ کی باڈی مجھے بہت اچھی لگی۔" فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا وہ گاہے بگاہے اس کے مسلز دیکھ رہا تھا۔

"تم بھی بنا لینا لیکن بڑے ہو کر۔۔۔" ایک لحظہ خاموشی سے اس نے سر جھکا لیا۔ وہ اپنی زندگی سے متعلق ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا جو اسے پسند ہو لیکن اس کی ماں کو ناپسند۔۔۔ اور ابھی ابھی وہ ہمدان کے بارے میں ان کے منہ سے جو کچھ سن کر آیا تھا اس سے وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ایسے کسی بھی کام کو وہ کتنا ناپسند کریں گی۔

ہمدان اسے آئسکریم کھلانے کے بعد فن لینڈ لے گیا تھا۔ وہیں ساتھ فوڈ کورٹ سے دونوں نے لنچ کیا۔۔۔ کچھ دیر اذکار وہاں کھیلتا رہا اور ہمدان اس کی شرارتوں میں اپنا بچپن دیکھتا رہا۔ اذکار بہت معصوم تھا، ہمدان کی شرارتوں کے آگے وہ بچہ کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ پھر دونوں ہمدان کے جم چلے گئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ فاطمہ کو لینے اس کے ہاسٹل آ گئے جو ہسپتال کے ساتھ ہی منسلک لیکن ذرا ہٹ کر تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اذکار پورا دن گھومتا رہا تھا۔ پاپا کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا اور ماما کی دلچسپی نہیں تھی۔ انسان کی زندگی میں کوئی رشتہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جو اسے کبھی کبھار ہی سہی لیکن سارا دن بھرپور وقت دے سکے، اس کی مرضی کی جگہوں پہ لے جا سکے، کمپنی دے سکے، تھوڑا بہت بگاڑ دے، زیادہ سا سنوار دے۔

شام کو چھ بجے انھوں نے فاطمہ کو ہاسٹل سے لیا تھا۔ تھکی تھکی سی خالہ نے اسے گود میں لیتے فرنٹ سیٹ سنبھالی۔۔۔

"کیسا رہا آج کا دن۔۔۔؟" اسے پیار کرتے وہ پوچھ رہی تھیں۔

"happiest day of my life ..."

"ہم نے صبح سے کچھ خاص نہیں کھایا۔۔۔ یہی بس آئسکریم، برگر شرگر، چند دانے فرائز۔۔۔ تو

اب اچھا سا ڈنر تو ہونا ہی چاہیے۔'' ہمدان نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد گاڑی صدر بازار کی طرف موڑ لی۔ وہ اچھا سا ڈنر کھلا کر اس happiest day کا اختتام چاہتا تھا۔

اذکار اور فاطمہ وہیں بیٹھے رہے تھے اور ہمدان آرڈر کرنے ریسپشن تک گیا تھا۔ یہاں سیلف سروس کا رواج تھا۔ آرڈر دے کر وہ واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا تھا۔ جب ان کا ٹوکن نمبر پکارا گیا تو فاطمہ اٹھ کر ریسپشن سے ٹرے لینے گئی تھی۔ پس منظر میں Akon کا smack that لگا ہوا تھا۔ ٹرے اٹھا کر اعتماد سے چلتی ہوئی وہ ٹیبل کی طرف جاتے جاتے یکدم رکی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس وہ سفید مجسمے کی طرح ساکت ہوئی تھی۔ ہاتھوں کی گرفت ٹرے پہ مضبوط ہوئی کہ کہیں وہ ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔ ہمدان کی اس سنگِ مرمر کے مجسمے پہ نظر پڑی تو وہ چونکا اور اس تک تیزی سے آیا۔

''کیا ہوا۔۔۔؟ ٹھیک ہیں آپ۔۔۔؟'' ٹرے اس کے ہاتھ سے تھام کر وہ دوسرے ہاتھ سے اسے تھام کر اپنی جگہ تک لایا تھا۔

وہ رو دینے کو تھی لیکن روئی نہیں تھی۔

''ہوا کیا ہے یار۔۔؟ بتائیں تو۔۔۔؟''

''تم نے کبھی ایسا محسوس کیا ہے کہ بیک گراؤنڈ پہ اونچی آواز سے چلتے میوزک پہ یوں اعتماد سے چلتے ہم قدموں کو اسی ساز سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔۔۔ چال میں ایک عجیب سا تفاخر آ جاتا ہے۔ ہم خود کو یکدم ایسا سمجھنے لگتے ہیں جیسے ہمارے علاوہ وہاں کوئی ہم سا نہ ہو۔۔۔؟'' ہمدان نے، جو اسے غور سے سن رہا تھا یوں سر ہلایا جیسے ہاں وہ اس کی بتائی کیفیت سے گزر چکا ہے، سمجھ رہا ہے۔

''ابھی ابھی میرے ساتھ یہی ہوا اور مجھے لگا کہ میں اس وقت حاصل ساری نعمتوں کو گنوا دوں گی۔''

''یہ آپ کا وہم ہے اور کچھ نہیں۔'' وہ کئی بار اس سے سب سن چکا تھا کہ جب کبھی اسے ایسا لگتا کہ اس جیسی چیز کسی کے پاس نہیں ہے، اس جیسی نعمت کسی کسی کو ملتی ہے وہ اس سے دور ہو جاتی تھی۔ وہ بازار سے سوٹ لائی ہے، امی کو دکھا رہی ہے، ساتھ بتا رہی ہے۔

''کپڑا دیکھیں کتنا ملائم۔۔۔ کبھی پہنا ہے ہم نے ایسا کپڑا۔۔؟'' امی مرعوب سی نرم کپڑے پہ ہاتھ پھیر رہی ہیں کہ اچانک اس کے اپنے ہاتھ سے کپڑے پہ چائے گرتی ہے اور ایک انمٹ داغ چھوڑ

جاتی ہے۔

وہ ایک مشہور فاسٹ فوڈ سے پزا منگاتی ہے۔ امی ابا کی ویڈنگ اینی ورسری مناتی ہے۔ ابا ہنس رہے ہیں، کافی عرصے بعد خوش ہوئے ہیں۔ امی کی آنکھیں نم ہیں۔

''اس کی کیا ضرورت تھی بیٹا۔۔۔؟''

''کیوں ضرورت نہیں تھی۔۔۔؟ اب آپ کی بیٹی کمانے لگ گئی ہے۔ اتنا معمولی سا انتظام نہیں کر سکتی کیا۔۔۔؟ یہ پزا کھائیں۔۔'' وہ فاسٹ فوڈ کا نام فخر سے لیتی ہے۔۔۔

''وہاں سے کھانا تو خواب ہی تھا نا۔'' پہلا نوالہ لیتے اسے لگتا ہے کہ پزا باسی ہے مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اتنا بڑا نام اور کام۔۔۔ وہ فاسٹ فوڈ فون کرتے ہیں۔ وہ ماننے سے انکاری ہیں کہ ان کی جانب سے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ فاطمہ یکدم شاکڈ رہ جاتی ہے۔

وہ زبردست سا فاؤنٹین سیٹ اپ بناتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کسٹمائزڈ آرڈر تھا جو میڈم شیریں کے ایک پرانے کلائنٹ نے بنوایا تھا۔ یہ آرڈر اسے ٹھیک ٹھاک پرافٹ دینے والا تھا۔ وہ آرڈر مکمل کر کے فخر سے اسے دکھا رہی ہے۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ میں ایسا شاندار سیٹ اپ بھی تیار کر سکتی ہوں۔ اب تک مجھے کیوں نہیں پتا تھا کہ مجھ میں یہ ٹیلنٹ بھی ہے۔ میڈم شیریں کہہ رہی تھیں کہ شاید ہی اس سے شاندار سیٹ اپ کبھی کسی نے بنا کر دیا ہو۔'' تھا تو یہ فخر لیکن تکبر کی بو آ رہی تھی۔ ٹھا کی آواز آئی اور سیٹ اپ کی بنیاد چیخ گئی۔ سارا سیٹ اپ منہ کے بل بیٹھ گیا۔ وہ شاکڈ سی دیکھتی رہ گئی۔ آنکھوں کو بے یقینی سے ملتی رہ گئی لیکن منظر وہی رہا۔

سو اسے لگتا ہے کہ اس کا ایسا کوئی بھی بڑا بول جس سے رائی برابر بھی تکبر چھلکتا ہو اسے منہ پہ دے مارا جاتا ہے۔۔۔ لیکن ہمدان یقین نہیں کرتا۔

''تم شاید بھول گئے ہو کہ۔۔۔'' اس نے کچھ یاد دلانا چاہا۔

''یاد ہے مجھے سب۔۔۔ وہ آپ کا نصیب تھا۔ بلکہ آپ کی خوش قسمتی اور کسی کی بدقسمتی کہیں۔ بھولا کچھ بھی نہیں ہوں میں۔ نہ کسی کو بھولنے دیتا ہوں۔'' وہ اب اپنا کیا آرڈر پیک کرا کر گاڑی میں آ بیٹھے تھے۔ دونوں کا دل بیزار ہو چکا تھا۔ مزہ کھو چکا تھا۔ اذکار شوق سے کھا رہا تھا۔

گھر پہنچنے کی دیر تھی کہ رطابہ نے بڑی طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔۔۔

''سارا دن اپنے ساتھ تم اسے بھی خوار کرتی رہی ہو، وہ بھی اس لڑکے کے ساتھ جس کی فیملی نے تمہارے ساتھ جو کیا وہ سب تم بڑی جلدی بھول چکی ہو۔۔۔''

''سب یاد ہے مجھے۔۔۔ کچھ بھولی نہیں ہوں۔'' وہ اذکار کو لے کر اندر چلی گئی۔

امی نے شاکی نظروں سے رطابہ کو دیکھا۔

''کیا ضرورت تھی سب یاد دلانے کی۔۔؟'' رطابہ نے کندھے اچکائے۔ اسے کب کسی کا دل دکھا کر فرق پڑا تھا جو اب پڑتا۔ امی شاید اتنے سالوں میں اسے ٹھیک سے جانی ہی نہیں تھیں کہ وہ اپنی ذات کی تسکین کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتی تھی۔ ماں باپ کو کھا سکتی تھی۔ اولاد کو مٹا سکتی تھی۔ یہ تو پھر بہن تھی جو کسی شمار میں نہیں آتی تھی۔

فاطمہ کمرے میں لیٹ کر برے دل کے ساتھ آنکھوں میں آنسوؤں کو اُمڈنے سے روکتی رہی۔

ذکی کن اکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے ماں پہ رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ اتنی پیاری اس کی خالہ کو رلا دیا۔

ماضی۔۔۔ جو علامتِ درد ہے، اسے ہم بھول بھی جائیں تو دوسرے یاد کروانے کی ذمہ داری کاندھوں پہ اٹھائے پھرتے ہیں۔۔۔

یہی بہن تھی جس نے پہلے بھی اسے کیا کیا نہیں سنایا تھا اور اب بھی وہ کوئی موقع جانے نہیں دیتی تھی۔۔۔ اسے سب یاد تھا۔ خوشی ہنس ہنس کر بھلا دی جاتی ہے، دکھ اندر کہیں سمیٹ کر رکھ لیے جاتے ہیں۔۔۔ آہ انسان، کیوں ایسی سرشت رکھتا ہے۔

ناول سپاس گزار کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 5

اگلی صبح وہ ناشتہ کر کے کالام سے اشو وادی اور مہوڈھنڈ کے رستے پہ نکلے تھے۔لڑکوں میں اکثر ایسے تھے جو کل شام ہی نکل گئے تھے تاکہ مہوڈھنڈ جھیل کے کنارے کیمپنگ کر سکیں۔اگر عباد گروپ کے ساتھ لڑکیاں نہ ہوتیں تو وہ بھی یہی کرتے۔

وہ مختلف گروپس کی صورت اس طرح سے نکلے تھے کہ لڑکوں کی آدھی گاڑیاں آگے اور آدھی گاڑیاں پیچھے تھیں۔بیچ کی گاڑیوں میں لڑکیاں ہی تھیں کیونکہ لڑکیوں کو اعتراض تھا کہ گاڑی میں کسی نا کسی لڑکے کی موجودگی سے وہ زیادہ مزہ نہیں کر سکتیں۔اسی لئے اس بار گاڑی میں کوئی لڑکا نہیں تھا۔

اشو کا جنگل لمبے اور سیدھے درختوں سے بھرا پڑا تھا لیکن بہت ہی پر سکون۔۔۔کہیں کہیں کچھ منچلے گاڑیاں روک کر گاڑی کی ڈگی کھول کر اونچی آواز میں ڈیک پہ پشتو گانے لگائے روایتی رقص پیش کر رہے تھے۔انھیں دیکھنا بھی مزہ دے رہا تھا۔تحریم کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ گاڑی رکوکر ان کے ساتھ ہی تھرکنا شروع کر دے اور دل کھول کر بھنگڑے ڈالے۔ایک تو وہاں کا حسن،اوپر سے غضب کا موسم اور اس پہ مستزاد پشتو موسیقی۔۔۔کیا ہی حسین امتزاج تھا۔۔۔یہ تو وہ تینوں تھیں جنھوں نے اسے زبردستی روک کر رکھا ہوا تھا لیکن گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بھی وہ ہولے ہولے تھرکنے،جھومنے سے باز نہیں آ رہی تھی۔کبھی ایک اس کے بازو تھامتی تو دوسری اس کی ٹانگیں قابو کرتی اور منہ پہ ہاتھ رکھنا پڑ جاتا۔ایسے میں لگتا وہ تینوں اسے یرغمال بنا کر علاقہ غیر میں لے جا رہی ہیں۔نجانے آگے بیٹھا ڈرائیور ان کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔کیسے اپنے قہقہے روک رہا ہوگا۔ان تینوں کو اندر ہی اندر اس سے بے حد ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

سیرت گروپ ان سے اگلی گاڑی میں تھا۔ کلاس میں اگر ان کے گروپ کا کسی دوسرے گروپ سے ایکا تھا تو وہ سیرت گروپ ہی تھا۔ کبھی کبھار وہ چاروں سیرت گروپ کے ساتھ کمبائنڈ اسٹڈی کے لئے اس طرح مل جاتیں کہ یہ چار اور وہ چار آٹھ کا ایک گروپ بن جاتا۔۔۔ ابھی بھی گاڑی چھوٹی تھی ورنہ وہ آٹھوں اکھٹے ہی ایک گاڑی میں ٹھس ٹھس کر آ ہی جاتیں لیکن ایسے ہچکولے کھاتے، سر ٹکراتے، کمر اکڑاتے رستے پہ وہ یہ رسک نہیں لے سکتی تھیں۔ ورنہ سیرت گروپ کی انشراح کافی حد تک تحریم جیسی ہی تھی۔۔۔ جیسے "کُم" کے میلے میں بچھڑی بہنیں یا کرن ارجن۔ اس کے ساتھ مل کر تحریم وہ وہ انت مچاتی تھی کہ وہ تینوں اور یہ تینوں اپنی اپنی ناک بچانے کے لئے ان دونوں سے الگ ہونا ہی پسند کرتیں۔ یقیناً ان کی گاڑی میں بھی کچھ ایسا ہی سماں بندھا ہونا تھا۔

اشو وادی میں پہنچ کر پانی کی بوتلیں بھرنے کے لئے وہ رکے تھے۔ نیچے ایک لکڑی کا کا نیچ تھا جہاں وہ کچھ دیر کے لئے اترے تھے۔ وہاں سے دریا کا پانی بالکل قریب سے گزرتا تھا۔ اتنا ٹھنڈا اور ٹھاٹھیں مارتا کہ دیکھ کر ایک پل کو خوف آتا تھا۔ پورا دن بھی وہاں بیٹھا جاتا تو دن کا ضیاع نہ ہوتا وہ ایسی ہی پرسکون جگہ تھی۔ لیکن یہاں تو جا بجا ایسی جگہیں تھیں وہ کہاں کہاں ٹھہرتے۔ یہاں کا حسن ہی ایسا تھا کہ ہر مقام پہ گھنٹوں بتانے کا دل چاہنے لگتا۔ لیکن انھیں آگے بڑھنا تھا کہ ان کی منزل مہوڈھنڈ جھیل تھی۔

رستے میں جگہ جگہ گلیشئر کو کاٹ کر گاڑیوں کے لئے رستہ بنایا گیا تھا۔ انھی گلیشئر میں سے پانی نیچے سے بہتا ہوا آ رہا تھا۔ منظر کچھ یوں تھا کہ ان کے دائیں بائیں سفید گدلا گلیشئر تھا اور بیچ میں سے گزرتی گاڑیاں۔

"اف دل کر رہا ہے یہاں اتر کر وہ گانا گاؤں۔ یہ عشق ہائے بیٹھے بٹھائے جنت دکھائے۔"

تحریم گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی جھوم اٹھی۔ باقیوں نے اسے کہنیاں مارتے، چونٹیاں کاٹتے ہوئے انسان بن جانے کا اشارہ کیا کہ گاڑی میں ایک عدد ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اسی لئے بہتر یہی تھا کہ وہ اپنا شو پھر کسی وقت کے لئے بچا رکھے۔ یوں بھی انھیں تو اس کے اس قسم کی شو دیکھنے کی عادت سی ہو گئی تھی ان ساڑھے چار سالوں میں۔۔۔ تحریم منہ بسورتی، ان کے اشارے سمجھتی، بوتھیاں بناتی خاموشی سے

بیٹھ گئی لیکن اندر کا رقاص کسی طور چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

اشو سے کچھ آگے نکل کر ہی بہت بڑی آبشار تھی جہاں گاڑی روکی گئی۔ اوپر سے گرتا پانی سڑک پہ سے ہوتا نیچے گر رہا تھا۔ سڑک تو اب رہی نہیں تھی۔ پتھروں کا کچا پکا رستہ ہی تھا جس میں سے گاڑیاں گہرے پانی سے ہوتے ہوئے گزرتی تھیں۔

وہ سب آبشار کے کنارے کنارے اوپر چڑھنے لگے۔ آئینور نے ان سب کو جانے دیا اور خود نیچے ہی ایک پتھر پہ بیٹھ گئی۔ پانی سے تو وہاں بیٹھ کر بھی محظوظ ہوا جا سکتا تھا۔

''میں یہیں ہوں آپ کے ساتھ۔'' عباد اپنے دوستوں کو بھیج کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔

''ارے نہیں۔ آپ جائیں پلیز۔ انجوائے کریں۔ میں بالکل اوکے ہوں۔'' وہ اپنی وجہ سے اس کا ٹرپ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''بالکل نہیں۔ آپ ذمہ داری ہیں میری۔ آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا میں۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ آئینور ٹھٹکی۔ وہ ہمیشہ سے ایسے ہی پرواہ کرنے والے انسان کا روپ دھار لیتا تھا۔ وہ جب سے اسے جانتی تھی وہ ایسا ہی تھا۔

''ویسے بھی کون سا میں پہلی بار یہ جگہیں دیکھ رہا ہوں۔ ہمارا گاؤں یہیں منگورا میں ہے۔ بچپن سے اس قسم کے ٹرپ دیکھ رہا ہوں۔ کبھی فیملی کے ساتھ کبھی دوستوں کے ساتھ۔ حفظ ہیں یہ جگہیں مجھے۔'' آئینور ہولے سے مسکرا دی۔ دل میں پھر سے کہا۔

''سواتی منڈا۔''

''میں ان چار سالوں میں آپ کو جو سمجھتا تھا اب لگتا ہے کہ آپ ویسی نہیں ہیں۔''

''اور آپ کیسا سمجھتے تھے۔؟'' آئینور نے کچھ حیرت سے سر پیچھے کو کرتے اپنے سے اوپر بیٹھے عباد کو دیکھا۔ جو پینٹ فولڈ کر کے اب پانی میں پاؤں اتار رہا تھا۔

''پراؤڈ۔ گھمنڈی۔'' آئینور مسکرا دی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کی خاموشی اور لئے دیے انداز پہ سب ایسا ہی سمجھتے تھے۔ بس اس کی فطرت تھی کہ وہ لوگوں میں جلدی گھلتی ملتی نہیں تھی۔ پہلے

خاموشی سے دوسروں کا مشاہدہ کرتی پھر سوچتی کہ اگلا جس فطرت کا ہے اس سے ویسا ہی پیش آیا جائے۔

''میں ایسی ہی ہوں۔'' اس نے رخ موڑ لیا۔ کوئی اسے ایسا سمجھتا ہے تو سمجھے۔ اسے خود کی کوئی وضاحت نہیں دینا تھی۔ یوں بھی یہ کون سا پہلا تبصرہ تھا۔ وہ اس قسم کے تبصرے کئی لوگوں کے منہ سے اپنے لئے سن چکی تھی۔

''آپ ایسی نہیں لگیں مجھے۔ جب انسان کچھ وقت ساتھ گزارتا ہے، بات چیت کرتا ہے تو ہی جان پاتا ہے کہ دوسرا کیسا ہے۔ اوران دودنوں نے میری پچھلی رائے کو تبدیل کر دیا ہے۔''

''شاید ماحول کا اثر ہے کہ میں عام حالات سے ذرا مختلف دکھائی دے رہی ہوں۔ پہاڑوں میں آنے سے ایک عجب تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ یہاں آنے سے پہلے مجھے نہیں پتا تھا کہ زندگی ایسی بھی ہوتی ہے۔ اتنی سادہ اور مختصر سامان کے ساتھ۔۔۔ شاید لوگ علاقوں کے حساب سے مزاج رکھتے ہیں۔ پہاڑوں کی سختی ان لوگوں کو بھی جفاکش اور سخت بنا دیتی ہے۔ لیکن اپنی اس سختی اور مضبوطی سمیت یہ لوگ پھر بھی پہاڑوں جیسے خوبصورت ہی ہیں۔ مہمان نواز اور اندر سے سادہ معصوم۔ میں بس مسحور ہی ہو رہی ہوں یہاں آ کر۔۔۔'' اس نے رستے میں کتنے ہی بچوں اور بوڑھوں کو دیکھا تھا جو کاندھوں پہ لکڑیاں اٹھا اٹھا کر پہاڑوں پہ مہارت سے چڑھتے تھے۔ اور مزاج اتنا خوش اخلاق کہ مسکراتے ہوئے سیاحوں کو ہاتھ ہلاتے۔ ان کے چہروں کی خوشی بتاتی کہ وہ اپنے علاقے میں آئے مہمانوں کو دیکھ کر کتنا خوش ہیں۔ حالات کی سختی ان کے چہروں پہ رقم نہیں تھی جیسے وہ اس زندگی سے بالکل خوش باش ہوں اور وہ تو یہی سوچے جاتی تھی کہ وہ یہاں رہتے کیسے ہیں۔؟ اتنی مشکل زندگی تھی جو یقیناً سردیوں کی آمد کے ساتھ مشکل ترین ہو جاتی ہوگی۔

وہ خاموشی سے اس کی بات پہ مسکرا دیا۔

''اگر آپ بد دماغ اور مغرور ہوتی تا آئینور تو اس ہوٹل والے چھوٹو کی عزت نفس کی اتنی پرواہ نہ کرتی کہ کاغذ میں لپیٹ کر اسے پیسے دیتیں۔ مغرور لوگ صرف اپنی پرواہ کرتے ہیں۔ دوسروں کے لئے کبھی اتنا نہیں سوچتے۔''

''آپ کو کس نے کہا۔؟'' وہ وہاں نہیں تھا اسی لئے وہ حیران تھی کہ اسے کیسے پتا چلا کہ وہ ہوٹل والے بچے کو ٹپ دے کر آئی تھی وہ بھی اس طریقے سے۔

''میں نے وہ کاغذ آپ کے بیگ سے جھانکتا دیکھ لیا تھا شالز والی شاپ پہ جو آپ نے ہوٹل والے بچے کو دیا تھا۔ تو اس کا صاف مطلب ہوا کہ وہ آپ ہی تھیں جس نے اسے ٹپ دی تھی۔'' اس کے لب ''اوہ'' والے انداز میں کھلے۔

اس نے بیگ میں سے وہی پیپر نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ عباد اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ایک چمکدار، موٹی جلد کا کاغذ، جس کے کونے میں تین الفاظ پہ مبنی لفظ لکھا تھا۔ شکر۔ اگر یہ اس کے شکر کا انداز تھا تو اسے یہ انداز بہت پیارا لگا تھا۔

''یہ میرا اسکنیچر پیپر ہے۔ اسے میں خود بناتی ہوں۔'' وہ کچھ حیران ہوا۔

''آپ پیپر بھی بنا لیتی ہیں۔؟'' وہ خاموش ہوگئی۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ کیا کیا بنا لیتی ہے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور ضرورت کی ماں مسائل ہوتے ہیں۔ جب مسائل کھڑے ہوتے ہیں، ضرورت پڑ ہی جاتی ہے اور ضرورت ایجاد کروانے میں خاصی ماہر ہے۔

''یہ پیپر میرے پاس ہر جگہ ساتھ ہوتا ہے کیونکہ اسے میں کئی مقاصد کے لئے استعمال کر لیتی ہوں۔'' عباد نے واپس اس کی طرف بڑھا دیا۔

''ہماری ایک اسکول ٹیچر ہمیں سمجھاتی تھیں کہ کبھی کسی کو بھی صدقہ دینا ہو تو چھپا کر دیا کریں۔ کسی کاغذ میں لپیٹ کر تاکہ اسے لیتے ہوئے اپنا آپ برا نہ لگے اور ہمیں دیتے ہوئے اپنا آپ بڑا نہ لگے۔''

عباد نے داد طلب نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بہت مختلف مزاج کی لڑکی تھی یہ وہ ہمیشہ سے جانتا تھا۔

''پھر تم کہتی ہو کہ تم مغرور رہو۔ گھمنڈی لوگ دوسروں کی ایسے پرواہ کرتے ہیں کیا۔؟'' وہ یکدم ''آپ'' سے ''تم'' پہ آ گیا۔ آئینور خاموش ہوگئی۔ اسے مخالف صنف کا یوں مخاطب کیا جانا کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ لیکن اس وقت عباد کے منہ سے اپنے لئے ''تم'' سننا اسے اتنا برا نہیں لگا تھا۔ وجہ وہ نہیں جانتی تھی۔ شاید اسی لئے کہ وہ ہمیشہ سے اسے باقی ہم جماعتوں سے الگ رکھتی تھی۔ وہ باقیوں

جیسا نہیں تھا۔ ایسی انفرادیت کی وجہ اسے خود بھی نہیں معلوم تھی۔ شاید وجہ ان کی وہ پہلی پہلی ملاقات تھی جس نے اس کا ایک تاثر جو قائم کیا تھا وہ اب تک قائم تھا۔ بس وہ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ جنھیں دل سب سے الگ مان لیتا ہے تو کچھ ایسا ہی تھا۔

خاصی دیر وہ خاموشی سے باقی سب کو اوپر چڑھتے، چلاتے دیکھتے رہے۔ وہاں کی خاموشی بھی حسین تھی اور وہ دونوں کافی دیر سے بس خاموش تھے۔

''تمہیں وہ پہلا دن یاد ہے جب ہم کالج میں ملے تھے۔؟'' یکدم عباد نے پوچھا تو وہ کچھ حیران ہوئی۔ نجانے پہلا دن کہاں سے اسے یاد آ گیا تھا۔ آئینور نے گہری سانس لی۔ وہ کیسے اس دن کو بھول سکتی تھی۔ اسے ایک ایک لفظ ازبر تھا۔ نہ صرف پہلی ملاقات کا بلکہ کالج میں گزرا ہر وہ وقت کہ جس میں اس نے وقت سے لڑنے میں بہت مشقت اٹھائی تھی، کئی محاذ پہ لڑی تھی، کئی دریا پار کیے تھے۔۔۔ وہ بھلا کیسے یہ وقت بھول سکتی تھی۔

میڈیکل کا وہ پہلا دن تھا اور دو ڈھائی سو کی کلاس میں بس ایک چہرہ ہی شناسا تھا۔ اس کی اسکول کی جونیئر سمیرا کنول۔ لیکن اس نے دیکھا تھا کہ اس کے ساتھ پہلے سے دو لڑکیاں موجود ہیں۔ شاید وہ اس کی کالج کی سہیلیاں ہوں گی کیونکہ کالج میں وہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اتنے ہم جماعت تھے کہ پانچ سال تو ان کے نام ہی یاد کرنے میں لگ جانا تھے۔ یہ اورینٹیشن ویک تھا جس میں سینئرز جونیئرز کو پکڑ پکڑ کر ان کی فولنگ کرتے تھے۔

وہ کلاس میں جان بوجھ کر سمیرا کے برابر بیٹھ گئی تاکہ اس سے سلام دعا کر سکے۔ وہ اکیلے ہونے سے گھبرا رہی تھی اسی لئے کسی کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ اس کے سلام پہ سمیرا چونکی۔

''تم تو آئینور ہو نا۔ تم میری سینئر نہیں تھی۔۔۔؟'' وہ نہ صرف اسے پہچان گئی تھی بلکہ یہ تک یاد تھا کہ وہ اس سے ایک سال آگے تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اب اس کے ساتھ کیسے ہو گئی اس بات پہ اس کا سوال تو بنتا تھا۔

''میں نے ایک سال ڈراپ کیا تھا۔''

''اچھا وہ کیوں۔؟'' اس ''وہ کیوں'' کا جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ یہ ایک طویل جدوجہد کی کہانی تھی جو وہ کسی کو نہیں سناتی تھی۔ اسے لوگوں کو کہانیاں سنانا پسند نہیں تھا خاص کر جب وہ کہانی آپ کی اپنی زندگی کے بارے میں ہو اور آپ اس کے مرکزی کردار ہوں۔

''کچھ فیملی ایشوز تھے۔'' اس نے ہونٹ سکوڑے اور اس کا تعارف اپنی سہیلیوں سے کروایا اور تب سے ان چار لڑکیوں کا جو گروپ بنا تو پانچ سال گزر گئے تھے۔

دوسرے دن وہ ابھی کلاس کے لئے جا ہی رہی تھی کہ اسے سینئرز نے گیٹ کے پاس ہی جالیا۔

''نام۔؟'' وہ تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

''آئینور۔'' اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ نجانے وہ کیا کرنے والے تھے۔

''پورا نام بتاؤ۔'' ایک مائی منڈا قسم کی لڑکی ببل گم چباتی ہوئی سینے پہ ہاتھ باندھے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اس نے تھوک نگلا۔

''آئینور فاطمہ گل۔''

''مطلب کیا ہے آئینور کا۔؟'' ایک سینئر اس کی گھبراہٹ کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

''چاند کا ہالہ۔'' اس کی آواز لڑکھڑا نہ جائے اسی لئے وہ مٹھیاں بھینچ کر خود پہ قابو پانے کی کوشش میں ہلکان تھی۔ اسی سینئر کے ہونٹ ''واؤ'' والے انداز میں کھلے جیسے وہ اس کے نام سمیت اسے بھی سراہ رہا ہو۔ وہ سخت گھبراہٹ کے ساتھ غیر آرام دہ بھی تھی۔

''اپنی کوئی خوبی بتاؤ لڑکی۔'' دوسری لڑکی اب اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔

''محنتی ہوں۔''

''کتنی محنتی۔؟'' وہ انھیں نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ اتنی محنتی ہے کہ جس جگہ آج وہ کھڑی ہے اس کے پیچھے ایک طویل جدوجہد ہے۔ وہ سب امتحانات میں نمبروں کے لیے محنت کر کے وہاں پہنچے تھے لیکن آئینور فاطمہ گل نے نمبروں کے لیے الگ محنت کی تھی اور میڈیکل کالج کے اخراجات پورے کرنے کے لئے الگ۔۔۔

''کسی بھی ہدف کو پورا کرنے کے لئے مشقت اٹھا سکتی ہوں۔''

''تو آئینور فاطمہ گل! کچھ محنت اب ہمارے لئے کر کے دکھاؤ۔ تھوڑی سی مشقت کا مظاہرہ ہمارے لئے بھی کر ڈالو۔ ہم بیچاروں کے لئے کچھ محنت سے کما کر لاؤ۔'' نام کا مطلب پوچھنے والے لڑکے نے مسکین سی صورت بنا کر اپنے باقی ساتھیوں کو آنکھ ماری۔ نجانے وہ کیا کروانے والے تھے اس سے۔

''وہ سامنے جو لڑکوں کا گروپ ہے اس کے پاس جاؤ اور اس سبز شرٹ والے لڑکے سے پانچ سو کا نوٹ لے کر آؤ۔ آج ہمارا پارٹی کرنے کا پلان ہے۔ لیکن تم نے ہمارا نام نہیں لینا۔ یاد رکھو کہ ہمارا نام لیا تو ہمیں پتا لگ جائے گا اور تمہیں پانچ سو کی بجائے پانچ ہزار لا کر دینا ہوں گے۔'' اس نے مڑ کر گروپ کو دیکھا، تھوک نگلا کہ وہ لڑکوں کا گروپ تھا۔ لڑکوں سے بات کرتے اس کی جان جاتی تھی۔ اسی گروپ میں ایک سبز شرٹ والا لڑکا بہت انہماک سے دوسرے لڑکے کی بات سن رہا تھا۔

وہ سر ہلا کر مرے مرے قدموں سے اس گروپ کی طرف چل دی۔

''اگر اس نے دینے سے انکار کر دیا تو میں کہاں سے دوں گی۔ میرے پاس تو اس وقت جتنے پیسے ہیں وہ سب بھی دے دوں تو اتنے نہیں بنتے۔ اور سب دے دوں گی تو واپسی کا کرایہ کہاں سے لاؤں گی۔؟'' دل میں توڑ جوڑ کرتی وہاں تک پہنچی۔

''ایکسکیوز می۔'' اس نے سبز شرٹ والے کے قریب پہنچ کر کہا۔ اس سمیت سارا گروپ پلٹا تھا۔ اب سب کی نظریں اس پہ تھیں اور آئینور کی زمین پہ۔۔۔ اسے لگا تھا کہ دل بند ہو جائے گا۔

''مجھے پانچ سو کا نوٹ مل سکتا ہے کیا۔؟ ضروری چاہئے۔''

''مگر میں آپ کو نہیں جانتا۔'' اس نے ذرا اجنبیت سے کہا تو آئینور کے پسینے چھوٹ گئے۔

''جانتی تو میں بھی نہیں ہوں لیکن مجھے آپ کی مدد چاہئے۔'' سفید اور کالی دھاریوں والی قمیض پہ سفید دوپٹہ سر کے گرد سختی سے لپیٹے وہ اتنی معصوم صورت تھی کہ عباد اس کی بات پہ مسکرا دیا۔ اس کے چہرے پہ بڑا ابڑا اکنندہ تھا کہ میں ''فول بنائی جا رہی ہوں، خدارا اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ میری مدد کیجئے۔''

''کیوں چاہئے۔؟ گھر سے خالی بیگ لے کر نکلی تھیں کیا۔؟'' اس بار ساتھ والے لڑکے نے کہا تو آئینور کو سخت شرم محسوس ہوئی۔ دل کیا اپنا بیگ مضبوطی سے تھامے اور بھاگتی ہوئی گیٹ سے نکل جائے لیکن ایسا ناممکن تھا۔ اسے اس کالج میں پڑھنا تھا تو سب جونیئرز کی طرح یہ سب تو برداشت کرنا ہی تھا۔

''فرسٹ ایئر۔؟'' سبز شرٹ والے لڑکے نے پوچھا تو اس نے زور وشور سے سر ہلایا۔

اس نے ہپ پاکٹ سے والٹ نکالا اور اس میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ آئینور نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ ایک نرم سا تاثر تھا۔

''میں واپس دے دوں گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کلاس فیلوز ہیں۔ کل میں پھنسا تو کیا خبر آپ مجھے بچالیں۔'' اس نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اتنا خود اعتماد لڑکا اس کا کلاس فیلو تھا۔ اسے تو لگا تھا کہ وہ کوئی سینئر ہے۔

''پکڑ لیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرا ارادہ بدل جائے۔'' آئینور نے جھٹ سے نوٹ تھام لیا۔

نوٹ لے کر شکریہ تک نہیں بولا گیا اور جلدی سے پلٹ گئی۔ نوٹ اس گروپ کو دیا تو اس کی جان چھوٹی۔ اب تیزی سے وہ کلاس کی طرف بڑھ گئی۔ بعد میں وہی لڑکا اسے کلاس میں دکھائی دے گیا تھا، جسے دیکھتے ہی اس نے جھٹ سے رخ پھیر لیا۔

اسی دن کالج سے واپسی پہ سڑک پار کرتے وہ لڑکا پھر سے اسے سامنے شاپ پہ دکھائی دیا جہاں وہ اپنے دستاویز کاپی کروانے آئی تھی۔

''تھینک یو اینڈ سوری کہ میں اس وقت جلدی میں آپ کو شکریہ نہیں بول سکی۔''

''اتنی سی بات کے لئے اب شرمندہ ہو کر مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔''

''میں کل ہی آپ کو پیسے لوٹا دوں گی۔''

'' آئے دن آپ فول بنتی رہیں گی۔ کسی سے پیسے لیں گی اور کسی سے چیزیں۔ کب تک انھیں لوٹاتی رہیں گی۔ جو بات ہوگئی تو بس ہوگئی۔ جانے دیں۔ بس ایک مشورہ ہے کہ اکیلے مت پھریں۔ جہاں جائیں گروپ کی صورت میں جائیں ورنہ پکڑے جانے کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔'' اس کا انداز

بالکل بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ خواہ مخواہ اس سے فری ہونے کی کوشش میں ہے۔ لڑکی دیکھ کر ضرورت سے زیادہ خوش اخلاق ہو رہا ہے۔ ایچڑ ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔۔۔ نرمی اور مخلصی کی برقی رو اس کی جانب سے اٹھتی محسوس ہوئی جو آئینور نے ہمیشہ اس کی ذات سے سب کے لئے محسوس کی تھی۔

اس دن کے بعد سے وہ سمیرا اور اس کی دوستوں کے ساتھ ہی رہی تھی۔ وہ سب گیٹ پہ اکٹھی ہوتیں اور اندر جاتیں جب تک یہ اورینٹیشن ویک چلتا رہا تھا جو کہنے کو تو ایک ویک تھا لیکن ایک ہفتے بعد بھی سینئرز نے نئے آنے والے چوزوں کی جان نہیں چھوڑی تھی۔

تو یہ اس کی سموئیل عباد سے پہلی ملاقات تھی جو اسے ہمیشہ اس طرح یاد رہی کہ اس نے ایک انجان لڑکی کی مدد کی تھی۔ وہ دل میں اسے اپنا محسن مانتی تھی جس نے اسے وہاں مدد دی تھی جہاں اگر وہ پھنس جاتی تو بڑی مشکل میں آسکتی تھی اور اپنے محسنوں کی اس نے ہمیشہ قدر ہی کی تھی۔

وہ ہمیشہ سمیرا اور اس کی دوستوں کا ساتھ دیتی تھی لیکن اپنے طریقے سے۔ وہ جب بھی کہیں آؤٹنگ یا لنچ کا پلان بناتیں آئینور معذرت کر دیتی۔ کیفے جانے کی بات ہوتی تو وہ بیگ سے اپنا لفن نکال لیتی کہ اسے باہر کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اس کے کپڑے بالکل سادہ ہوتے تھے۔ رنگ دار قمیض کے ساتھ سفید شلوار اور سفید یا کالا دوپٹہ۔ یہ تو وہی جانتی تھی کہ اس کے پاس ہر قمیض کے ساتھ یہی شلوار اور دوپٹے ہیں۔ بس قمیض اس نے چار پانچ سلوالی تھیں اور شلوار دوپٹہ وہی چلا لینے سے ایک نیا سوٹ بن جاتا تھا۔ کچھ رطابہ اور رائمین کے پرانے کپڑے تھے جو اس نے ایک درزن سے اپنے ناپ کے کروا لئے تھے۔ کالج وہ لوکل ٹرانسپورٹ پہ آتی جاتی تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود اسے کسی قسم کا احساس محرومی نہیں تھا۔ یہ گورنمنٹ کا میڈیکل کالج تھا اور یہاں ملے جلے طبقات کے طلباء پڑھتے تھے۔ اس سمیت نجانے کتنے سفید پوش گھروں کے طلباء ہوں گے جو اپنا بھرم رکھتے ہوں گے۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ ایسے طلباء کے لئے نجانے کتنے محاذ تھے جن پہ انھیں لڑ کر اپنا بھرم قائم رکھنا پڑتا تھا۔

''آئینور کچھ پراؤڈ سی نہیں ہے۔؟'' اس دن وہ سیڑھیوں پہ بیٹھی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھیں جب آئینور پروفیسر دانیال کے آفس سے واپسی پہ ان کی طرف جا رہی تھی۔ شیشے کے دروازے

کے پار وہ انھیں دیکھ سکتی تھی لیکن وہ اندر سے آنے والے کو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ دروازہ کھلا تھا اور وہ باہر نکلنے ہی لگی تھی جب صدف کا جملہ اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ وہ ٹھٹک گئی۔ ایک پل کو اس کی سانس تھم سی گئی۔ وہ تینوں کیا اسے زیر بحث لائی ہوئی تھیں۔

وہ وہیں ٹھہر گئی تھی۔ اسے باقیوں کا جواب سننا تھا کہ کیا وہ سب اسے ایسا سمجھتی ہیں۔

"مجھے بھی لگتی ہے۔ اسکول میں بھی وہ ایسی ہی تھی۔ زیادہ تو میں اسے جانتی نہیں کیونکہ وہ مجھ سے سینئر تھی لیکن جب بھی دیکھا اسے ایسے ہی روڈ سا تاثر دیتی تھی جیسے نجانے خود کو کیا سمجھتی ہو۔ اصل میں سکول کے لئے آرٹ اینڈ کرافٹ میں بہت ٹرافیز اور میڈلز جیت کر لائی تھی تو ٹیچرز اسے بہت سر چڑھاتے تھے۔ اسی لئے ہمیں یہیں لگتا تھا کہ اس کا دماغ آسمانوں پہ ہے۔ بلکہ مجھے ابھی بھی یہی لگتا ہے کہ وہ یہی چاہتی ہے کہ اسے اب بھی ویسے ہی سر پہ بٹھایا جائے جیسے سکول میں بٹھایا جاتا تھا۔ اب یہاں میڈیکل میں تو آرٹس کا کیا کام۔۔۔؟" سمیرا کی رائے گو کہ مختلف نہیں تھی لیکن اس کی رائے میں اصل تضحیک تھی، حسد تھا۔ آئینور نے بے یقینی سے سب سنا۔

"وہ بس کم گو اور اپنے آپ میں رہنے والی لڑکی ہے۔ شاید کسی حد تک وہ مشکلات سے گزر کر یہاں تک آئی ہے تبھی ایسی ہے۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ اسے گھمنڈی کہا جا سکتا ہے۔ کم از کم مجھے وہ بالکل بھی پراوڈ نہیں لگتی۔" تحریم جو سب میں ویسے تو لاپرواہ اور کچھ لاابالی مشہور تھی لیکن جب بھی اس سے کسی سنجیدہ موضوع پہ رائے یا مدد مانگی جاتی تو وہ ایسی بات کر جاتی کہ زندگی کے نجانے کتنے مشکل دور گزار کر آئی ہو جو اس کے اندر سمجھداری کا ایسا مادہ موجود ہے۔ آئینور کو یہی لگتا تھا کہ وہ بظاہر زندگی سے بھرپور، شرارتی، لاابالی دکھائی دینے والی لڑکی اندر سے بہت حساس اور سمجھدار ہے۔

"میں پراوڈ ہوں۔؟" وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ان میں سے کسی نے اسے پیچھے کھڑے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑے ہو کر سوچنے لگی تھی۔ شاید اس کی لئے دیے والی فطرت اور کم گوئی انھیں ایسا سوچنے پہ مجبور کر گئی تھی۔ بھلا غرور کرنے کے لئے اس کے پاس محنت اور ذہانت کے اور تھا ہی کیا۔؟ یہ دو چیزیں تو یہاں نجانے کتنوں کے پاس تھیں تبھی تو وہ ایک معیاری میڈیکل کالج میں داخلہ لے پائے

تھے۔ یہ سچ تھا کہ سکول میں اساتذہ اس سے الگ برتاؤ کرتے تھے۔ بہت فخر کرتے تھے۔ وہ سب کی چہیتی تھی لیکن اس وقت بھی یہ سب اس کا دماغ خراب کیے ہوئے نہیں تھا۔

اس نے سر جھٹکا۔ گہرا سانس لیا۔ خود کو سمجھایا کہ جو جیسا سوچتا تھا، سوچتا رہے۔ وہ ایسی نہیں ہے جو وہ کہہ رہی ہیں اور جیسی وہ ہے کوئی نہیں جانتا۔ اسے کسی کے ٹائٹل اور سرٹیفکیٹ کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ وہ یہاں پڑھنے آئی تھی، دوسروں سے خود پہ لیبل لگوانے نہیں۔

''یہ عباد گروپ ہے۔ جنھوں نے کل مجھے سر مصدق کے نوٹس دیے تھے۔'' اس دن وہ گھاس کے قطعے پہ بیٹھی پڑھ رہی تھیں جب قریب ہی ایک گروپ آ کر بیٹھا تو تحریم نے سرگوشی کی۔

''انھیں کون نہیں جانتا بھلا۔؟ کلاس میں سب میں مشہور ہیں یہ پانچ کہ ہمیں ہمارے باپوں کے نام سے پکارو۔ مطلب سر نیم سے۔ یہ رؤف کا نام کوئی رؤف نہیں ہے۔ تیمور نام ہے اور باپ کا نام رؤف ہے۔ اور یہ عباد دراصل سموئیل ہے لیکن اباجی کے نام سے مشہور ہونا چاہتا ہے۔ خاقان کا نام مکرم ہے۔ رہبر دراصل تنویر ہے اور مجاہد کا نام بلال ہے۔'' تحریم نے ہلکی آواز میں کہا جسے باقی سب نے بآسانی سن لیا۔

''اپنا منفرد اسٹائل بنانے کا طریقہ ہے اور کچھ نہیں۔'' سمیرا نے ناک سکوڑی۔

''لیکن مجھے اچھی نیچر کے لگتے ہیں یہ سب۔'' تحریم نے کہا تو سمیرا نے تپ کر منہ بنایا۔

''تمہیں تو ہر دوسرا لڑکا ہی اچھا لگتا ہے۔ یہاں کسی لڑکے نے مدد کی نہیں وہاں وہ اچھا ہو گیا۔۔۔ ویسے بھی لڑکوں کو یہی طریقے آتے ہیں لڑکیوں کو امپریس کرنے کے کہ ان کی فوراً مدد کر دی جائے۔۔۔''
سمیرا کو ویلکم پارٹی کے بعد سے اس گروپ سے خاص عناد تھا جو ان تینوں کی سمجھ میں کبھی نہ آ سکا۔ وہ کبھی اس گروپ کے لئے اچھے الفاظ ادا کر ہی نہیں سکتی تھی۔

تحریم ان کی نسبت خود کو ذرا دل پھینک کی ثابت کرنے کی کوشش میں رہتی تھی حالانکہ وہ ایسی تھی نہیں۔ ''ہائے میری شادی کب ہو گی، کب ہاتھ پیلے ہوں گے، نجانے کون میرے سر کا تاج بنے گا، بس مجھے تو ایک ہینڈسم اور کیئرنگ کا بندہ چاہیئے'' جیسے جملے وہ ہر دن میں دو تین بار تو بول ہی جاتی تھی۔ گو

وہ یہ سب مذاق میں کہتی تھی اور یہ بات جلد وہ سمجھ گئی تھیں کہ اسے کوئی شادی وادی یا لڑکوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ یہ سب وہ یونہی مزاح کے لئے ہانکتی رہتی تھی۔۔۔اور اب وہ اس کی ان باتوں پہ محض اس کا ساتھ دیتی اسے چھیڑتی ہی تھیں۔

"خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔۔۔کل اتنی آسانی سے مجھے سر مصدق کے نوٹس دے دیے ورنہ ہم کہاں سے ارینج کرتے۔اور تو اور مستقبل میں بھی دینے کی بات کر دی کہ جب چاہئے ہوں لے جایا کروں۔اور ایسا نہیں تھا کہ خواہ مخواہ چیکو ہو رہے تھے لڑکی دیکھ کر۔بڑے ڈیسنٹ طریقے سے آفر کی تھی۔بلکہ میرے ساتھ یہ آفر وہ موٹے گولے رضوان کو بھی کی تھی جو ہر وقت کلاس میں اونگھتا رہتا ہے اور بعد میں فقیر بنا در در نوٹس مانگتا رہتا ہے۔اسے بھی فوراً سے اسے رہبر نے اپنے بیگ میں سے نوٹس نکال دیے تھے۔وہ کسی کی بھی مدد لڑکی دیکھ کر نہیں کرتے،بس کر دیتے ہیں۔مجھے تو لگتا ہے کہ اچھے ہیں سارے۔نہیں۔؟" اس نے تصدیق کے لئے سب کی طرف دیکھا تو سب اپنی کتابیں کھول کر مصروف نظر آنے کی اداکاری کرنے لگیں۔جیسے ان سے رائے نہ ہی مانگی جائے تو اچھا ہے۔

"دفع ہو جاؤ منحوسو۔آئندہ جو نوٹس ملیں گے۔خود کاپی کروا کر انھیں واپس کر دوں گی اور تم لوگوں کو بھنک بھی نہیں پڑنے دوں گی۔" اس کے پھولے ہوئے گالوں کو صدف نے دونوں ہاتھوں سے کھینچتے اسے "کوچی کوچی کو" کیا تو وہ اس کے ہاتھوں کو پرے کرتے ہوئے ان پہ ہلکے ہلکے تھپڑ مارنے لگی۔

وہ تینوں ہنس پڑیں تو تحریم بھی مسکرا دی۔

☆......☆......☆

"آپ نے پاپا سے بات کی۔؟" وہ ٹی وی کو خاموش کیئے اس پہ سری لنکا پاکستان کا کوئی میچ دیکھ رہا تھا۔بچے ریشم کے ساتھ قریبی پارک گئے ہوئے تھے۔سر درد کی وجہ سے وہ ان کو گھمانے نہیں لے جا سکا تھا ورنہ ہر ویک اینڈ یہ اس کا معمول تھا کہ وہ بچوں کو خاص وقت دیتا تھا۔

"کون سی بات۔؟"

"گھر کی بات اور کون سی بات۔؟" وہ وارڈ روب سے وہ سارے کپڑے نکال رہی تھی جو اسے

استری کے لئے بجھوانا تھے۔

"نہیں کی اور نہ ہی کروں گا۔" اس نے دوٹوک جواب دیا۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ ہلکے ہاتھوں سے سر کو دبا رہا تھا۔

"وجہ۔ آخر مسئلہ کیا ہے بات کرنے میں۔؟" اس نے ہاتھ روک کر شوہر کو دیکھا۔

"کیا بات کروں ان سے میں۔؟ ان کی زندگی میں ہی ان سے پراپرٹی میں حصہ مانگنے بیٹھ جاؤں کیا۔؟"

"پراپرٹی میں حصے کی بات کون کر رہا ہے۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ ریٹارمنٹ پہ جو گھر انھیں ملا ہے وہاں شفٹ ہونے کی بجائے وہ اس گھر کو سیل کر دیں اور بحریہ میں ہمارا گھر بنوانے میں کچھ رقم انویسٹ کر دیں۔ پھر ہمارے ساتھ ہی شفٹ ہو جائیں۔"

"پاپا نہیں مانیں گے۔" اپنے باپ کو وہ جانتا تھا اور ان سے ڈرتا بھی تھا۔ اسی لئے ایسی کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا جو انھیں ناراض کرے۔

"ابھی بھی تو وہ ولید کے ساتھ فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ رہ لیں گے تو کیا مسئلہ ہے۔؟" وہ جانتی تھی کہ ولید اور اس کی بیگم سے اس کے سسر کی زیادہ بنتی تھی۔ ولید اس کا جیٹھ تھا اور اس کی بیگم لائبہ ورکنگ ویمن ہونے کے ساتھ ساتھ پورا گھر اچھے سے سنبھالتی تھی۔ اس کی عادات اس کے سسر کو بڑی پسند تھیں۔ رطابہ کی اسی ایک بات پہ اس سے حتی کہ سسر تک سے نہیں بنتی تھی کہ وہ لائبہ کی زیادہ طرف داری کیا کرتے تھے۔ لیکن اس نے کبھی اپنے رویے میں بدلاؤ لانے کا تردد نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے سسر کو ڈاکٹر بہو پہ زیادہ فخر ہونا چاہئے تھا بہ نسبت ٹیچر بہو کے۔ آخر وہ ایک ریٹائرڈ فوجی تھے۔ انھیں کیا نہیں پتا تھا کہ سٹیٹس نام کی بلا میں ایک یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ آپ کے بچے، بہوئیں ڈاکٹر ہوں۔

"فی الحال میرے پاس اتنی سیونگز نہیں ہیں کہ میں گھر بنانے کا سوچ بھی سکوں۔ جو کچھ بھی تھا ایک پلاٹ لینے پہ لگا دیا۔ اب مزید گھر کے لئے کہاں سے لاؤں۔ میں اتنا نہیں کماتا کہ ماہانہ لاکھوں لگا

بھی دوں اور بچا بھی لوں۔''

''لاکھوں خرچ نہیں کرتے ہم اور مجھ پہ بھلا کیا خرچ کرتے ہو تم جو بات بات پہ جتانے بیٹھ جاتے ہو۔'' اس کے تلخ جملے پہ دانش نے اسے تاسف سے دیکھا۔ اس عورت سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کا سر درد ہی بڑھ جانا تھا اسی لئے وہ خاموش ہو گیا۔

''پاپا سے بات کرو۔ انھیں منانے کی کوشش کرو۔ اگر تم بات نہیں کرو گے تو پھر میں کروں گی۔''

''تم کوئی بات نہیں کرو گی پاپا سے رطابہ۔'' سختی سے لب بھینچے اسے تنبیہہ کی گئی جسے رطابہ نے شانے اچکاتے گویا دور پھینکا۔

''میں تو کروں گی۔ حق ہے ہمارا ان کی پراپرٹی پہ۔ تم اسی طرح بیٹھے رہو گے تو ولید اور لائبہ ساری پراپرٹی ہضم کر جائیں گے۔''

''کس حق کی بات کر رہی ہو رطابہ بیگم۔ حق کی بات وہ کرتے ہیں جو فرائض پورے کرتے ہیں۔ کون سا فرض نبھایا ہے تم نے آج تک بہو ہونے کا۔ وہاں تم کہتی ہو کہ وہ تمہارا فرض نہیں ہے اور پراپرٹی کی بات پہ تمہارا حق بن جاتا ہے۔'' اس کا سر درد مزید بڑھ گیا تھا۔ شاید جن مردوں کی بیویاں ایسی ہوتی ہیں وہ مستقل سر درد کا شکار رہتے ہیں۔ شاید اسی لئے ہمیں ایسی دعا سکھائی گئی ہے جس میں ایسی بیوی سے پناہ مانگی گئی ہے جو وقت سے پہلا بوڑھا کر دے۔

''وہ میری ذمہ داری نہیں ہے۔ آپ کی ہیں۔ اور پراپرٹی میں حق بھی آپ کا ہے جو مانگنے کی بات کر رہی ہوں۔ اور ان فیکٹ میں تو پراپرٹی میں حق کی بات نہیں کر رہی۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ وہ ہمارے گھر بنانے میں کچھ کنٹری بیوٹ کریں۔ بھلے بعد میں وہ آپ کو حصہ نہ دیں۔'' اب وہ اس عورت سے کیا بحث کرتا کہ بی بی یہ پراپرٹی میں حصہ لینا ہی ہوتا ہے جسے وہ الفاظ کے پیراہن سے آراستہ کر کے پیش کر رہی ہے۔

دانش ہی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ اس میں مزید اس عورت کی باتیں سننے کا یارانہ تھا۔ دراصل وہ عورت ہی اس کا ''سر درد'' تھی۔

پھر اس نے پاپا سے بات تو نہیں کی لیکن نجانے کیوں انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والے گھر میں شفٹ ہو رہے ہیں جو ایک عرصے سے کرایے پہ چڑھا رکھا تھا۔ گھر خاصا بڑا تھا اسی لئے ان کے دونوں بیٹے اوپر نیچے کے پورشنز میں الگ الگ رہ سکتے تھے۔ دانش نہیں جانتا تھا کہ رطابہ کے دل میں کیا سمایا تھا لیکن حیران کن بات تھی کہ وہ بنا کسی بحث کے اس گھر میں رہنے پہ آمادہ ہو گئی تھی۔

''تم وہاں جا کر رہو گی۔؟'' اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

''تو کیوں نا رہوں۔؟ میرے سسر کا گھر ہے۔ جب ولید اور لائبہ رہ سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں۔؟'' شاید وہ جیٹھ جیٹھانی کے مقابلے میں ایسا کر رہی تھی۔ دانش کو یہی لگا تھا۔

''وہ جگہ تمہیں ہاسپٹل سے دور پڑے گی۔''

''میں ہاسپٹل چینج کر رہی ہوں۔ مجھے مریم ہاسپٹل سے اچھی آفر آئی ہے۔ میں وہاں جوائن کر رہی ہوں۔'' اس نے اس ہسپتال کا نام لیا جو اس کالونی سے بہت قریب تھا جہاں پاپا کو گھر ملا تھا۔ دانش کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔

''بچوں کے اسکول کا کیا ہو گا۔؟''

''وہیں قریبی برانچ میں شفٹ کروا لیں گے۔ اٹس ناٹ آ پرابلم۔۔۔'' وہ ہر مسئلے کا حل سوچے بیٹھی تھی یہ بات حیران کن تھی۔

''آر یو شیور۔؟'' رطابہ نے شانے اچکائے۔

''کم از کم اس رینٹ کے گھر سے جان چھوٹے گی اور کچھ سیونگ ہاتھ آئے گی۔'' دانش نے ایک گہری سانس لی۔ وہ عورت کوئی بھی کام غرض سے خالی نہیں کرتی تھی۔ لیکن یہ سب بے حد حیران کن تھا کہ وہ اکھٹے رہنے کے لئے مان کیسے گئی ہے۔ پھر جلد ہی اسے پتا چل گیا کہ ولید کو اسی کمپنی کی طرف سے جہاں وہ کام کرتا تھا سنگاپور میں پوسٹ آفر ہوئی تھی۔ وہ سنگاپور جا رہا تھا اور جلد ہی اپنی فیملی کو بھی وہیں بلوا لے گا۔ ایسے میں پاپا پیچھے اکیلے رہ جاتے۔ رطابہ کے پاس یہ سب سے مناسب وقت تھا اپنے

اور پاپا کے درمیان موجود دیوار گرانے کا اور یقیناً یہی سب سوچ کر وہ یہاں سے شفٹ ہونے کے لئے مانی تھی۔

دانش کو اس دن تسلیم کرنا پڑا کہ وہ کبھی اس عورت کی عقل تک وقت سے نہیں پہنچ سکتا تھا جو ہر بات میں اپنا مفاد ہی سوچتی تھی۔

☆......☆......☆

مشکل وقت آپ کو مارنے کے درپے ضرور ہوتا ہے مگر ایسے وقت میں لڑنا بالآخر رستے نکال ہی لیتا ہے۔ ابھی تک رستے بن رہے تھے جن پہ چلنے کا سامان وہ ساتھ رکھتی تھی لیکن مشکل وقت مزید مشکل ہوا چاہتا تھا۔

جن دو ڈیلرز کے ساتھ وہ کام کر رہی تھی انھوں نے یکدم اس سے معذرت کر لی۔۔۔ مطلب اسے صاف بتا دیا کہ اب وہ اس کے ساتھ مزید کام نہیں کرنا چاہتے۔ وہ بذاتِ خود ان سے ملنے گئی تھی۔ انھیں قائل کرنے کی اپنی سی کوشش کرنے۔ وہ اس کے کام سے مطمئن تھے لیکن انھیں اس سے بھی سستے میں کام کرنے کے لئے کوئی نئے کاریگر مل گئے تھے۔ وہ کم پیسوں میں بڑا آرڈر کم وقت میں پورا کر کے دے رہے تھے اسی لئے اب وہ اس کے ساتھ کام کو سراسر گھاٹے کا سودا گردان رہے تھے۔ وہ ان کی شکل ہی دیکھ کر رہ گئی۔ اب وہ اس سے بھی سستے میں کام کرتی تو پھر گھاٹے کا سودا اس کے ہاتھ آتا۔ یہ کاروباری دنیا تھی، جہاں ہر کوئی اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔

میڈم شیریں نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ نئے ڈیلرز کو اس کا کام دکھائیں گی اور جلد اسے کسی اور جگہ سے کام مل جائے گا۔ فی الحال وہ ایک بک شاپ کے ساتھ کام کر رہی تھی جو اسے ہینڈ میڈ چیزوں کے چھوٹے موٹے آرڈر دے دیتی تھی۔۔۔ وہ مایوس نہیں تھی کہ یہ شیطان کا ہتھیار ہے اور شیطان کو ہی زیب دیتا ہے۔ اسے اس ہتھیار کو پکڑنے کی کوئی حسرت تھی۔ وہ ان راستوں کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی تھی جو اللہ نے ایک دوسرے کے آگے پیچھے اس کے لئے چھپا رکھے تھے۔

بک شاپ کے چھوٹے موٹے آرڈر پورے کرتے، ہمدان کو پڑھاتے، اکیڈمی آتے جاتے

کلاس لیتے ، ہر جگہ وہ دل میں یہی دعا کرتی تھی کہ اسے مزید کام مل جائے اور وقت اپنی میعاد کو اس پہ طویل کر دے۔ تمام معاون گھڑیوں کی سوئیوں کو اس کیلئے آہستہ چلائے تا کہ وہ اپنا ہدف پورا کر سکے۔

''لگتا ہے کام ختم ہو گیا تمہارا۔؟ چار دن کا چاؤ تھا، اتر ہی گیا۔'' رطابہ کا کام بس طنز کرنا ہی رہ گیا تھا۔

''لاکھوں جمع نہیں ہو سکے۔؟ اب تم ڈاکٹر کیسے بنو گی۔ چہ چہ چہ۔'' کام نہ ہونے کی صورت میں وہ مٹی کی بجائے کمرے میں رہتی تو یہ زہر پینے کو ملتا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ عین انھی دنوں میں جب اس کے پاس کام نہیں تھا، رطابہ کا چکر میکے میں لگا تھا اور اس کی باتیں اور مسکراہٹیں فاطمہ کا دل جلا گئی تھیں۔ یہ اس کی بہن تھی، اس کی سگی بہن جو سب سے بڑی تھی اور اپنی سب سے چھوٹی بہن سے یہ سب کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی ناکامی پہ خوش ہو رہی تھی صرف اس لئے کہ وہ اس کی برابری نہ کر لے۔ اس کی طرح ڈاکٹر نہ بن جائے۔ حالانکہ اس کا مقام کون سا کم ہو جانا تھا اگر فاطمہ ڈاکٹر بن جاتی تو لیکن کہانی تو وہی ابلیس کے حسد کی تھی۔ آدم کی تخلیق سے ابلیس کے اس رتبے میں کوئی کمی تھوڑا ہی آ گئی تھی جو جن ہو کر فرشتوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ لیکن اسے حسد بس اس بات کا تھا کہ میرا جیسا کوئی اور کیوں۔؟ جو میں ہوں وہ کوئی اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔؟ میری برابری پہ کسی کو بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے بھلا۔؟ اپنی وہی حاسدانہ فطرت اس نے بنی آدم میں بھی زور و شور سے منتقل کرنے کی پوری کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی ٹھہرا ہے۔

''شاید کسی نے آئینہ دکھا دیا ہے۔'' رطابہ طنزیہ مسکرا کر، کہہ کر گزر گئی۔

لوگ اور لوگوں کی باتیں۔ اف۔

تنقید کرنے والا آپ کو دو طرح سے سکھاتا ہے۔ خاموش رہ کر برداشت کرنا، جواب دے کر دفاع کرنا۔ یہ تنقید سننے والے پہ منحصر ہے کہ وہ کسے چھوڑتا اور کسے اپناتا ہے۔ رطابہ نے اسے دونوں طریقے سکھا دیے تھے۔

اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ نہ بہن سے نہ اللہ سے۔ ابھی کشتیاں کہاں جلی تھیں۔؟ رستے کہاں رکے تھے۔؟ امیدیں کہاں تمام ہوئی تھیں۔؟ پھر وہ کیوں سوال اٹھاتی۔؟

انسان کو دعا کرنے کا حق دیا گیا ہے، شکوہ کرنے کا نہیں ۔ اور انسان دعا چھوڑ کر جو کام سب سے پہلے کرتا ہے وہ شکوہ کرنے کا ہی کرتا ہے۔

برے وقت سے گزرنے کے لئے آپ کو اکثر مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ ڈھیٹ بھی بننا ہوتا ہے۔ سنو، دیکھو اور یوں ہو جاؤ جیسے گونگے ہو۔ بہترین طریقہ، بہترین ترکیب ۔ بار بار جواب دینے سے آپ تھکنے لگتے ہیں اور دوسروں کے لئے خواہ مخواہ خود کو تھکاوٹ میں مبتلا نہیں کرنا چاہئے۔

جب جب وہ پارک جاتی وہاں سامان بیچتے بچے اسے سکھاتے کہ ہم بھی تو ہیں جن کا کام روز نہیں چلتا، مال روز نہیں بکتا مگر ایک دن نہ بکنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگلے دن بھی ایسا ہو گا۔ محنت کی قیمت کم ہی سہی، دیر سے ہی سہی، وصول ہو ہی جاتی ہے۔ اپنے اندر برکت رکھتی ہے۔ سو کوئی سو سے ضرب دیتی ہے لیکن کبھی صفر نہیں ہوتی ۔ اللہ نے اس کے لئے ضرب ہی تخلیق کیا ہے، نہ اس سے کم نہ زیادہ، بس اس ضرب کا وقت تعین ہے۔۔۔ کبھی یہ ضرب ساتھ ساتھ ہوتا جاتا ہے اور کبھی ایک ہی بار یکدم۔

"آپ اب اداس رہتی ہیں۔" ہمدان منہ میں چین دبائے اسے یونہی بیٹھا دیکھ رہا تھا۔

"کس نے کہا یہ۔؟"

"ہمدان نے خود ہمدان سے کہا ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"اور ہمدان نے کیوں ہمدان سے یہ کہا۔؟"

"اب آپ ہنستی کم اور سوچتی زیادہ ہیں اور چاچو کہتے ہیں کہ زیادہ سوچنے والے پریشان ہوتے ہیں۔" اس کی مسکراہٹ کچھ سمٹی تھی۔

"بطخ بننا بھی بھول گئی ہیں۔ نہ اس کی دعا کرتی ہیں۔"

"اب مجھے بطخ نہیں بننا۔" دل مسوس کر اس نے کہا۔

"کیوں نہیں بننا۔ جو بننے کا سوچو وہ بن کر ہی دم لو یہ چاچو کہتے ہیں۔ ویسے کیا آپ کو سوئمنگ آتی ہے۔؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو بطخ بن کر تو آپ ڈوب جائیں گی اور سب کا نام ڈبوئیں گی۔ پھر نیوز میں آئے گا دنیا کی

پہلی بطخ جو ڈوب گئی۔" وہ یکدم ہنس دی۔ ہنستے ہنستے اس نے ہمدان کو دیکھتے سوچا۔

"کچھ لوگ نعمت سے کم نہیں ہوتے۔" ہمدان ایسی ہی نعمت تھا۔

دو ہول سیل ڈیلرز نے اس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔۔۔ معاوضہ وہ معقول دے رہے تھے۔ کام بھی مشکل نہیں تھا۔ اسے کینڈل میکنگ اور فوٹو فریمز کے ساتھ ان ڈور فاؤنٹین کی ورائٹی بھی تیار کرنا تھی۔ اس کا ٹرینڈ دن بدن بڑھتا جا رہا تھا سو

ڈیمانڈ بھی۔ یہ کام وہ پہلی بار کرنے جا رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ یہ نہیں کر پائے گی۔

"تم یہ بھی کر لو گی۔۔۔" میڈم نے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ ساتھ میں کچھ سی ڈیز ڈھونڈ کر دی تھیں کہ وہ انھیں جا کر دیکھے اور ان سے سیکھے۔

"ہمیں غلط یا صحیح مشورہ دینے والا دوست تقدیر کا قاصد ہوتا ہے۔" (واصف علی واصف۔)

میڈم نے کہا تھا وہ کر لے گی تو اس نے اسے قدرت کا اشارہ جانا تھا۔ استاد کے منہ سے نکلا ہر حرف شاگرد کے لئے متاع ہوتا ہے۔

اسی روز وہ اکیڈمی سے جلدی گھر جانے کے لئے نکل آئی تھی۔ سردیاں رخصت ہونے کو تھیں سو مغرب اب دیر سے ہوتی تھی۔ اس کا دل کیا کہ کچھ دیر پارک میں جا کر بیٹھے، ٹھنڈی آئسکریم کھا کر کچھ پیسے اڑا کر خوشی منائے، چھوٹے بڑے جھولوں پہ بیٹھ کر کچھ دیر کو ہی سہی چھوٹی بچی بن جائے۔ ابھی وہ قصد ہی کر رہی تھی کہ پاؤں پہ جوتی کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی اور یکدم اس کا سائیڈ اسٹریپ نکل گیا۔ اب اسے ٹوٹے اسٹریپ سے گھر جانا بھی مشکل تھا، پارک کیا جاتی۔

"کم بخت۔ ابھی ہی ٹوٹنا تھا۔" دل میں اسے کوستے ہوئے اس نے وہیں فٹ پاتھ پہ بیٹھ کر اسٹریپ کو واپس ڈالنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ پاؤں کا دباؤ پڑنے پہ وہ پھر سے نکل آتا تھا۔ اب اس ٹوٹے جوتے میں پاؤں ڈال کر لنگڑانے سے بہتر تھا کہ وہ جوتا ہاتھ میں لئے پیدل چل پڑتی۔

"تو کیا ہوا جو ننگے پیر چلنا شروع کر دوں۔ ہر بندے کا زندگی میں کبھی نہ کبھی جوتا ٹوٹتا ہے۔ وہ اسی طرح شرمندہ ہوتا ہے۔ مزید جوتا اس کے پاس بھی نہیں ہوتا تو وہ ننگے پیر ہی چلتا ہے یا ٹوٹے ہوئے

جوتے میں پاؤں ڈال کر اسے گھسیٹتا ہے۔'' خود کی ڈھارس بندھاتے وہ دونوں جوتے ہی ہاتھوں میں لے چکی تھی۔

آج وہ ہمدان کی مس ہونے کا پورا ثبوت دے گی۔ اس کی طرح سڑک پہ بنا جوتے کے چل کر ایک نیا ٹرینڈ سیٹ کرے گی، پھر کیا پتا کوئی ہالی ووڈ نہ سہی بالی ووڈ سے اسے بھی بلوا لے۔ اس بارے میں سوچ کر ہی اسے ہنسی آ گئی۔ تبھی ایک کرولا تیزی سے اس کے قریب سے گزری اور یکدم اسے بریک لگی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ پیچھے کو آنے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں لاحول پڑھا۔ جھک کر جوتا اٹھاتے ساتھ ایک پتھر بھی چپکے سے اٹھا لیا تاکہ اسے آنے والے کے سر پہ بجا سکے۔

''ایکسکیوز می۔ اینی پرابلم۔؟'' گاڑی کا شیشہ نیچے کیے ایک ڈیشنگ سا نوجوان اس سے پوچھ رہا تھا۔

''بڑا ہمدرد بن رہا ہے۔ نہ منہ نہ متھا، جن پہاڑوں لتھا۔'' اس نے دل ہی میں سوچا اور اسے نظر انداز کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے سنا ہی نہ ہو۔

''میں آپ سے مخاطب ہوں مس۔ آئی مین ہمدان کی مس۔'' ایسا نظر انداز کیا جانا نوجوان کو بڑا ہی کھلا تھا سو اب ذرا زور سے بولا کہ اگر وہ بہری وہری ہے تو اچھے سے سن لے۔ ہمدان کا نام سنتے ہی وہ اچھل پڑی۔ پورے دیدے پھاڑ پھاڑ کر اس کا جائزہ لیا۔ اس سے پہلے اس نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''یہ کیسے جانتا ہے کہ میں ہمدان کی ٹیوٹر ہوں۔؟ کیا ہمدان اتنا مشہور ہے یا اسے پڑھانے سے میں مشہور ہو گئی ہوں۔'' منہ میں من من کرتے اس نے خود سے پوچھا لیکن یہ پوچھا جانا بڑے بڑے سنہری حروف میں اس کے ماتھے پہ لکھا گیا جو سامنے گاڑی میں بیٹھے اس لڑکے نے بخوبی پڑھ لیا۔

''میں ہمدان کا چاچو ہوں۔ شمشاد۔''

''آئے ہائے بھری جوانی میں ایسا نام جیسے کارینا کی گولی چبالی ہو۔'' اس نے 'اوہ' کے انداز میں ہونٹ سکوڑے اور سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

''میں آپ کو چھوڑ دوں۔؟ آپ کا پاؤں شاید زخمی ہے۔'' اس نے سرسری سی نگاہ اس کے ننگے

پیروں پہ ڈالی۔ پھر ہاتھ میں تھامے جوتوں پہ لیکن شاید اس کی خفت مٹانے کے لئے اپنے جملے میں ترمیم کر ڈالی۔

''نجانے پاؤں زخمی ہونے اور جوتا ٹوٹنے میں سے زیادہ بے عزتی والی بات کون سی ہے۔؟ شاید جوتا ٹوٹنا۔'' اس نے لڑکے یعنی چاچو کو ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اور دل ہی دل میں حساب کتاب کرتے سر اثبات میں ہلا ڈالا کہ ہاں اس کا پیر ہی زخمی ہے۔ پھر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگی۔

''if you dont mind......... آگے بیٹھ جائیں کیونکہ میں آپ کا ڈرائیور نہیں ہوں۔''

''اویں۔'' وہ بھی ڈھیٹ بن کر پیچھے کا دروازہ کھول کر دھپ سے بیٹھ گئی۔ ہوتے ہوں گے ایسے ادب آداب اس کی بلا سے۔ وہ کیوں بھلا ایسے آداب نبھائے جو اس کی نظروں میں بے ادبی کے مترادف ہوں۔ منہ شیشے سے باہر نکال کر وہ مزید ڈھیٹ بن گئی۔

''عجیب لڑکی ہے۔'' وہ بھی بڑبڑاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔

''عجیب بھی ہوں اور غریب بھی۔'' وہ بھی منہ میں بڑبڑاتے دوپٹہ منہ پہ کئے باہر دیکھنے لگی۔

''ہمدان کیسا جا رہا ہے۔؟''

''لو اب سارا رستہ سوالنامہ حل کرنا پڑے گا۔'' برا سا منہ بناتے اس نے تپ کر سوچا۔

''اچھا۔'' اجنبی لوگوں سے وہ یوں بھی بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی اور خاص طور پہ جب وہ مرد ہوں۔

''گڈ۔ آپ کی بہت باتیں بتاتا ہے۔ آپ سے بھی یقیناً ہم سب کی کرتا ہوگا۔ اسے بولنے کی بہت بیماری ہے۔''

''خاندانی بیماری لگتی ہے۔'' دل میں اس نے سوچا اور جواباً خاموش رہی۔

''اس کا رزلٹ بہت زیادہ امپرو ہوا ہے۔ ذہین تو وہ بلا کا ہے بس دھیان نہیں دیتا۔ بھابھی کہہ رہی تھیں کہ وہ آپ کی فیس بڑھا دیں گی۔ آپ بہت جان مار رہی ہیں اس پہ۔''

''آئے ہائے پہلی بات اچھی کی ہے۔ ویسے اتنا برا بھی نہیں ہے اب ہمدان کا چاچو۔'' اندر ہی اندر وہ خوش ہوتے دوپٹے کو رخسار پہ گرائے مسکرا دی۔

''جی شکریہ۔'' اب اتنی آداب سے خالی تھوڑا ہی تھی کہ تعریف پہ شکریہ بھی نہ کہتی۔

''میں ہی بولے جا رہا ہوں۔'' وہ خود ہی کہہ کر مسکرا دیا۔

''ہمدان کے چاچو جو ٹھہرے، بولنا تو تمہارا ہی بنتا ہے۔'' اتنے میں گھر آ گیا۔ وہ شکریہ ادا کرتی جلدی سے اتر گئی لیکن وہ تو گاڑی سمیت وہیں جم گیا۔

''اب کیا اندر آ کر چائے پینے کا ارادہ ہے۔؟ لیچڑ کہیں کا۔'' بیل پہ اس نے ہاتھ رکھا تو ہٹانا بھول گئی کہ کھل بھی چکے گیٹ۔ امی نے دروازہ کھولا اور حیرت سے سامنے کھڑی گاڑی کو دیکھا۔

''السلام علیکم آنٹی کیسی ہیں آپ۔؟'' امی کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی رمق جاگ اٹھی تھی۔

''ویسے تو کبھی سلام نہیں کیا ہو گا آنٹی کے بھانجے نے۔ آج ہی ساری کسر نکالے گا۔'' تپتی ہوئی وہ امی کے ایک طرف سے نکل کر اندر چلی گئی۔

''تم شمشاد کے ساتھ آئی ہو۔؟'' امی نے اندر داخل ہوتے ہی پہلا سوال یہی پوچھا تو اس کا موڈ مزید بگڑ گیا۔

''میرا جوتا ٹوٹ گیا تھا رستے میں۔'' دو سال پرانی چپل کے اب بھی ٹوٹ جانے کا اسے دکھ تھا۔ بھلا کتنا ساتھ نبھاتی معصوم۔؟

''کام کرنے کی اجازت اعتماد کر کے دی ہے تمہارے ابا نے۔ محلے میں تماشا بنانے کے لئے نہیں۔'' وہ امی کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

بھلا اس نے کہاں کوئی تماشا کیا تھا۔ اب ٹوٹی چپل میں پیر ڈالے وہ چلنا شروع کرتی تو کل ہی گھر پہنچتی۔ لیکن یہاں کسے اس کے مسائل کی پرواہ تھی۔ بتا بھی دیا تھا کہ چپل ٹوٹ گئی پھر بھی ایسی بات کہہ دی۔

امی کبھی اس کی مشکلات نہیں سمجھتی تھیں۔۔۔ منہ بنائے وہ کمرے میں چلی گئی۔

دو دن بعد آرڈر اسے مل چکا تھا۔ ان ڈیلرز کے ساتھ کام کر کے اسے بہت منافع ہوا تھا۔ ایک کام بگڑے تو اگلا کام سنور ہی جاتا ہے۔ بند در پہ کوئی در کھل بھی جاتا ہے کیونکہ اللہ کا در کبھی بند نہیں ہوا

کرتا۔ جب قدرت آپ کو ایک مٹی سے اکھاڑتی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے کہیں آپ کے لئے زیادہ زرخیز مٹی تیار کر رکھی ہے جو خوب پیداوار دے گی۔

اب وہ اپنی کسی تکلیف کا تذکرہ میڈم شیریں سے بھی نہیں کرتی تھی۔ وہ کتنا جمع کر چکی ہے اور کتنا کرنا ابھی باقی ہے یہ اس کا سردرد تھا۔ انسان کی تکلیف اتنی ارزاں نہیں ہوتی کہ وہ اسے یوں عریاں کرتا پھرے۔ عریانی ہمیشہ تماشا ہوتی ہے۔ لوگوں نے اسے دیکھا، سنا، تفریح سمجھا، تبصرہ کیا اور چل دیے۔۔۔ تماشا ختم۔

وہ پھر سے کام میں بے حد مصروف ہو چکی تھی۔ وقت کم رہ گیا تھا اور ہدف ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ اس سال اسے کالج میں ایڈمیشن لینا تھا۔ وہ یہ سال پھر سے ڈراپ نہیں کر سکتی تھی۔ جو کچھ ہونا تھا اب اسی سال ہونا تھا۔ ایڈمیشن دو مہینے بعد پھر سے شروع ہونا تھے۔

"مجھے کالج میں ایڈمیشن کے ساتھ بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔" جمع شدہ رقم اور حاصل وقت کا موازنہ کرتے اس نے سوچا تھا۔ اس کے پاس رقم ابھی خاصی کم تھی۔

پڑھائی کے دوران آرڈرز لینا ممکن نہ تھا۔ سو وہ ٹیوشنز پڑھا کر کام چلائے گی یہ اس نے سوچ لیا تھا۔ کتنی لڑکیاں گھروں کے کاموں اور پڑھائی کے ساتھ یہ کام کرتی تھیں، وہ بھی کر لے گی۔ ٹیوشن وہ ایسے بچوں کو پڑھائے گی جو اسے زیادہ فیس دے سکیں۔ یہ سب اس نے طے کر کے گھر کے باہر اور گلی کے نکڑ پہ ٹیوشن کا ایک چھوٹا سا پرچا لگا دیا تھا۔

اس دن ہمدان کالے رنگ کی ٹی شرٹ پہن کر آیا تھا جس پہ کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس نے غور نہیں کیا کہ وہ کام میں مصروف تھی۔ وہ آتے ہی پچھلے سبق کی دہرائی کرنے لگا۔ کسی بات پہ اس نے سر اٹھا کر ہمدان کو دیکھا تو اس کی شرٹ پہ نظر پڑی جس پہ

hard work is for people short on talent لکھا تھا۔

"یہ شرٹ۔" وہ الجھی۔

"یہ چاچو نے گفٹ کی ہے۔" وہ خوشی خوشی بتانے لگا۔ اپنی چھوٹی موٹی خوشیاں وہ بڑا پرجوش ہو

کر فاطمہ سے بانٹتا تھا۔

''اچھی ہے نا۔؟ مجھے بہت اچھی لگی۔''

فاطمہ کچھ دیر اپنا غصہ ضبط کرتی رہی لیکن پھر اس سے کہے بنا رہا نہیں گیا۔

''آج تو یہاں پہن آئے ہو، آج کے بعد یہ میرے سامنے کبھی مت پہننا۔''

ہمدان حیران رہ گیا۔ بھلا ایسی کیا بات ہوئی تھی جس پہ اتنا سخت رویہ اپنایا جاتا۔

وہ اسی وقت وہاں سے اپنی کتابیں سمیٹ کر بنا کچھ کہے چلا گیا تھا۔ آج وہ پھر سے اس دن جیسی فاطمہ لگی تھی جس دن اس کا واز جلا تھا۔ وہ اس دن کی طرح چیخی تو نہیں تھی لیکن غصے سے پڑے اس کے ماتھے کے بل، سخت لہجہ اور تیز چلتی سانس نے اسے وہ دن یاد کرا دیا تھا۔ وہ اس دن کی طرح روئی بھی نہیں تھی لیکن ہمدان کو لگا کہ وہ کچھ دیر وہاں اسی شرٹ میں بیٹھا رہا تو وہ رو بھی دے گی۔ وہ اس شرٹ سے اس کی نفرت نہیں سمجھ پایا تھا لیکن جو شے اس کے لئے قابل نفرت تھی، اسے وہ اس سے جلد از جلد دور کر دینے کے لئے وہاں سے چلا گیا تھا۔

پھر نجانے وہ کتنی دیر کام نہیں کر سکی۔ اسے شدت سے رونا آ رہا تھا لیکن وہ خود کو رونے سے روک رہی تھی۔

کیا سمجھتا تھا وہ لیچڑ انسان کہ ذہین لوگوں کے حصے میں کبھی محنت نہیں آ سکتی۔ ہر چیز انھیں بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے۔؟ وہ ذہین تھی لیکن قسمت نے اسے پارس کرنے کے لیے اس کے لئے یہی رستا چنا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ وہ اتنی محنت کر چکی ہے کہ بیٹھ بیٹھ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی گل چکی ہے۔ وہ شرٹ جو کھلے عام یہ کہہ رہی تھی کہ قابل لوگوں کو محنت کی ضرورت نہیں، گویا اس جیسے کئی قابل لوگوں کا مذاق اڑا رہی تھی جن کی ذہانت اور قابلیت محنت کے تڑکے کے بنا کام نہیں آتی۔

ہمدان کے جانے کے بعد وہ بہت دیر ضبط کرتے کرتے یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ کہیں اندر کام کی زیادتی، رقم کی اور وقت کی کمی نے آنسوؤں کو زیادہ کر دیا تھا۔ بات اتنی بڑی تھی ہی نہیں کہ یوں رویا جاتا، یہ تو اس کے حالات تھے جو اسے یوں رلا رہے تھے، بے بسی تھی جس کا اس کے

پاس حل ہو کر بھی جیسے حل نہیں تھا۔ اب اس بند باندھے سیلاب کو چھٹنا تو تھا ہی سو ایسے ہی سہی۔

اگلے روز وہ اس کے گیٹ پہ کھڑا تھا۔

"آپ نے ہمدان سے کہا کہ وہ اب یہ شرٹ نہ پہنے۔؟" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یقیناً ہمدان نے گھر جا کر بتا دیا ہوگا۔ بتا تا رہے اس کی بلا سے۔ یہ اس کا گھر تھا اور یہاں ہمدان اس سے پڑھنے آتا تھا سو اس کی مرضی کے تابع تھا۔ باہر جو بھی کرتا پھرے وہ اسے کیا۔

"وجہ جان سکتا ہوں۔؟" سینے پہ ہاتھ باندھے، آبرو اچکائے وہ پوچھ رہا تھا۔ مزاج برہم تھے۔

"یہ نہیں کہا کہ مت پہنے، یہ کہا کہ میرے سامنے مت پہنے۔" وہ اس کے لہجے سے بالکل نہیں ڈری تھی۔

"وہ یہاں آپ سے پڑھنے آتا ہے۔ اپنے کپڑے، جوتوں، بالوں پہ پابندیاں لگوانے نہیں۔ یہ اسکول نہیں ہے جہاں وہ آؤٹ یونیفارم چیزوں پہ فائن دیا جائے یا سزا سنائی جائے۔۔۔ میرا نہیں خیال کہ ہمیں آپ کے مشورے کی ضرورت ہے کہ وہ کیا پہنے، کیا کھائے، کیا پیئے۔ یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے، یہ سب دیکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ کے کہے کا اس پہ اتنا اثر ہوا کہ اس نے وہ ٹی شرٹ پھاڑ کر جلا دی۔ جانتی ہیں کتنی محبت سے اس کے لئے گفٹ لایا تھا۔ کتنا خوش تھا وہ اس گفٹ سے۔ وہ اپنے گفٹس کے ریپرز تک سنبھال کر رکھتا ہے لیکن آپ کی وجہ سے اس نے میرا گفٹ جلا دیا۔" تو بات یہ تھی کہ آگ تو دراصل اسے لگی تھی، شرٹ کو نہیں۔

"بول لیا آپ نے۔؟ کہہ دیا جو کہنا تھا۔؟" وہ خاموش ہوا تو اس نے بھی تلخی کو کاٹنے کے لئے تلخ لہجہ اپنایا۔

"آپ نے بولا، میں نے سنا۔ اب میں بولوں گی اور آپ سنیں گے اور جب میں بولوں گی تو آپ بالکل نہیں بولیں گے۔" شمشاد نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

"تو مسٹر شمشاد اس شرٹ پہ جو کچھ لکھا تھا وہ مجھے ٹیز کر رہا تھا۔ میرا مذاق اڑا رہا تھا وہ جملہ۔ میرے ہاتھوں کو دیکھیں جو کام کر کر کے ایسے ہو گئے ہیں جیسے ان میں انگنت سوراخ ہوں۔ جیسے جلد نہیں

سوکھی چمڑی چڑھا رکھی ہے میں نے ہڈیوں پہ۔ یہ سب میری محنت کا تحفہ ہے جسے میں جلا نہیں سکتی نہ ہی پھاڑ سکتی ہوں۔ مجھے انھیں سینے سے لگا کر رکھنا ہے۔اور یہ محنت میرا شوق نہیں مجبوری ہے۔اس لیے نہیں کہ میں ذہین نہیں ہوں، قابل نہیں ہوں بلکہ اس لئے کہ یہی رستہ میرے نصیب میں لکھا ہے۔ مجھے ڈاکٹر بننے کے لئے پہلے رقم جمع کرنی ہے اور پھر نمبروں کے لئے الگ سے محنت کرنی ہے۔ ذہانت بعض جگہ قسمت سے مار کھا جاتی ہے اور تب محنت آپ کو اوپر اٹھا دیتی ہے کیونکہ محنت کبھی ہار نہیں سکتی۔اور اسی ایک فلسفے پہ میری محنت کی کہانی آگے بڑھ رہی ہے۔" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن فاطمہ نے اسے کہنے سے روک دیا۔

"ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی مسٹر اس لئے آپ بالکل نہیں بولیں گے۔ میں نے ہمدان کی پرسنل لائف میں کبھی دخل نہیں دیا۔اس کی گرومنگ کو لے کر ٹوکا ہو، روکا ہو تو الگ بات ہے اور بحیثیت استاد وہ میرا حق ہے۔آپ جیسے بڑوں کو لگتا ہوگا کہ یہ استاد کا سردرد نہیں ہے لیکن میرے جیسے استاد کبھی بھی صرف پڑھائی پہ زور نہیں دیتے بلکہ وہ شاگرد کی پوری شخصیت پہ کام کرتے ہیں۔ کبھی ناجائز باتوں پہ نہ روکا ہے میں نے، نہ ٹوکا ہے۔ہاں! جو چیز بھی مجھے اپنی انسلٹ لگے گی میری پوری کوشش ہوگی اسے ہٹانے کی اور خود سے دور کرنے کی۔اور وہ شرٹ مجھے اپنی انسلٹ لگی تھی۔" اس کے خاموش ہونے پہ وہ خاموش ہی رہا، کچھ دیر اس کے ہاتھوں کو دیکھتا رہا اور پھر اسی خاموشی سے واپس چلا گیا۔وہ کچھ حیران ضرور ہوئی کہ وہ بنا کچھ بھی کہے وہاں سے چلا کیوں گیا تھا لیکن پھر سر جھٹک کر اندر چلی آئی۔

اندر آئی تو امی نے پھر سے اسے ایسے دیکھا جیسے اس نے بڑا جرم کیا ہو۔

"کیوں آیا تھا۔؟"

"ہمدان کا پوچھنے۔" اس سے زیادہ وہ کیا تسلی کرواتی ان کی۔

"اور یہ شرٹ کا کیا چکر ہے۔؟" اب وہ تھوڑا بہت سن چکی تھیں تو نجانے اس سے کیا سننا چاہتی تھیں۔ ساری کہانی وہ انھیں سنا نہیں سکتی تھی۔ایک عرصے سے ان ماں بیٹی میں کہنے سننے کا طویل سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔وہ بس کام کی بات ہی کرتی پائی جاتی تھیں۔

"کچھ نہیں۔" اور ہر "کچھ نہیں" کے پیچھے "بہت کچھ" ہوا کرتا ہے۔

''میں نے بہت مشکل زندگی گزاری ہے فاطمہ۔'' امی کی ہزار بار کی بتائی کہانی۔ نجانے اس سارے قصے میں ان کی مشکل زندگی کا تذکرہ کہاں سے کود پڑا تھا۔

''اور میں گزار رہی ہوں۔'' کوفت سے اس نے سوچا۔

''میری مشکلات میں اضافہ مت کرو۔''

''میری بھی امی۔'' ماں کی بات پہ اس نے دکھ سے سوچا۔

''تمہاری اس لڑکے سے دروازے پہ ملاقاتیں سوزبانیں کھولیں گی۔ کچھ ہماری ناک کی پرواہ کرلو۔''

اس نے بس ایک افسوس بھری نظران پہ ڈالی اور چلی گئی۔ شاید ہر ماں کی طرح امی کو بھی لگ رہا تھا کہ اس کا اس شمشاد سے چکر ہے۔ اتنا فالتو وقت نہیں تھا اس کے پاس کہ وہ ایسے چکروکر چلا کر برباد کرتی۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی میں ان کاموں کے لئے اتنا وقت ہوتا ہے۔ اس کے پاس تو اپنے کام کے علاوہ وقت ہی نہیں بچتا تھا۔

''لیکن وہ اتنی خاموشی سے کیوں چلا گیا۔؟'' یکدم اس کا ذہن الجھا۔ وہ جس موڈ کے ساتھ آیا تھا وہ خاصا جارحانہ تھا اور جب یہاں سے گیا تو بالکل بھُس ہو چکا تھا۔ یہ محض اس کی باتوں کا اثر نہیں ہو سکتا تھا۔

اور آنے والے دنوں میں اسے پتا چل گیا کہ وہ اتنی خاموشی سے کیوں چلا گیا تھا۔

ناول سپاس گزار کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 6

اس رات وہ دیر سے گھر آیا تو می جاگ رہی تھیں۔ ممی ہمیشہ اپنے بچوں کے لئے جاگتی رہتی تھیں۔ جب وہ پڑھائی کر رہے ہوتے تھے تو رات گئے تک ان کے کمرے میں دودھ، بادام، جوسز وغیرہ پہنچاتی رہتیں۔ وقفے وقفے چکر لگاتیں کہ کہیں کسی چیز کی انھیں ضرورت نہ ہو۔ ان کے امتحان ہوتے تو لگتا امتحان تو ممی کے ہیں۔ جب وہ انہیں پڑھاتی تھیں تو ان کی تمام کتابوں کے اسباق انہیں رٹے ہوتے تھے۔ پھر جب وہ کچھ بڑے ہو گئے اور خود سے پڑھنے لگے تو بھی ممی کو کم از کم یہ ضرور پتا ہوتا تھا کہ ان کے کس مضمون کے کتنے باب ہیں اور کون سا باب آسان اور کون سا مشکل ہے۔ امتحانات وہ دونوں دیتے تھے، نیند ممی کی اڑ جایا کرتی تھی۔ سموئیل ہنستا تھا کہ اگر ممی نے اپنے زمانے میں پڑھائی کی اتنی ٹینشن لی ہوتی تو چھوٹی موٹی ڈاکٹر تو وہ بھی بن ہی چکی ہوتیں۔ ممی ایسے میں اس کے سر پہ چپت لگا دیتیں۔

اب جبکہ وہ نوکری کر رہا تھا تو بھی ان کا یہی معمول تھا کہ جب تک وہ گھر نہ آ جاتا وہ جاگ رہی ہوتیں۔

''سو کیوں نہیں جاتیں ممی۔ اب میں بچہ تھوڑا ہی رہا ہوں کہ کھانا نکال کر اپنے لئے گرم نہ کر سکوں۔'' وہ ڈائننگ ٹیبل پہ ہی آ کر بیٹھا تھا۔ ممی اس کے سامنے کھانا رکھ رہی تھیں جب اس نے محبت سے ماں کو دیکھا۔ یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا، کم و بیش اسی قسم کا جملہ وہ ممی سے ہر دو دن بعد کہتا تھا۔

''جب کھانا گرم کر کے دینے والی آ جائے گی تو بے فکر ہو کر سو جایا کروں گی۔ لیکن تب تک یہ چوکیداری کرتی رہوں گی۔''

ان کی اس بات پہ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ جب سے علی اور منہا کا رشتہ طے ہوا تھا تب سے ممی

گاہے بگاہے اس کی شادی کی بات بھی کرنے لگ گئی تھیں۔ ان کے ایسے ذکر پہ یا تو وہ موضوع بدل دیا کرتا یا خاموش ہو جایا کرتا۔ ممی نے کتنی بار یہ محسوس کیا تھا کہ عموماً لڑکے اپنی شادی کے ذکر پہ جیسے خوش ہوا کرتے ہیں سموئیل نہیں ہو پاتا تھا۔ ایک سنجیدگی سی اس کے چہرے پہ طاری ہو جایا کرتی تھی۔ انہوں نے کتنی بار اس سے وجہ بھی جاننا چاہی لیکن وہ ہر بار بات بدل دیا کرتا، ٹال دیا کرتا۔ حالانکہ ممی سیدھا سیدھا اس سے اس کی پسند تک پوچھ چکی تھیں کہ اگر وہ کہیں بھی دلچسپی رکھتا ہے تو انہیں بتا سکتا ہے۔ انہیں اس کی پسند پہ کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور وہ بابا کو بھی منا لیں گی لیکن اس بات پہ بھی سموئیل کچھ بولنے کو تیار نہیں تھا۔

''ڈیٹ کب فکس کر رہے ہیں منہا کی۔۔۔؟'' علی اور فروا کے رشتے سے وہ خوش تھا۔ علی اس کا بچپن کا دوست تھا اور منہا اس کی اکلوتی بہن۔ بچپن سے دونوں گھرانوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا، کچھ ڈھکا چھپا نہیں تھا، علی کے مزاج سے وہ آشنا تھا اور پھر وہ منہا کو پسند بھی کرتا تھا تو اسے خوشی بھی رکھتا۔

''ہوپ فلی نیکسٹ ویک تک۔'' ممی اس کے سامنے ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔ عموماً وہ اسے کھانا دے کر کمرے میں چلی جایا کرتی تھیں۔ برتن وہ وہیں سنک میں رکھ کر چلا جایا کرتا تھا لیکن اس دن وہ خلافِ معمول وہاں بیٹھ گئی تھیں جس پہ سموئیل کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

''تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔۔۔؟'' وہ پھر اس سے وہی سوال دہرا رہی تھیں جس سے وہ کنی کتراتا تھا۔

''کچھ نہیں سوچا۔'' نوالہ منہ میں ڈالتے وہ نظریں جھکائے لاپرواہ انداز اپنانے کی کوشش میں تھا۔

''تو کب سوچو گے۔۔؟'' اگلے مہینے تنویر کی بھی شادی ہے۔ تیمور پچھلے سال ایک بچی کا باپ بھی بن گیا ہے اور تم نے ابھی تک سوچا بھی نہیں۔'' وہ رہبر اور رؤف کی بات کر رہی تھیں۔ ان دونوں کے اصل نام لئے اسے زمانہ ہو چلا تھا۔ ایسے میں ممی کبھی اس کے دوستوں کے اصل نام لیتیں تو اسے بڑی ہنسی آتی۔ ابھی بھی وہ اسی بات پہ ہولے سے ہنس دیا۔

''میں مذاق نہیں کر رہی ممی۔۔۔''

اس نے سر ہلایا۔ وہ کون سا ان کی بات کو مذاق لے رہا تھا۔ وہ تو کسی اور بات پہ ہنس رہا تھا۔

''تم اس موضوع پہ سنجیدہ کیوں نہیں ہو جاتے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو۔۔؟'' وہ انہیں کیا بتاتا کہ وہ اس موضوع پہ ہی تو سنجیدہ ہے، جو وہ چاہتا ہے، اسے تلاش کر رہا ہے۔ اس کی موجودگی کا احساس یہیں کہیں ہے لیکن وہ مل نہیں رہی۔

''کوئی لڑکی ہے تو بتاؤ۔'' ان کی بات پہ اس کا چلتا منہ رک گیا تھا۔ وہ انہیں کیا بتاتا کہ لڑکی وہ ہے جسے وہ خود کب سے ڈھونڈ رہا ہے تو انہیں کیا بتائے کہ کون لڑکی ہے۔

''جیسی بھی ہوئی تمہاری خوشی میں ہماری خوشی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کبھی اسٹیٹس کے پیچھے تمہاری خوشی کو کمپرومائز نہیں کروں گی۔'' شاید ممی کو لگا تھا کہ اس کی پسند ان کے معیار کی نہیں ہو گی اسی لئے وہ بتانا پسند نہیں کرتا۔

''ممی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو اگر کوئی پسند نہیں ہے تو پھر مجھے اپنی پسند کے مطابق چلنے دو۔ ایک دو بچیاں ہیں میری نظر میں جاننے والوں کی۔ بات چلانا چاہتی ہوں میں وہاں تمہاری۔۔''

''پلیز ممی مجھے کچھ وقت دیں۔'' اس نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی بھوک اڑ گئی تھی۔

''کتنا وقت سمی۔۔۔؟ تم مجھے وقت کی معیاد بتا دو۔'' یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ جواباً اسے خاموش ہونا پڑا۔

''اچھی لڑکیاں بہت دیر تک بیٹھی نہیں رہتیں۔ جوں ہی کوئی مناسب رشتہ آتا ہے والدین وہاں ہاں کر دیتے ہیں۔ اور میں اتنی اچھی بچیاں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی۔'' وہ جانتا تھا کہ وہ سماویہ کی بات کر رہی تھیں جو ان کی خالہ زاد کی بیٹی تھی۔۔۔ ڈاکٹر تھی۔۔۔ ماں باپ بھی دونوں ڈاکٹر تھے۔ لڑکی اچھی تھی بھلے ویسی نہیں تھی جیسی اسے چاہئے تھی لیکن ایسی گئی گزری بھی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ زندگی نہ گزاری جا سکے لیکن شاید وہ اس سے محبت جیسے عارضے میں مبتلا نہ ہو پاتا۔ محبت تو کسی کسی سے ہوتی ہے اور اسے جس سے ہوئی تو بس ہو گئی۔۔۔

''ممی بس کچھ وقت اور۔۔۔ میں جلد ہی آپ کو سب بتا دوں گا۔ آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاتا۔'' حالانکہ پچھلے کتنے سالوں سے وہ ان سے وہ سب چھپا رہا تھا۔

ممی نے گہری سانس بھری، اپنی کرسی سے اٹھ کر اسے گھسیٹا، اس کے سر پہ ہاتھ دھرا اور کمرے کی طرف چل دیں۔

وہ ابھی نہیں بتا سکتا تھا کہ جس کو پانا اتنا آسان تھا، اس نے اتنی آسانی سے اسے کھو دیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے پاس انہیں بتانے کے لئے چار سال پرانی کہانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ شاید وہ اس کہانی کو بھول بھی چکا ہوتا اگر سمیرا کا اس سے چند ماہ پہلے رابطہ نہ ہوتا تو۔۔۔

☆......☆......☆

آبشار سے واپسی پہ جب وہ سب نیچے اتریں تو اس سے پہلے ہی عباد ایک طرف ہو گیا تھا۔ شاید وہ سمیرا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا یا اپنی وجہ سے اسے غیر آرام دے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو بھی تھا لیکن سمیرا کے ماتھے کی سلوٹیں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔ آئینور چاہتی تھی کہ وہ اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کرے لیکن شاید سمیرا اس کے نام سے بھی خار کھاتی تھی۔ اسے کبھی سمجھ نہیں آ سکی کہ وہ اس کا دل کیسے صاف کرے۔ جو بھی غلط فہمی تھی اسے شروع ہوئے بھی اب پانچواں سال تھا۔ اب اسے ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہاں سے واپس جا کر سمیرا سے اکیلے میں بات کرے گی۔

''لگتا ہے عباد تو آئینور کی چوکیداری کے لئے آیا ہے۔۔۔'' گاڑی کی طرف بڑھتے یہ سمیرا ہی کا جملہ تھا جس نے اسے منجمد کیا تھا۔ گو کہ اس نے لہجے کو بالکل ایسے بنا لیا تھا جیسے وہ مذاق کر رہی ہو اسی لئے شاید کسی اور کو محسوس نہیں ہوا لیکن اسے برا لگا تھا۔

''سچ بتانا آئینور یہ ہائٹ فوبیا ہے یا کچھ اور۔۔۔'' تحریم نے یونہی اسے چھیڑا۔ تحریم کی ایسی چھیڑ خانی معمول کا حصہ تھی اسی لئے کبھی کسی کو بری نہیں لگتی تھی۔ وہ تو ہر دوسرا جملہ ہی ایسا بول جاتی تھی اور ہر کسی پہ بول جاتی تھی لیکن سمیرا اس قسم کے مذاق نہیں کرتی تھی اسی لئے آئینور کا برا منانا بنتا بھی تھا۔ لیکن وہ خاموش رہی تھی۔ اگر وہ اسے ٹکا سا جواب دے دیتی تو ابھی جو اس نے عباد اور سمیرا کی غلط

فہمی دور کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ کیسے پورا کر پاتی۔ اسی لئے وہ خاموش ہوگئی تھی۔

تمام گروپس گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ قریباً چالیس منٹ کے سفر کے بعد وہ مہوڈ ھنڈ جھیل پہنچ گئے تھے۔۔۔ پہاڑوں کے درمیان گھری سرسبز وادی جیسی، جس کی چراگاہوں میں مویشی چر رہے تھے۔۔۔ اونچے نیچے مگر سیدھے سیدھے درختوں کے جھنڈ جھیل کے وسط میں یوں کھڑے تھے گویا انہوں نے ایک چھوٹا موٹا جزیرہ بنا ڈالا ہو۔ گھاس کے قطعے پہ کئی سیاحوں کے خیمے بھی نصب تھے جو اپنا کھانا بھی وہیں پکا رہے تھے۔ جھیل میں کشتی رانی کا انتظام بھی تھا اور جھیل کنارے کئی سیاح گھڑسواری بھی کر رہے تھے۔

لڑکے جھیل کے کنارے تک جا پہنچے تھے اور لڑکیاں جھیل سے بہتی، گھاس کے قطعے کے وسط میں سے گزرتی، چھوٹی چھوٹی ندیوں میں ہی پیر لٹکائے بیٹھ گئیں۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ دس پندرہ سیکنڈ سے زیادہ پاؤں نہ ٹکتا تھا لیکن مزہ بھی اتنا آ رہا تھا کہ پاؤں نکالنے کا کسی کم بخت کا دل نہ کرتا تھا۔

دور ایک پٹھان بچہ جو لگ بھگ سات برس کا تھا، اسٹیل کی چھوٹی سی بالٹی اٹھائے کچھ بیچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس سے بھی چھوٹا بچہ اس جیسی بالٹی اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ وہ خاموشی سے لڑکیوں میں سے اٹھنے لگی جواب اونچی آواز سے گانے گا رہی تھیں۔ آئینور کا ایسی کسی محفل میں دل نہیں لگتا تھا۔ اس کی دلچسپی محنتی لوگ ہوا کرتے تھے۔ اور ابھی ابھی اسے ایک ایسا ہی محنتی بچہ دکھائی دیا تھا۔

''گرم آنڈے (انڈے)۔۔۔'' اس کے قریب پہنچنے پہ اس نے سنا کہ وہ ابلے ہوئے انڈے بیچ رہا تھا۔

''کتنے کا ہے۔۔۔؟'' اس نے اس سرخ وہ سفید گالوں والے بچے سے پوچھا۔ وہ پشتو میں کچھ بتا رہا تھا جو اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ آئینور نے ہاتھوں کے اشارے سے پوچھا کہ وہ کتنے کا ایک انڈہ دے رہا ہے۔ لڑکے نے بھی ہاتھوں کے اشارے سے اسے جواب دیا۔ یہاں تک کے اشارے دونوں کی سمجھ میں آ گئے تھے۔ وہ اب اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس کے پاس کل کتنے انڈے ہیں۔۔۔ لیکن نہ بات وہ سمجھا پا رہی تھی نہ لڑکے کو سمجھ آ رہی تھی۔ وہ کچھ پوچھ رہی تھی وہ کچھ بتا رہا تھا۔

چھوٹا لڑکا بڑے کے پیچھے چھپا شرما رہا تھا۔ اسے ان کی سادگی پہ پیار آیا۔ شاید وہ دونوں بھائی تھے۔

''مے آئی ہیلپ یو۔۔؟'' عباد نے دور سے ہاتھوں سے ہونے والی اس گفتگو کو دیکھا تو چلا آیا۔

''میں ان سے سارے انڈے لینا چاہتی ہوں۔ان سے پوچھیں کہ ان کے پاس کتنے انڈے ہیں۔۔۔؟'' عباد نے سر اثبات میں ہلایا اور پھر وہ انہی کی طرح روانی سے پشتو بولنے لگا۔اسے پشتو بولتے سننے کا پہلا تجربہ تھا۔وہ بہت رواں پشتو بولتا تھا حالانکہ وہ پٹھان نہیں تھا پھر بھی۔

''اس کے پاس آٹھ ہی انڈے بچے ہیں۔اگر آپ سارے لیں گی تو یہ پیسے کم کر دے گا۔''

''میں سارے لوں گی لیکن مجھے کم پیسوں میں نہیں چاہیں۔''

آئینور نے بیگ سے ایک کاغذ نکالا۔اس میں جتنی بھی رقم تھی اس نے نہیں گنی کہ اتنا اسے پتا تھا کہ یہ آٹھ انڈوں کی قیمت سے زائد ہی ہونا تھی۔یہ ویسا ہی کاغذ تھا جیسا اس نے ہوٹل میں لڑکے کو ٹپ کے لئے دیا تھا۔

لڑکا اپنی بالٹی میں پڑے تولیے نما چھوٹے رومال سے تمام انڈے نکال نکال کر عباد کو پکڑا رہا تھا۔سارے انڈے ایک ساتھ بک جانے پہ اس کے چہرے کی چمک ہی نرالی تھی۔اس وقت شام ہونے کو تھی اور یقیناً انڈے نہ بکتے تو اسے نقصان ہی ہونا تھا۔اسی لئے وہ خوش تھا کہ وقت سے پہلے اسے قیمت وصول ہو گئی۔

''نام کیا ہے تمہارا۔۔۔؟'' آئینور سے وہ کاغذ لے کر رقم گننے لگا۔عباد نے آئینور کا جملہ پشتو میں ترجمہ کیا۔

''حسین مہدی۔۔۔''

''یہیں رہتے ہو۔۔؟'' عباد اب ایک مترجم کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

''یہیں رہتا ہوں۔۔۔سردیوں میں یہاں برف پڑ جاتی ہے تو ہم مردان چلے جاتے ہیں۔وہاں ابا ہوٹل پہ کام کرتے ہیں اور امی بہنیں کپڑے سلائی کا کام کرتی ہیں۔گرمیوں میں پھر یہاں چلے آتے ہیں۔'' رقم گن کر بچے کا چہرہ مزید کھل گیا۔

آئینور نے اپنی گرم شال میں تمام انڈے سمیٹ لئے۔

"یہ کاغذ والا آئیڈیا مجھے اچھا لگا حالانکہ تم انہیں بھیک نہیں دے رہی، یہ ان کی کمائی ہے۔" وہ اس کے ساتھ تھوڑا آگے بڑھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے سمیرا نے جو کہا تھا اس کی وجہ سے آئینور نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ چلے اسی لئے ٹھہر گئی۔

"ہاں مگر نیچے والے ہاتھ کی ایک عزتِ نفس ہوتی ہے۔ جب ہم کسی کو گفٹ ریپ کر کے دے سکتے ہیں تو کسی کی اجرت کیوں بھلے طریقے سے اسے نہیں دے سکتے۔۔۔ مجھے ہر محنت کرنے والے کی قدر ہے کیونکہ بعض اوقات محنت کے بدلے میں ملنے والی رقم اتنی معمولی ہوتی ہے کہ اسے لیتے ہوئے انسان کو شرم آنے لگتی ہے۔ اسی لئے میں کسی کو شرمسار نہیں کرنا چاہتی۔" اسے یاد آیا تھا کہ اس کے پہلے ہینڈ بیگز کا آرڈر اتنا چنا منا تھا کہ اس کی رقم کا سوچ کر اسے شرم آنے لگی کہ وہ اتنی سی رقم کیسے میڈیم سے وصول کرے گی لیکن میڈیم شیریں نے بہت خوب صورت انداز میں اس کا بھرم رکھا تھا اور ایسا ہی بھرم وہ ہر کسی کا رکھتی آئی تھی۔

"آپ کے دوست آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس نے دور دیکھ کر کہا تھا حالانکہ کوئی بھی عباد کو نہیں بلا رہا تھا لیکن وہ اسے یہیں سے چلتا کر دینا چاہتی تھی۔ اسے پھر سے کسی کے منہ سے ایسا ویسا کوئی جملہ نہیں سننا تھا۔ جو بھی تھا آئینور فاطمہ گل کو اپنا وقار بہت عزیز تھا۔

اپنی شال میں انڈے سنبھالے وہ لڑکیوں کے گروپ کی طرف بڑھنے لگی۔ سامنے کھڑا اسموئیل عباد جانتا تھا کہ اس نے یہ انڈے کھانے کے لئے نہیں بلکہ اس بچے کی مدد کے لئے خریدے تھے۔ اس لڑکی کا مقام کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

رطابہ کے اصرار پہ وہ اپنا سامان لئے پاپا کی طرف شفٹ ہو گیا تھا۔ پاپا کو یہی لگا تھا کہ رطابہ اسی صورت مانی ہو گی کہ ولید اور لائبہ باہر جا رہے ہیں ورنہ اکٹھے رہنے کی صورت میں وہ کبھی یہاں نہ آتی۔ لائبہ تو رطابہ کی چرب زبانی اور گھمنڈی فطرت کے سامنے اکثر خاموش ہو جاتی تھی۔ اسے گھر کا سکون

عزیز تھا لیکن کوئی کتنا اپنی زبان کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ کبھی نا کبھی تو مڑ کر لائبہ بھی جواب دے ہی ڈالتی تھی ۔اپنی ماؤں کی نہ بننے کے باوجود بچوں کی آپس میں بہت بنتی تھی۔ وہ جب اکھٹے ہوتے مل جل کر رہتے، کھیلتے ،اٹھتے بیٹھتے۔ پاپا کو یہی بات پسند تھی۔ رطابہ بھلے بڑوں سے جتنا بھی چڑتی ہو، بچوں کو کھیلنے سے اس نے کبھی منع نہیں کیا تھا۔ یوں بھی ولید کے وہاں سیٹل ہوتے ہی اس نے فیملی کو بلوا لینا تھا۔ بہ مشکل مہینہ ڈیڑھ ہی اسے یہ سب برداشت کرنا تھا۔ اب اتنا تو وہ سسر کو مٹھی میں رکھنے کے لئے کر ہی سکتی تھی۔

پاپا کے گھر میں ان کے ایک پرانے ملازم زیور بابا رطابہ کو کبھی ایک آنکھ نہیں بھائے تھے۔ وہ پاپا کی شادی سے پہلے کے ملازم تھے جوان کے ڈیڈی نے رکھے تھے اور پاپا کے ہی ہم عمر تھے۔ پہلے وہ گھر کے کام سنبھالتے ہوں گے جب جوان ہوں گے لیکن اب وہ ملازموں کے سر پہ کھڑے ہو کر ان سے بس کام کرواتے تھے یا پاپا کے کمرے کی سیٹنگ اور ان کی وارڈ روب دیکھا کرتے تھے۔ گھر کے کاموں کو وہ ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ ان کی فطرت بڑی سادہ مزاج اور درویشانہ تھی۔ کبھی کسی کو جواب نہ دینا، خاموشی سے سر جھکائے اپنا کام کرنا اور بس مسکراتے رہنا ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔

پاپا کے ساتھ شفٹ ہو کر رطابہ نے پہلے تو اس گھر کے رنگ ڈھنگ کے مطابق زندگی گزارنے کی ناکام کوشش کی لیکن وہ زیادہ عرصے یہ سب نہیں کر سکی۔ زیور بابا لائبہ کے ماتحت کام کرتے تھے اور تمام ملازمین زیور بابا کے ماتحت۔۔۔ رطابہ کے ماتحت کچھ نہ تھا اور یہ اسے گوارا نہ تھا کہ وہ دوسروں کا حکم مانتی۔

''کل کھانے میں حلیم بناؤ عابدہ۔۔۔'' وہ اس رات کچن میں گئی تو عابدہ سارا کچن سمیٹ رہی تھی ۔یہ اس کے جانے کا وقت تھا۔ عابدہ اس گھر میں کھانا پکانے کا کام کرتی تھی۔ کچن کی تمام ذمہ داری اس کے سپرد تھی۔ وہ صبح صبح آتی اور رات میں سارا کچن سمیٹ کر ہی جاتی تھی۔ لائبہ بھی شام میں اس کا کچھ نا کچھ ہاتھ بٹا دیتی تھی لیکن رطابہ نے تو کبھی یہ کام اپنے گھر میں نہیں کیا تھا تو یہاں کیا کرتی۔ اسے کچن کے کاموں کی کیا، کسی بھی قسم کے کام کی عادت نہیں تھی۔

''باجی زیور بابا نے کل سبزی والے چاول بنانے کا بولا ہے۔ آج سارا دن لگا کر میں نے سبزیاں کاٹی ہیں۔ کل حلیم بن گئی تو سبزیاں ضائع ہو جائیں گی۔ رزق ضائع ہونے پہ بابا خفا ہوتے ہیں۔''

"تو ٹھیک ہے پھر باقی سب کے لئے چاول بنادو اور میرے لئے حلیم بنادو۔" اس نے شانے اچکائے اور فریج کھول کر جوس کا ایک ڈبا نکالنے لگی۔ گھر میں گروسری پاپا ہی ڈلواتے تھے۔ نوکروں کو تنخواہیں بھی وہی دیتے تھے۔ بل ادا کرنا بھی انھی کی ذمہ داری تھی۔ اسی لئے تو رطابہ کو غصہ آتا تھا کہ ولید اور اس کی بیوی تو مزے سے رہ رہے ہیں، سارا خرچا پاپا اٹھا رہے ہیں اور دانش بے وقوف اپنا پورا گھر خود سے چلا رہا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں مانتی تھی کہ یہ وہی تھی جس کی وجہ سے پاپا ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے۔

"گھر میں سب کے لئے ایک ہی کھانا بنتا ہے بی بی۔ صاحب غصہ ہوتے ہیں اگر کسی کو کچھ اور کھانا ہو تو۔۔۔" اس گھر کے اصول پاپا کے بنائے ہوئے تھے اور باقی سب اس پہ عمل کرتے تھے لیکن وہ تو رطابہ تھی۔ وہ کیسے ایسے کسی بھی اصول کو مان لیتی۔

"اگر کسی کا کچھ اور کھانے کا دل کر رہا ہو تو کیا وہ اپنی مرضی سے کچھ کھا بھی نہیں سکتا۔۔۔؟" غصے سے اس نے جوس کا ڈبا پاس سلیب پہ پٹخا۔ عابدہ سر جھکا گئی۔ وہ تو ملازمہ تھی۔ جیسے مالک کہہ دیں، کر دیتی تھی۔ وہ کیا جواب دیتی۔

"کسی نے کچھ کھانا ہوتا ہے تو وہ اپنے لئے باہر سے منگوا سکتا ہے۔" اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے میں زیور بابا کھڑے تھے۔ بہت نرمی سے انھوں نے بتایا تھا لیکن رطابہ کو ان سمیت ان کے الفاظ بھی زہر لگے تھے۔

"ٹھیک ہے تو میں کل اپنے لئے حلیم آرڈر کروں گی اور سب کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھ کر کھاؤں گی۔" جوس کا ڈبا اس نے اٹھالیا۔

"چھوٹی بی بی! صاحب غصے ہوں گے۔ آپ نے جو منگوانا ہے، آپ منگوا لیں لیکن اپنے کمرے میں لے جا کر کھائیں۔" وہ ماحول میں بگاڑ نہیں چاہتے تھے لیکن یہاں تو رطابہ تھی جسے سب بگاڑنا ہی آتا تھا۔

"میں تو ڈائننگ میں ہی کھاؤں گی۔" پیر پٹختے وہ باہر نکل گئی۔ زیور بابا نے کچھ پریشانی سے

انھیں جاتے دیکھا پھر عابدہ کو جواب کچن سمیٹ کر پچھلے دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔

اگلے دن کھانے کی میز پہ رطابہ نے سب کے ساتھ وہی کھایا جو بنا ہوا تھا۔ ایک دن پہلے والی ضد اس روز غائب ہو چکی تھی۔ زیور بابا نے شکر کا سانس بھرا ورنہ گھر میں بہت ہنگامہ ہونا تھا۔ وہ اپنے صاحب کی سخت فطرت سے واقف تھا اور اب چھوٹی بی بی کی باغیانہ فطرت انہیں ہولا رہی تھی۔ لیکن رطابہ بھی عقل سے پیدل تو تھی نہیں کہ ایک ملازم سے ضد میں سسر کی ناراضگی مول لیتی۔ اسے زیور بابا برے لگتے تھے اور اب مزید برے لگنے لگ گئے تھے لیکن اسے ان کا علاج اپنے طور پہ کرنا تھا۔

☆......☆......☆

گرمی پھر سے شدت اختیار کر گئی تھی اور ایسے میں اوپر ممٹی میں فاطمہ کو اکثر اوقات بجلی کی بندش کی صورت میں گھنٹوں بنا پنکھے کے بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ حصہ براہِ راست سورج کے رخ پہ ہونے کی وجہ سے آگ برساتا تھا۔ ایسے میں اس کی تکا بوٹی بن جاتی تو بھی کم تھا۔ گرمی کی شدت کے سبب ہی اس کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ وہ اوپر بے ہوش پڑی پائی گئی۔ اس کیفیت میں ہمدان نے ہی اسے دیکھا تھا جب وہ اس سے پڑھنے آیا تھا۔ اسی نے شور مچایا کر اس کے گھر والوں کو مطلع کیا ورنہ وہ بے ہوش پڑی کی پڑی ہی رہ جاتی اور نیچے والوں کو خبر تک نہ ہو پاتی۔

ہفتہ وہ بخار میں پھنکتی رہی اور کام وہیں کا وہیں رک گیا۔

ہفتے بعد بیماری سے سنبھلی تو پھر سے ممٹی میں جانے کے لئے تیار تھی۔

''ابھی مرتے مرتے بچی ہو۔ اب پھر اسی حمام میں پکنے جا رہی ہو۔ خبردار جو وہاں کا رخ بھی کیا تو۔'' امی کی تنبیہ پہ اس کے اٹھتے قدم رک گئے۔

''امی میرا کام بند پڑا ہوا ہے۔'' اس نے بے چارگی سے امی کو دیکھا۔

''گولے برسیں ایسے کام پہ۔ پورا دن بے ہوش رہی ہو اور اب بھی کام کی ہی پڑی ہے۔۔۔ یوں بھی تمہاری وہ میڈم آئی تھیں دو بندوں کے ساتھ اور کچھ سامان اٹھا کر لے گئیں۔ میں نے بھی جانے دیا کہ اچھا ہے لے جائیں، جان چھوٹے ایسے کام سے جو جان کو آ گیا ہو۔'' وہ ہکا بکا سی رہ گئی۔

امی کی کوئی بات سنے بنا وہ اوپر بھاگی تھی۔ امی اسے روکتی رہ گئیں۔ نجانے میڈم کیا کیا اٹھا کر لے گئی ہوں گی۔ اوپر آ کر دیکھا تو وہ آرڈر جو اس نے آدھا مکمل کیا تھا اور ابھی آدھے سے زیادہ ہی رہتا تھا، وہ لے جایا جا چکا تھا۔ اسی آرڈر کو پورا کرنے کے لئے جو سامان وہ خرید کر لائی تھی وہ بھی غائب تھا۔ یہ آرڈر میڈم کی وجہ سے ہی اسے ملا تھا۔ شاید وقت سے مکمل نہیں ہو سکا تو میڈم اپنے بندوں کے ساتھ سامان لے گئی تھیں۔

''ہو سکتا ہے انھوں نے کسی اور سے مکمل کروالیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ آدھا آرڈر انھیں پہنچا دیا ہو اور آدھا بعد میں مکمل کر کے دینا ہو۔'' آخری سوچ پہ اس نے خود کو سرزنش کی۔

''لیکن اگر بعد میں مکمل کروانا ہی تھا تو وہ را میٹریل (raw material) کیوں اٹھا کر لے گئیں۔ یقیناً وہ آرڈر اب میرے پاس نہیں رہا۔'' ان گنت خدشے، ان گنت وجوہات، ان گنت سوالات تھے۔ اب ان سب کی گتھی میڈم شیریں سے مل کر ہی حل ہونا تھی جو کہ وہ ابھی اسی وقت کر نہیں سکتی تھی ورنہ بخار سے تو وہ بچ گئی تھی، امی کی پھٹکار سے نہیں بچ سکتی تھی۔ لیکن اسے افسوس تھا اور بے حد تھا۔ اتنا اچھا خاصا کام تھا جو اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ جتنا افسوس بھی کرتی کم تھا۔ اسی افسوس نے اسے بستر سے لگا دیا۔ کام تھا نہیں تو اوپر جا کر کرنا بھی کیا تھا۔

اگلی شام ہمدان اپنی ممی کے ساتھ اس سے ملنے آیا تھا۔۔۔ عیادت کے لئے۔

''اتنا مس کیا میں نے آپ کو۔ کتنی بار آیا ہوں ملنے لیکن آپ سو رہی ہوتی تھیں۔'' اس کے قریب بیٹھا وہ اس کے ہاتھوں کو بار بار سہلا رہا تھا۔ یہ ایک ننھے بچے کا اپنے استاد کے لئے، ایک چھوٹے دوست کا اپنی بڑی سی دوست کے لئے اور ایک ہمدرد دل کا کسی انسان کے لئے اظہار محبت تھا۔ فاطمہ کو اس پہ بے طرح پیار آیا۔ بظاہر ایک شرارتی سا بچہ اندر سے کتنا حساس تھا وہ جانتی تھی۔

''دانی اب کسی سے پڑھنے کو تیار نہیں ہے فاطمہ۔ تم نے اسے اتنا اچھا قابو کیا ہے۔ بلکہ تم واحد ہو جس نے اسے قابو میں کیا ہے۔ جلدی سے ٹھیک ہو کر میرے بیٹے کو پھر سے پڑھانا شروع کر دو۔'' ہمدان کی ممی وہیں قریب میں امی کے ساتھ بیٹھی محوِ گفتگو تھیں۔

شکر تھا ابھی ہمدان کی ٹیوشن اور اکیڈمی کی کلاسز اس کے ہاتھ میں تھیں۔اگلے ماہ کالج کے ایڈمیشن بھی کھل جانا تھے۔پھر تو اس کے پاس پڑھائی کے سوا کوئی وقت نہیں ہونا تھا۔

''اگلے مہینے میرے کالج شروع ہو جائیں گے آنٹی۔'' اس نے یونہی سرسری ساذکر کیا تھا۔

''لیکن ہمدان کے لئے وقت نکالنا مت بھولنا۔یہ اب تمہارے سوا کسی سے نہیں پڑھ سکتا۔بلکہ میں یوں کہوں گی کہ اس نے تمہاری وجہ سے ہی پڑھائی میں دلچسپی لی ہے۔'' اس نے بے بسی سے ان دونوں اور پھر ہمدان کو دیکھا جو مسکین سی صورت بنائے اسے دیکھ رہا تھا۔

ہمدان کو تو وہ پڑھائی کے ساتھ بھی جاری رکھ سکتی تھی۔یہ ایسا مشکل امر نہیں تھا۔وہ بولتا تھا اور بہت بولتا تھا لیکن اب وہ اس کے گھورنے پہ خاموش بھی ہو جایا کرتا تھا۔اور ایسا خاموش ہوتا کہ کچھ اہم بات کے لئے بھی وہ اشارے کرتا رہتا اور تب تک کرتا رہتا جب تک فاطمہ اسے بولنے کی اجازت نہ دے دیتی۔تو وہ پڑھائی کے ساتھ اس کو بھی پڑھانے کا کام کر سکتی تھی۔البتہ اکیڈمی آنا جانا مشکل لگ رہا تھا۔

''ہمدان کے گریڈز دیکھ کر ہم اتنا مطمئن ہیں کہ کیا بتاؤں۔میتھس میں یہ بہت کمزور تھا لیکن اب اتنا تیز ہو چکا ہے کہ اس کی ٹیچرز تک حیران ہیں۔اور یہ صرف فاطمہ کی وجہ سے ہے۔'' مسز ممتاز اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔وہ خاموش تھی۔ہمدان نظروں سے بول رہا تھا کہ 'دیکھا نا میری کتنی تعریف ہو رہی ہے'۔حالانکہ تعریف تو فاطمہ کی ہو رہی تھی اور خوش وہ ہو رہا تھا۔تبھی امی نے کہا۔

''محنتی تو یہ بہت ہے۔جس چیز کے پیچھے پڑ جائے، جان مار دیتی ہے اور کر کے ہی دم لیتی ہے۔اس بات پہ تو اس کے ابا بہت فخر کرتے ہیں اس پہ۔'' ایک عرصے بعد امی نے اسے ایسے سراہا تھا ورنہ اسے تو لگتا تھا کہ محنتی ہونا گناہ گار ہونے جیسا ہے۔طبیعت ہی ایسی تھی یا حالات کا اثر تھا اس کی آنکھیں بھر آگئیں۔

مسز ممتاز تبھی امی کو کسی ضروری بات کرنے کے لئے ایک طرف لے گئیں۔

''اگر آپ نے مجھے نہ پڑھایا تو میں پڑھوں گا ہی نہیں۔'' وہ سینے پہ ہاتھ باندھے منہ پھلائے کہہ رہا تھا۔یہ اس کے غصے کا اظہار تھا کہ اس نے اسے نہ پڑھانے کی بات کی بھی تو کیسے۔

"ڈرامے باز۔۔۔" وہ اس کی ایسی جذباتی باتیں ہزاروں بار سن چکی تھی۔ وہ ہمیشہ اسے ایسے ہی کسی ڈائیلاگ سے دھمکایا کرتا تھا۔ اور سچ تو یہ تھا کہ اس سے فاطمہ کو عجیب طرح کی خوشی ملتی تھی کہ جو اخلاص وہ اس پہ صرف کرتی تھی وہ خالی نہیں جاتا تھا۔ ہمدان اس سے اتنی ہی محبت کا اظہار کرتا تھا۔ جتنی محنت وہ اس پہ کرتی تھی، اس کے اچھے نمبر اس کا حاصل تھے۔ وہ اس کے لئے ایک استاد سے کہیں بڑھ کر تھی اس بات پہ اسے مان تھا۔ شاید اس سے چھوٹا اس کا کوئی بہن بھائی ہوتا تو ایسا ہی ہوتا جیسا ہمدان تھا اور وہ بھی اس سے ایسے ہی پیار دیتی، اس کا ایسے ہی خیال کرتی جیسے ہمدان کا کرتی تھی۔ اس لئے بھی کہ وہی پیار، اہمیت اور محبت اسے اس کے اپنے بڑے بھائی اور بہنوں سے نہیں ملی تھی۔

"ہاں دانی مجھ سے ہی پڑھے گا کیونکہ میرے علاوہ اسے کوئی نہیں پڑھا سکتا۔۔۔" اس کی بات پہ وہ کھل اٹھا تو وہ بھی مسکرادی۔

اس مصروف اور مشکل زندگی میں ایک وہی تو تھا مزے کی باتیں اور حرکتیں کرنے والا جو اسے ہنسا دیا کرتا تھا۔ ایک پیارا سا رشتہ، مسکرادینے والا تحفہ۔۔۔ اتنے پیارے روزن کو وہ خود پہ کیسے بند کر سکتی تھی۔ آخر اسے بھی تو جینے کے لئے، ہنسنے کے لئے، مسکرانے کے لئے کوئی وجہ، کوئی ذریعہ چاہئے تھا۔ ہمدان وہی تھا۔

دو دن بعد وہ اکیڈمی گئی تھی۔ میڈم شیریں پشیمان تھیں لیکن وہ ان کی مجبوری سمجھتی تھی۔ انھوں نے کسٹمر کی ڈیمانڈ کے مطابق آرڈر اپنی اکیڈمی کی ایک دوسری ورکر سے مکمل کروالیا تھا۔ اس کے مکمل کئے گئے آرڈر کی رقم اسے ایک کاغذ کے لفافے میں لپیٹ کر دے دی جو ہینڈ میڈ مگر بے حد منفرد تھا۔ میڈم یہ کام اس لئے کرتی تھیں کہ کم رقم دیکھ کر کسی کی خودداری پہ ضرب نہ پڑے۔

"اگلے ماہ جب کالج شروع ہوگا تو میں اکیڈمی چھوڑ دوں گی اسی لئے میں اس سے قبل کورسز مکمل کر لینا چاہتی ہوں۔" کورس کی فیس تو شروع میں ہی لے لی جاتی تھی اب یہ استاد پہ تھا کہ وہ کب تک اپنا ہدف مکمل کرتا تھا۔ وہ چونکہ محنت کی عادی تھی اور ضرورت سے زیادہ ہی ہر چیز پہ جان مار کر اسے کاملیت کی طرف لے جانا چاہتی تھی اسی لئے وہ دیگر اساتذہ کی نسبت وقت زیادہ لے لیتی تھی۔

''آرڈرز مزید نہیں لوگی۔۔۔؟''

''اس ماہ میں لے لوں گی۔لیکن کالج کھلنے کے بعد نہیں لے سکوں گی میڈم۔۔۔پھر مجھے بس پڑھنا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے دس ہینڈ میڈ مصنوعی آبشار بنانی ہیں۔لیکن ہر ایک مختلف نمونے کی ہونی چاہئے۔ مجھے معلوم ہے تم بنالوگی۔سامان جو بھی چاہئے ہواوہ رشید کو کہہ دینا۔خودمت اتنی گرمی میں ہلکان ہونا۔'' وہ مسکرادی۔

''لیکن آرڈر اسی ماہ مکمل کرنا ہے۔کسی ایک ہی کسٹمر کا آرڈر ہے۔اور پرائس جتنا تم رکھنا چاہو وہ دینے کو تیار ہیں۔بس ڈیزائن سب کا الگ الگ ہواور آبشار اتنے سائز کے ہوں کہ ان ڈور، آؤٹ ڈور کہیں بھی بآسانی رکھے جاسکیں۔''

وہ اٹھ گئی۔اس کی کلاس کا وقت ہو رہا تھا۔باقی تفصیلات وہ بعد میں سن لے گی۔

دن رات جان مار کر اس نے سیمنٹ، بجری، ریت کے استعمال سے بہت نفیس اور مصنوعی چھوٹے آبشار بنائے جو بآسانی

ڈرائنگ روم یا کمرے میں رکھے جاسکتے تھے۔کچھ سامان بچ گیا تو اس نے اپنے گھر کے لئے بھی بنالیا۔

معاوضے کا تعین اس نے خود کیا تھا اور جتنا کیا تھا کسٹمر نے بنا چوں چراں کئے مان لیا۔آرڈر پہنچانے کے بعد جب اسے رقم ملی تو وہ بے یقینی سے رقم دوسری بار گننے لگی۔یہ پہلا آرڈر تھا جس میں اگر اس نے کم وقت میں بہت جان ماری تھی تو اسے اس کی محنت کا معاوضہ بھی اس کی مرضی سے ملا تھا۔۔۔تاہم اس دوران امی کی جب بھی صورت دیکھنے کو ملتی، دس باتیں بھی ساتھ سننے کو ملتیں۔لیکن خیر تھی۔باتیں وقتی ہوتی ہیں، اثر کرتی ہیں اگر ہم چاہیں۔۔۔ہم بھول جانا چاہیں تو ان کا کہا سنا سب بے معنی ہوجاتا ہے۔

اس رات ابا نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔اسے لگا تھا وہ اس کے کام کے متعلق ہی بات کرنا چاہتے ہوں گے۔یقیناً امی کو اس کے کام کے بارے میں جو شکایات تھیں وہ ابا سے کر چکی ہوں گی

اور اب ابا اسے سمجھانے کے لئے بلا رہے ہوں گے لیکن جب وہ ابا کے سامنے بیٹھی تو ان کی باندھی تمہید اسے چونکا گئی۔

''یہ بات کرنا کسی بھی باپ کے لئے بہت مشکل کام ہے لیکن تمہاری امی نے یہ ذمہ اس لئے میرے سر ڈال دیا کہ تم ماں کی نسبت باپ سے زیادہ قریب رہی ہو۔''

اس نے بے چین نگاہوں سے باپ کو دیکھا تھا۔ دل بری طرح دھڑکا تھا کہ نجانے ابا کیا کہنے والے تھے۔ اس ایک جملے اور لہجے نے انھیں برسوں کا بوڑھا ظاہر کر دیا تھا۔ اس سے پہلے ابا کبھی ایسے بات نہیں کرتے تھے۔

''مسز ممتاز اپنے دیور شمشاد کا رشتہ لائی ہیں تمہارے لئے۔'' اور ابا کی اس بات نے اسے مجسمے میں بدل دیا تھا۔

فاطمہ نے حیرت سے ابا کو دیکھا۔ اسے لگا کہ اس نے غلط سنا ہے۔ ابا شاید کچھ اور کہہ رہے تھے لیکن جلد اس کی غلط فہمی دور ہو گئی جب ابا مزید بولتے چلے گئے۔

''ہم کبھی اس بارے میں نہ سوچتے مگر یہ خواہش خود اس لڑکے نے کی ہے کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ابھی وہ لوگ محض رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں۔۔۔'' فاطمہ بالکل گنگ سی باپ کو دیکھ رہی تھی۔

''منگنی یا نکاح۔۔۔ جو بھی تمہاری مرضی ہو گی، ہم وہی کریں گے۔ اس رشتے کے بعد وہ تمہاری پڑھائی کی ذمہ داری خود اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ خود تمہیں ڈھیر سارا پڑھائے گا جہاں تک بھی تم چاہو۔۔۔ ڈاکٹر بنائے گا یہ اس نے کہا ہے۔ آگے بھی پڑھنا چاہو تو پڑھائے گا۔ بعد میں اگر اپنا کلینک بنانا چاہو تو وہ بھی کر کے دے گا۔ بتاؤ اس دور میں اگر کوئی مرد اتنا سپورٹ کرنے والا ہو تو اس سے زیادہ لڑکی کو کیا چاہئے۔'' فاطمہ بس باپ کو تک رہی تھی۔ ابا اس کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ وہ جو ابھی سترہ سال کی ہوئی تھی اور کالج کی شکل اس نے دیکھی تک نہ تھی، اس کی شادی۔۔۔ کانوں پہ یقین کرنا مشکل تھا لیکن اسے کرنا پڑ رہا تھا۔

''مجھے وہ خاندان اور لڑکا دونوں اچھے لگے ہیں۔ پھر ہم انہیں کئی سالوں سے جانتے بھی ہیں۔

اسی لئے مجھے اس فیصلے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہو رہی۔ پھر لڑکے کی خواہش ہے تو۔۔۔'' اس سے آگے وہ خاموش ہو گئے۔

نجانے وہ کیا سمجھ رہے ہوں گے اور امی کیا سمجھ رہی ہوں گی کہ وہ تو پہلے ہی اس کی شمشاد سے گفتگو کے بارے میں اسے تنبیہہ کر چکی تھیں۔ شاید انہیں یہی لگا ہو گا کہ یہ رشتہ اس کی منشا سے آیا ہے۔ وہ یقیناً بالا ہی بالا شمشاد کے ساتھ سب طے کر چکی ہے۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ اس کے تو فرشتے تک بے خبر تھے کہ وہ اس حد تک چلا جائے گا۔ اس نامراد شمشاد نے اس کی اس دن کی جذباتی باتوں کو کس انداز میں لیا کہ اس وقت تو وہ چپ چاپ چلا گیا اور جب بولا تو اس انداز سے۔۔۔ اف شمشاد۔۔۔ اف۔

''تم سوچ کر بتا دو۔ جیسے تم کہو گی ہم وہی کریں گے۔۔۔ منگنی یا نکاح۔'' گویا اسے ان دو میں سے ایک کو چننا تھا۔ تیسری بات بھی نہ کی جائے۔

ایک سترہ سالہ لڑکی سے وہ یہ کیا بات کر رہے تھے۔ وہ خواب دیکھنے والی لڑکیوں میں سے ضرور تھی لیکن ایسی لڑکیوں میں سے نہیں جو محض شادی کے خواب ہی دیکھتی ہیں۔ اس نے کئی خواب دیکھے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی شادی سے متعلق نہیں تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جن کی زندگی شروع ہی شادی پہ ہوتی ہے اور ختم بھی شادی پہ۔۔۔ ایک شادی نہ ہوئی تو وہ مر جاتی ہیں۔ شادی ناکام ہو گئی تو زندگی کو ناکام سمجھتی ہیں۔ جن کے پاس زندگی جینے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے خواب اونچے تھے۔۔۔ بہت اونچے۔ ان خوابوں نے وقت سے پہلے اسے بہت سنجیدہ اور بڑا کر دیا تھا۔ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں جیسی نہیں رہی تھی جو ٹھٹھے مارتی، تالیاں بجاتی ہنستی جاتی ہیں اور جن کی ہنسی کہیں رکنے کا نام نہیں لیتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ اگر وہ وقت سے پہلے زندگی کے کئی سبق پڑھ چکی ہے تو ایک سبق شادی کا بھی پڑھ لے۔

''میری عمر دیکھیں ابا۔۔۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ یہ شادی کی عمر ہے۔۔۔؟'' بات کرتے کرتے اسے لگا تھا کہ وہ رو دے گی لیکن اس نے اپنے لہجے اور آواز پہ قابو پا لیا تھا۔ اتنی مضبوط تو وہ ہو گئی تھی کہ

اب خود پہ قابو پالیا کرتی تھی۔

"تم میری عمر اور صحت دیکھو بیٹا۔۔ کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں مزید بہت سال جیوں گا اور تمہارے فرض سے فارغ ہو جاؤں گا۔۔۔؟" وہ جب سے گھر بیٹھے تھے مزید نحیف اور بیمار ہو گئے تھے۔ پہلے کی سی کوئی بات ان میں نہیں رہی تھی۔۔۔ زندگی تو۔۔۔ اونہہ۔۔۔ بالکل بھی نہیں رہی تھی۔ اسے یہ بات رلاتی تھی اور بہت رلاتی تھی۔ ماں باپ کی ایسی عمر جب وہ زندگی سے دور ہوتے موت کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں، دیکھنا، پہاڑ جیسا بوجھ اٹھانا ہے۔۔۔ اور ہم سب کو یہ بوجھ کبھی نا کبھی اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ ایسا مشکل وقت سب پہ آتا ہے۔

"میں پڑھنا چاہتی ہوں ابا۔۔" وہ یکدم سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا دلائل دے کہ ابا اس فیصلے کو روک دیں۔ کم از کم ٹال ہی دیں۔

"تو وہ تمہیں پڑھائے گا تمہیں۔ یہ اس نے خود کہا ہے۔۔۔"

"وہ پڑھا نہیں رہا، میرا بوجھ اٹھا رہا ہے۔" کاش کہ اس نے وہ سب نہ کہا ہوتا تو وہ یہ قدم نہ اٹھاتا۔ لیکن اس نے اس نیت سے تو یہ بات نہیں کی تھی۔ وہ تو بس غصے میں سب کہہ گئی تھی اور وہ لڑکا اتنا بڑا فیصلہ کر گیا۔

"لڑکیاں بوجھ نہیں ہوتیں۔ ذمہ داری ہوتی ہیں اپنے مردوں پہ۔۔۔ پہلے باپ بھائی پوری کرتے ہیں۔ پھر شوہر۔۔ اس میں برا کیا ہے۔۔۔؟ کسی نے اسے مجبور نہیں کیا۔ وہ خود سے اپنی ذمہ داری سمجھ کر پوری کر رہا ہے تو اچھی بات ہے۔ یہ ایک ذمہ دار مرد کی نشانی ہے اور مجھے اس کی یہ بات پسند آئی ہے۔"

"ابھی میں اس کی ذمہ داری نہیں بنی ابا۔" اس کی عزتِ نفس پہ گراں گزرا تھا۔ جس گھر میں بیٹھی تھی اس کے مرد اس کی ذمہ داری پوری کرنے کے اہل نہیں تھے اور وہ تیسرے محلے سے اٹھ کر اس کی ذمہ داری پوری کرنے کی بات کر رہا تھا۔ اسے اچھا کیسے لگ سکتا تھا۔

"اسی لئے تو وہ نکاح کی بات کر رہے ہیں تاکہ تم اس کی ذمہ داری بن جاؤ۔"

اس نے مان لیا کہ ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن غلط وہ بھی تو نہیں تھی۔

''شادی جیسے معاملے کے لئے بڑی زندگی پڑی ہے۔ ابھی کچھ بننے کا وقت ہے جس پہ میں اپنی تمام تر توانائی لگا دینا چاہتی ہوں۔ اگر شادی کا معاملہ چل نکلا تو ذہن ایک طرف جم نہیں پائے گا۔ میں یکسو ہو کر نہیں پڑھ پاؤں گی۔ اکثر لڑکیوں کی تعلیم اسی لئے ادھوری رہ جاتی ہے کہ ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔ شادی کے بعد کی سو ذمہ داریاں انہیں سر ہی نہیں اٹھانے دیتیں کہ وہ اپنے لئے، اپنی تعلیم اور مستقبل کے لئے بھی کچھ سوچ سکیں۔ میں ایسی لڑکی نہیں بننا چاہتی۔ میں اپنے پیروں پہ کھڑے ہوئے بنا یہ قدم نہیں اٹھانا چاہتی جس کا نام شادی ہے۔'' ابا نے اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ شاید وہ اس کی بات سمجھ گئے تھے۔ اس سے متفق بھی تھے کہ بیٹیوں کو اپنے پیروں پہ کھڑا کرنے کے وہ خود بڑے حامی تھے تاکہ کسی بھی قسم کی مشکلات کی صورت میں وہ کسی پہ بوجھ نہ بنیں۔ شاید اندر سے وہ مان بھی گئے تھے اس کی دلیل کو لیکن ان کے پاس بھی تو کئی دلائل تھے۔

''زندگی تمہارے پاس پڑی ہے بیٹا۔ میرے پاس کم بچی ہے۔۔۔ تم پڑھائی پہ توانائی لگاؤ، ضرور لگاؤ لیکن کچھ نظر میرے اندر کی توانائی پہ بھی کرو جو ختم ہو چلی ہے۔'' ابا کی اس بات پہ اسے بری طرح رونا آ گیا۔

''تم سب سے چھوٹی ہو اس لئے تمہاری فکر سب سے زیادہ ہے۔ میں اپنی باقی بچیوں کے فرض سے فارغ ہو چکا ہوں اور مطمئن ہوں۔ بیٹے کو بھی اپنے پیروں پہ کھڑا کر دیا ہے۔ اب کم از کم وہ دھکے نہیں کھائے گا۔ فکر ہے تو تمہاری ہے۔ بے چینی ہے تو تمہارے لئے ہے جسے نہ میں کچھ بنا سکا نہ ہی اس کے فرض سے فارغ ہو سکا۔''

اور یہ سب سے چھوٹا ہونا اس کے لئے کیسا عذاب بن گیا تھا یہ وہی جانتی تھی۔ پہلے پڑھائی پہ قربانی اور اب اس فیصلے پہ سر جھکانا۔۔۔ کاش کہ وہ چھوٹی نہ ہوتی یا چھوٹی ہوتی لیکن ابا کے بڑھاپے کی اولاد نہ ہوتی۔ اس کے سب بہن بھائی تعلیم مکمل کر کے جس جگہ پہنچنا چاہتے تھے، پہنچ گئے تھے۔ بہنیں شادیاں کر چکی تھیں، اپنے گھروں میں خوش تھیں۔ بھائی کی حال میں تعلیم مکمل ہو کر اچھی نوکری بھی مل گئی

تھی۔ایک وہی تھی جو ابھی میٹرک تک ہی پڑھ پائی تھی۔ابا کی حالت اس کے سامنے تھی۔۔۔گھر کے حالات سے وہ واقف تھی۔ایسے میں کون سا رستہ تھا اس کے پاس۔۔۔؟؟؟؟

''میں مرضی نہیں چلا رہا۔صرف درخواست کر رہا ہوں کہ بروقت ایک بہت اچھا رشتہ مل گیا ہے تو اسے طے ہو جانے دو تا کہ میں سکون کی سانس لے سکوں کہ میں نے اپنی آخری بیٹی کی ذمہ داری بھی پوری کر دی۔تمہاری بہنوں کی طرح تم بھی ایک اچھے انسان کے ساتھ، اچھے گھرانے میں جاؤ میری سب سے بڑی خواہش ہے۔چاہو تو یہ خواہش پوری کرو اور چاہو تو اپنی مرضی کر لو۔''

ابا کہاں کہاں سے لا کر اسے مارتے تھے جہاں وہ اف تک نہیں کر پاتی تھی۔امی تیز تھیں نا جو ایسی سبھی باتوں کے لئے ابا کو آگے کر دیتی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ابا اسے قائل نہ بھی کریں مائل کر دیتے ہیں۔انھیں اسے چاروں شانے چت کرنا آتا تھا۔وہ ابا کو انکار نہیں کر پاتی تھی۔بیٹیوں کی باپ سے الگ ہی طرح کی محبت ہوتی ہے۔لاڈ نخرے اپنی جگہ لیکن باپ کو انکار پھر بھی نہیں کیا جا سکتا۔امی سے بحث بھی ہوتی ہے، ہلکی پھلکی نوک جھوک بھی اور کبھی کبھار صاف جواب بھی دیا جاتا ہے۔باپ کے سامنے یہ سب نہیں چل سکتا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔''اس نے گہری سانس لی۔اس جواب کے سوا اب مزید کوئی جواب بنتا نہیں تھا۔ابا جس طرح بات کر رہے تھے، اب اس کے آگے ہاتھ جوڑنے کی کسر ہی رہ گئی تھی۔۔۔اور ایسی نوبت وہ لانا نہیں چاہتی تھی کہ اس کا باپ اپنی مجبوری میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے بیٹھ جائے۔س

''آپ رشتہ طے کرنا چاہتے ہیں تا کہ آپ مطمئن ہو سکیں تو ٹھیک ہے آپ کر لیں۔ابھی منگنی کرنا چاہتے ہیں تو کر دیں لیکن شادی تب تک نہیں ہوگی جب تک میں اپنی ڈگری مکمل نہیں کر لیتی۔میں اپنے پیروں پہ کھڑے ہوئے بنا شادی جیسی ذمہ داری نہیں اٹھاؤں گی ابا۔یہ بات میں ابھی سے بتا دوں۔کوئی مجھے اس کے لئے مجبور نہ کرے۔''ابا کی آنکھوں میں چمک یکدم سوگنا ہو گئی۔شاید اس کے آنکھوں کی بجی بجی بھی ان تک چلی گئی تھی۔

''اور اسے بتا دیں کہ وہ مجھ سے رابطے کی کوشش نہیں کرے گا۔مجھے یکسو ہو کر پڑھنے دے گا

۔میں کسی بھی قسم کی مداخلت نہیں چاہتی۔منگنی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ میری زندگی جینے لگ جائے ۔مجھے اس زندگی کو خود جینے کا پورا حق ہونا چاہئے۔'' ابا نے سر ہلایا۔وہ ان کی چھوٹی بیٹی تھی لیکن اس کی سمجھداری انہیں باقی دونوں سے ہمیشہ زیادہ لگتی تھی۔بعض اوقات وہ زندگی کے لئے اس کی سوچ پہ حیران رہ جایا کرتے تھے۔

''اور وہ جو میرا اخرچا اٹھانے کی بات کہہ رہا ہے اسے میری طرف سے بہت شکریہ کہہ دیجئے گا۔میں اس کی یہ پیشکش قبول نہیں کرسکتی۔'' اس کی عزتِ نفس اس بات پہ بالکل آمادہ نہیں تھی۔اگر ایسا ہی کچھ کرنا ہوتا تو کئی راستے تھے اس کے پاس۔بھلا اتنا ہلکان ہونے کی پھر ضرورت ہی کیا تھی۔

ابا کو اس کی تمام شرائط منظور تھیں۔حالانکہ ان کا ماننا اتنا اہم نہیں تھا۔بات تو تب تھی جب شمشاد مان جاتا اور حیرت اس بات کی تھی کہ وہ مان گیا تھا۔بنا کسی چوں چراں کے وہ مان گیا تھا۔

''وہ جیسا کہے گی ویسا ہی ہوگا۔۔۔۔'' فی الوقت یہ اہم تھا کہ وہ چند شرائط کے بدلے رشتے کے لئے مان گئی ہے۔بعد میں وہ طریقے سے اپنی منوا سکتا تھا۔بس ایک بار منگنی ہو جاتی یہ اس کی سوچ تھی۔

اس کے کالج میں ایڈمیشن کا وقت آیا تو اس نے کچھ بڑے پرائیوٹ کالجز میں اپلائی کیا جو اسے اسکالرشپ پہ پڑھانے کی پیشکش کررہے تھے۔ابا اس کے لئے خود جا کر ایک سرکاری کالج کا داخلہ فارم لے آئے تھے۔

''سرکاری کالج کی فیس آپ مجھے دے دیں۔میرے کچھ کام آجائے گی۔مگر داخلہ میں پرائیوٹ کالج میں ہی لوں گی۔'' فارم اس نے ابا کو لوٹا دیے تھے۔

''میں پرائیوٹ کالج میں پڑھانے کا خرچا نہیں اٹھا سکتا۔'' ابا نے نحیف سی آواز میں کہا تو اسے خود سے ہی عجیب سی شرمندگی ہونے لگی۔

''کالج کی فیس نہیں ہوگی۔وہ مجھے اسکالرشپ پہ پڑھا رہے ہیں۔کتابیں تو یہاں بھی ہوں گی اور وہاں بھی لیکن یہ قریب ہے، پیدل جایا جاسکتا ہے تو گاڑی کا خرچا بچ جائے گا۔'' ابا نے ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھا۔ہاتھ میں تھامے فارم ایک طرف رکھے۔دراز سے اس کی سالانہ فیس جو

سرکاری کالج میں جمع کرنے کے لئے سنبھال کر رکھی تھی، نکال کر اس کی ہتھیلی پہ رکھ دی۔ اس کے سر پہ اپنا ہاتھ دھرا۔

''جیتی رہو۔ فخر تم جیسی بیٹی کے لئے چھوٹا جذبہ ہے۔'' وہ جھکے ہوئے کندھے لے کر اس کے کمرے سے چلے گئے تو اس کے اپنے آنسو بہہ نکلے۔ ابا کے اس ایک جملے سے اس کی سال بھر کی وہ تھکان اتر گئی تھی جس نے اسے بہت سا توڑا اور بہت سا جوڑا تھا۔ وہ انہیں بتا نہیں سکی کہ ان کے اس ایک جملے کے لیے خوشی بھی چھوٹا جذبہ تھی۔

اپنے ہاتھ میں تھامی رقم اس نے بنا گنے ہی اپنے اس رقم کے ڈبے میں ڈال دی تھی۔

جس ہفتے اس کا کالج شروع ہو رہا تھا، اسی ہفتے اس کی منگنی بھی تھی۔ شمشاد کی والدہ اور مسز ممتاز رسم کرنے آئی تھیں۔ شمشاد چاہتے ہوئے بھی نہیں آیا تھا۔ جب اتنی شرائط رکھی گئی تھیں تو اس کا آنا کہاں منظور ہوتا اسی لئے وہ خود سے ہی نہیں آیا۔ منگنی کی انگوٹھی شمشاد کی والدہ نے پہنائی تھی، ہاتھ پہ ہزار ہزار کے پانچ نوٹ بھی دھرے اور قیمتی سوٹ بھی تحائف کے طور پہ امی کو تھما دیے تھے۔ منگنی کی انگوٹھی انگلی میں آ جانے پہ بھی کہیں دل ویسے نہیں دھڑکا تھا جیسے اس نے سن رکھا تھا۔ بس ہمدان اسے بہت میٹھی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ مٹھائی بلکہ چاکلیٹ ہو۔ کچھ شرما بھی رہا تھا۔

''آپ کی چاچو سے انگیجمنٹ ہو گئی ہے۔'' شرمگیں مسکراہٹ لئے وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے یہ منگنی چاچو سے نہیں اس سے ہوئی ہو۔

''ایسا نہ ہو کہ اب آپ مجھے بھول جائیں۔ میری جگہ وہی رہنی چاہئے ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔۔۔ اور اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ کو چاچی واچی کہوں گا تو نہیں کہوں گا۔ میں تو اب بھی مس ہی کہوں گا۔'' وہ ہمدان تھا تو وہ اس سے ایسی کوئی توقع کر بھی کیسے سکتی تھی۔ وہ اس سے اپنے تعلق کی نوعیت نہیں بدلنا چاہتا تھا۔ ایسا وہ بھی نہیں چاہتی تھی۔ ان کا اپنا رشتہ بہت قیمتی اور پیارا تھا جسے وہ نئے رشتے کی نذر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''وہ ہماری خوشی کے لئے ہمیشہ مان جاتی ہے۔ ہماری بات کا ہمیشہ مان رکھا ہے اس نے۔ ہم

نے کبھی کسی اولاد سے وہ سب نہیں مانگا جس کا بار اس کے کاندھوں پہ رکھتے ہیں اور وہ خاموشی سے اسے اٹھالیتی ہے۔'' منگنی کی رات وہ اپنی انگوٹھی امی کو دینے ان کے کمرے میں گئی تھی کہ وہ اتنی قیمتی انگوٹھی نہیں سنبھال سکتی تھی۔ تبھی اس نے دروازے پہ ابا کو کہتے سنا۔ ایک گہرا سانس اس نے وہیں کھڑے کھڑے لیا۔ ابا کو اس بات کا احساس تھا یہ بڑی بات تھی۔

''جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں اسی کے فائدے کے لئے کرتے ہیں۔ ہم بھی تو اپنی جگہ مجبور ہیں محسن صاحب ورنہ کون والدین چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد نام روشن نہ کرے۔۔۔ دنیا سے پیچھے رہ جائے۔۔۔ زندگی میں ناکام ہو جائے۔۔۔ ہم بھی نہیں چاہتے۔'' وہ والدین کی مجبوری سمجھتی تھی۔ ان کی مجبوری پہ اب شکایت بھی نہیں تھی۔ بس وہ ان سے ایک تھپکی کمر پہ چاہتی تھی جو امی سے تو اسے کبھی نہیں ملنا تھی البتہ ابا کا ایک جملہ اس کی ہمت بندھا گیا تھا۔

مٹھی میں تھامی انگوٹھی کو دبائے وہ اسی طرح اپنے کمرے کی طرف لوٹ گئی۔

☆......☆......☆

اذکار کو دادا سے جتنا ڈر لگتا تھا اتنا ہی زیور بابا اسے اچھے لگتے تھے۔ ایک مہربان وجود جو اسے وہ باتیں اتنی آسانی سے سمجھا دیتے جو سمجھانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ باتیں جو بچوں سے ان کی مائیں کیا کرتی ہیں جو اس کی ماں نے کبھی اس سے نہیں کی تھیں۔ انہیں اتنی ساری کہانیاں آتی تھیں کہ وہ سنتا چلا جاتا اور نہ وہ سن سن کر تھکتا نہ ہی زیور بابا سنا سنا کر تھکتے۔ پہلے بھی وہ جب کبھی دادا کے گھر رہنے آتا تو اسے سب سے زیادہ خوشی زیور بابا سے مل کر ہوتی۔ اسے فطرتاً سادہ مزاج لوگ پسند تھے جیسے فاطمہ خالہ، زیور بابا۔۔۔ ہماری فطرت جیسی ہوتی ہے، ویسے ہی لوگوں سے ہمیں کشش ثقل محسوس ہوتی ہے اور وہ ایک ایک کر کے ہمارے گرد ہمارے پیاروں کی صورت جمع ہونے لگتے ہیں۔

''ذکی! تم یہ زیور بابا کے ساتھ کیوں اتنا رہتے ہو۔۔۔؟'' ماما جب ہسپتال سے لوٹتیں اور اسے زیور بابا کے ساتھ دیکھ لیتیں تو ان کا موڈ یونہی بگڑ جایا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتا کہ ان کے سامنے زیور بابا سے کم ہی بات کرے لیکن کبھی کبھار ایسا ہو جایا کرتا کہ وہ ان سے بات کر رہا ہوتا اور ماما اچانک

وہاں آ جاتیں۔

''وہ میرے دوست ہیں۔'' اس چھوٹے بچے کو دوست سے بہتر لفظ نہیں ملا تھا۔ پہلے فاطمہ خالہ ، ماموں، ہمدان اور اب زیور بابا۔۔۔ اس کے لئے دوستی کا معنی عمر کی قید سے کہیں آگے کا تھا۔

''وہ اس گھر کے نوکر ہیں۔ نچلی ذات کے ہیں۔ کمی کمین کو دوست نہیں بنایا کرتے۔'' رطابہ کا لہجہ اتنا برا تھا کہ ذکی کو غصہ آ گیا۔ وہ کمی کمین کا مطلب نہیں جانتا تھا لیکن ان کے لہجے کی نفرت وہ بچہ ضرور سمجھتا تھا۔ اس کی ماں کو عموماً اس کے دوستوں سے مسئلہ ہی رہتا تھا۔ وہ سکول میں جب کسی کم اسٹیٹس والے لڑکے سے دوستی کرتا اور ماما کو پتا چل جاتا تو وہ اس کی ٹیچر سے جا کر لازمی ملتیں کہ وہ اسے اس لڑکے کے ساتھ بیٹھنے اور ملنے سے روکیں۔ نجی اسکولوں کے اساتذہ تو یونہی وہ کرتے ہیں جو ان سے والدین کرنے کو کہتے ہیں۔ یوں اس کا ہر دوست اس سے دور کر دیا جاتا اور وہ جانتا تھا کہ یہ سب ماما ہی کرواتی تھیں۔ اب بھی وہ یہی چاہ رہی تھیں۔

''مجھے ان کی باتیں اور وہ اچھے لگتے ہیں۔ اس لئے بے شک وہ نوکر ہی ہوں وہ میرے دوست ہیں۔'' اس کا انداز دیکھ کر رطابہ کا دماغ گھوم گیا۔

''یہ کس طرح تم مجھ سے بات کر رہے ہو۔۔۔؟''

''جیسے آپ سب سے بات کرتی ہیں، ویسے ہی۔۔'' وہ اتنا کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا تھا مبادا ماں کا ہاتھ نہ اٹھ جاتا۔ لیکن اس کے اس جملے نے جو آگ لگائی تھی وہ رطابہ کے لئے جہنم جیسی تھی۔ اپنے کمرے میں ہی سہی، وہ اتنا اونچا چلا رہی تھی کہ آواز نیچے تک آ رہی تھی۔ شکر تھا کہ دادا گھر نہیں تھے ورنہ بہت برا ہوتا۔ وہ کسی کا بھی یوں چلانا برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ غصے میں اس کی ماں پاگل ہو جایا کرتی تھی اور دادا کو پاگل لوگ پسند نہیں تھے۔

لائبہ چاچی نے تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے ذکی کو دیکھا جو اب بھاگتا ہوا داخلی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات پہ انہیں افسوس ہوا تھا۔ انہوں نے اسے روکنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ بھاگتا ہوا داخلی دروازے سے باہر نکل گیا۔ ماں باپ کے جھگڑے الگ

آزمائش تھے ان بچوں کے لئے اور ماں کی بددماغی الگ آزمائش۔۔۔انہیں سچ میں اذکار اور اخبا کے لئے افسوس ہوتا تھا۔ان بچوں کی ذہنی نشوونما پہ کیا اثر پڑ رہا تھا وہ سمجھ سکتی تھیں۔بچے کی پہلی درسگاہ ہی ایسی ہو تو بچے نے بھلا کیا سیکھنا تھا لیکن وہ ان دونوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

ایک دو بار پہلے بھی وہ ولید سے بات کر چکی تھیں لیکن وہ بھی اس معاملے میں بے بس تھے اور اسے بھی سختی سے رطابہ کے معاملات سے دور رہنے کی تاکید کی تھی۔جب عورت ہی اپنے گھر اور بچوں کی دشمن ہو جائے تو دنیا کا کوئی ایسا اسم نہیں پھونکا جا سکتا جو سب ٹھیک کر سکے۔

''زیور بابا! پلیز جا کر دیکھیں زکی کہاں گیا ہے۔۔؟'' زیور بابا جو شور سن کر لاؤنج میں آئے تھے ،لائبہ کی بات پہ سر ہلاتے باہر کی طرف بڑھے۔وہ خود اس کے معاملے سے دور تھی تو اتنا تو کر سکتی تھی۔ اس نے لب بھینچ کر اوپر سیڑھیوں کی طرف دیکھا جہاں کمرے سے چیزوں کے پھینکے جانے کا شور آ رہا تھا۔ایک مصیبت ہی تھی جو ان کے وہاں شفٹ ہونے پہ نازل ہو گئی تھی۔وہ تو جلد ہی ولید کے پاس جا رہی تھی۔اگلے ماہ کی پانچ کو ان کی ٹکٹ ہو گئی تھیں لیکن پیچھے کیا ہونے والا تھا یہ سوچ کر ہی دل ڈرتا تھا۔

باہر لان اور کاریڈورز میں وہ دکھائی نہیں دیا تو وہ گیٹ کی طرف گئے جو سرپٹ کھلا ہوا تھا۔گیٹ سے باہر وہ سڑک پہ بھی کہیں نہیں تھا۔کسی خیال کے تحت وہ سامنے پارک کی طرف چلے گئے جہاں ایک درخت تلے بنے بینچ پہ وہ بیٹھا رو رہا تھا۔اس وقت کوئی بھی ہوتا تو اس بچے پہ ترس کھاتا، ہمدردی کرتا ۔وہ بھی اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گئے۔

''ذکی بابا! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔۔۔؟'' پارک کوئی گھر سے اتنا دور تو تھا نہیں کہ وہ وہاں تک نہ جا سکتا۔گیٹ سے جھانکو تو سامنے ہی دکھائی دیتا تھا اسی لئے بچوں کو خود سے پارک تک چلے جانے کی اجازت تھی۔کالونی یوں بھی محفوظ تھی۔یہاں کی سیکیورٹی سخت تھی۔کوئی بھی منہ اٹھائے اندر نہیں چلا آتا تھا۔

''مجھے رونا تھا اسی لئے یہاں آ گیا۔'' زیور بابا خاموش ہو گئے۔

''ماما کو ہمیشہ میرے دوست برے لگتے ہیں۔فاطمہ خالہ، ہمدان اور اب آپ۔۔۔'' زیور بابا

اس کی بات پہ چونکے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ چھوٹی بی بی جس طرح ان سے برتاؤ کرتی ہیں وہ انہیں ناپسند کرتی ہیں ہمیشہ سے ہی لیکن پھر بھی اذکار کے منہ سے سننا انہیں چونکا گیا تھا۔

''وہ ہمیشہ مجھے اپنے مطابق چلانا چاہتی ہیں جیسے میں روبوٹ ہوں۔ بلکہ وہ پاپا کو بھی اسی طرح ٹریٹ کرتی ہیں۔ خود وہ کسی کی کبھی نہیں سنتیں، نانو کی بھی نہیں اور چاہتی ہیں کہ باقی سب وہی کریں جو وہ چاہتی ہیں۔'' اس بچے کے اس تجزیے کے پیچھے سالوں کا مشاہدہ تھا جسے وہ ٹھکرا نہیں سکتے تھے۔ ان کے پاس ایک چپ کے اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

''وہ آپ کو اگر کچھ کہیں تو پلیز آپ مائنڈ مت کرنا بابا۔ میں پہلے سے سوری کرتا ہوں۔ وہ ایسی ہیں ہیں۔۔۔ وہ سب کے ساتھ ایسی ہیں۔۔۔ وہ نانو اور نانا کو بھی نہیں چھوڑتیں۔۔۔ میری ماما ایسی ہی ہیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گیا تو زیور بابا نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس بچے کی نفسیاتی حالت انہیں ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اندر سے بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ یہ بات ہر کسی کو دکھائی دیتی تھی تو اس کی ماں کو کیوں نہیں سمجھ آتی تھی جو بہت پڑھی لکھی تھی۔ طب کے شعبے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ کیوں اپنی ہی نسل خراب کرنے کے پیچھے پڑی تھی۔

سچ تو یہ تھا کہ ان کے پاس اسے سمجھانے، کوئی تسلی دینے کے لئے الفاظ نہیں تھے۔ وہ اس ہستی کی شکایت دنیا سے کر رہا تھا جس کے پاس بچے دنیا کی شکایت لے کر جاتے ہیں۔ بچے کی تربیت میں جو صبر و برداشت ماں کو دکھانا چاہیئے وہ بچہ ماں کے لئے دکھا رہا تھا۔۔۔ کسی بچے کے لئے اس سے زیادہ قابل رحم مقام نہیں ہو سکتا۔

''چلو ایک کہانی سناتا ہوں میں تمہیں۔'' کچھ توقف سے زیور بابا نے کہا تو ذکی نے جھٹ سے اپنے آنسو صاف کئے۔ اسے کہانیاں سننے کا بہت زیادہ شوق تھا۔

''دو بچوں کی ایک ماں تھی جو سارا دن بہت سارا کام کرتی تھی۔ اتنا کام کہ وہ بہت زیادہ تھک جاتی لیکن کام ختم ہی نہ ہوتے۔ بچے سارا دن کھیلتے کودتے اور ماں کی کسی کام میں ان کی مدد نہیں کرتے تھے۔ ماں صرف یہی چاہتی تھی کہ بچے اس بات کو سمجھیں کہ ان کی ماں سارا دن ان کے لئے تھکتی ہے۔

ان کے کام کرتی ہے۔ ان کی بھلائی کا سوچتی ہے لیکن بچے یہ بات نہیں سمجھتے تھے۔ جب بچے یہ بات نہیں سمجھتے تھے تو ماں چڑ جاتی، غصہ ہونے لگتی، چیختی چلاتی تو بچوں کو ماں بری لگنے لگتی۔ ایک دن ماں نے تنگ آ کر اللہ سے دعا کی کہ مجھے کوئل بنا دیں اور میں یہاں سے اڑ کر دور چلی جاؤں۔۔۔ اللہ نے ماں کی دعا سن لی اور ماں کوئل بن گئی۔ بچوں نے دیکھا تو رونے لگے اور ماں سے کہا کہ وہ انہیں چھوڑ کر نہ جائے لیکن ماں اڑ گئی۔ بچے اس کے پیچھے بھاگنے لگے لیکن ماں اڑتی ہوئی دور چلی گئی اور دوبارہ انہیں دکھائی نہیں دی۔ بچوں کو جب اکیلے رہنا اور سارا کام کرنا پڑا تو انہیں پتا چلا کہ ماں کتنی اچھی تھی اور ان کے لئے کیا کیا کرتی تھی۔ لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔"

"بابا بچوں نے ماں کو تنگ کیا تو وہ کوئل بن گئی لیکن میں اور اخبا تو ماما کو تنگ نہیں کرتے۔ ماما نے ہمیشہ صرف جاب کی ہے اور کوئی کام نہیں کیا پھر بھی جب وہ جاب سے آتی ہیں تو ہم چپ کر کے اپنا کھیلتے ہیں کہ وہ سو جائیں۔ ان کے آرام کا خیال کرتے ہیں۔ ہم نے کبھی ان کے سونے اور پڑھائی کے دوران شور نہیں کیا۔ لیکن وہ ہم سے خوش نہیں ہوتیں۔ وہ کبھی بھی ہم سے خوش نہیں ہوئیں۔" زیور بابا نے سر ہلایا۔

"وہ خوش ہوتی ہیں بس آپ کو بتاتی نہیں ہیں۔" اس وقت ایک بچے کا دل ماں سے صاف کرنا ضروری تھا۔

"جب وہ غصہ ہوں تو وہ چلاتی ہیں پھر خوشی میں وہ کیوں نہیں بتا سکتیں کہ وہ ہم سے خوش ہیں۔۔۔؟" زیور بابا کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔

ہمارے اکثر والدین یہی کرتے ہیں۔۔۔ غصے کا کھل کر اظہار اور خوشی میں محبت کو قید۔

"ذکی بابا! آپ تو بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کے پاس آپ کی ماما ہیں۔ مجھے دیکھو میں چھوٹا سا تھا تو میری ماں فوت ہو گئیں۔ میرے ابا نے مجھے صاحب کے ابا کو دے دیا کیونکہ وہ مجھے پال نہیں سکتے تھے۔ اور تب سے میں دوسروں کے گھر میں کام کرتا ہوں۔ ان کی خدمت کرتا ہوں۔ میں پڑھ نہیں سکا۔ شاید پڑھتا تو بڑا آدمی بن جاتا۔ میں ہر بچے کو دیکھ کر سوچتا ہوں کہ وہ خوش قسمت ہے کہ جس کے

پاس اس کی ماما ہیں۔ ماما جیسی بھی ہوں ہمیں اللہ کا شکر کرنا چاہئے کیونکہ جب وہ نہ ہوں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ وہ کیا تھیں۔ ماما ہمیں ضائع ہونے سے بچا لیتی ہیں بابا۔ وہ ہمیں ہر تکلیف سے چھپا لیتی ہیں۔"
اذکار نے اس بار سر ہلایا۔

"یس آئی ایم لکی۔۔۔ میرے ایک دوست کی مدر کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور وہ روز سکول میں روتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنی ماما کو یاد کرتا ہے۔ بابا میں ماما کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یس آئی ایم لکی۔۔۔" زیور بابا نے سکون کا سانس لیا کہ کسی ایک نقطے پہ تو وہ اس بچے کو مطمئن کر سکے ہیں۔

☆......☆......☆

سوات سے واپسی کے سفر میں ان کی وہ بس خراب ہو گئی تھی جس میں وہ لڑکیاں سوار تھیں۔ ابھی تو مالاکنڈ تک بھی سفر نہیں ہو پایا تھا ایسے میں یہ مسئلہ کھڑا ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

لڑکیاں تو بس میں بیٹھتے ہی اونگھنے لگی تھیں۔ صرف آئینور جاگ رہی تھی۔ اس نے سفر بہت ہی کم کئے تھے اور اب جو کر رہی تھی تو وہ سو کر رستے کے مناظر کو گنوانا نہیں چاہتی تھی اسی لئے پورے سفر میں اس کی ایک بار بھی آنکھ نہیں لگی۔ وہ ہشاش بشاش سی سارے رستے کا مزہ لیتی ہوئی گئی تھی۔ یہاں آ کر اس نے ایک بات جانی تھی کہ سفر کا شوق جس کو لگ جائے تو پہاڑوں سے لوٹنے سے پہلے وہ پہاڑوں میں لوٹنے کا عہد کر کے جاتا ہے۔ وہ بھی ایسا عہد کر کے جا رہی تھی۔

بس کی خرابی ایسی تھی کہ سڑک پہ کھڑے کھڑے ٹھیک نہیں ہو سکتی تھی۔ لڑکوں کا کیا تھا وہ دوسری بسوں میں لٹکتے، چھت پہ چڑھتے واپس پہنچ جاتے۔ مسئلہ ان لڑکیوں کا تھا اور انہی کے لئے عباد نے اپنے کسی جاننے والے کی ہائی ایس منگوائی تھی۔ بعد میں اس ہائی ایس کے اضافی پیسے بھی اس نے کسی سے نہیں لئے تھے۔ یوں ڈھائی گھنٹے انتظار کے بعد وہ سب ہائی ایس میں بیٹھ گئیں۔ عباد، رہبر اور رؤف ان کے ساتھ اسی ہائی ایس پہ سوار ہو گئے۔ اپنے شہر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو چکا تھا۔ ان تینوں کی ذمہ داری تھی لڑکیوں کو ان کے گھر تک پہنچانا اسی لئے ہائی ایس سب کو ان کے گھر کے سامنے اتار رہی تھی۔

"بس یہیں روک دیں۔ اس بازار سے آگے بڑی گاڑی نہیں جا سکتی۔" آئینور نے کسی بازار

کے باہر پہنچ کر گاڑی رکوادی تھی۔

تینوں نے شش و پنج میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نجانے اس کا گھر کتنا دور تھا۔ وہ اسے یوں اکیلے جانے نہیں دے سکتے تھے۔

''میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' عباد نے پیش کش کی۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ یہاں سے میں چلی جاؤں گی۔'' وہ ہائی ایس سے اتر گئی۔ عباد بھی اتر گیا۔

''رات ہوگئی ہے۔ اکیلے جانا مناسب نہیں ہے۔''

''میں اتنی بزدل ہوں نہیں جتنی لگتی ہوں۔ اکیلے بہت سفر کیا ہے میں نے۔ یہ تو گھر کے قریب کا سفر ہے۔'' اس نے پر اعتمادی سے اس کی جانب دیکھا جو کچھ خاص آمادہ نہ تھا۔

''ڈونٹ وری۔ میں چلی جاؤں گی۔ اللہ حافظ۔'' وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔

عباد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور بعد میں کتنی بار اس نے سوچا تھا کہ کاش وہ اس کے ساتھ زبردستی اس دن چلا جاتا تو اس خواری سے بچ جاتا۔

اور وہ سڑک پہ چلتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ پہاڑی علاقوں کے سفر میں نجانے کیا جادو تھا کہ انسان پیچھے کیا چھوڑ کر آیا ہے، کیا دکھ لے کر چلا تھا، سب بھول جاتا ہے۔ وہ بھی بھول گئی تھی اور اب جب لوٹی تو سب یاد آ رہا تھا۔

☆......☆......☆

منہا اور علی کی شادی کی تاریخ پکی ہوگئی تھی۔ دونوں گھرانوں میں خوشی کا ماحول تھا۔ شادی چند ماہ بعد تھی تب تک تیاری کے لئے خاصا وقت تھا لیکن اس سے پہلے ان کے نکاح کی تقریب رکھی گئی تھی۔ علی نے اعلیٰ تعلیم کے لئے اٹلی جانا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ نکاح پہلے سے ہو جائے تاکہ اسے منہا کے پیپرز بنانے میں آسانی ہو۔

سموئیل کا پارٹ تو بھی ان کی شادی تک کلیئر ہو جانا تھا جن کی وہ ان دنوں خوب زور و شور سے تیاری کرنے میں لگا ہوا تھا۔ وہ سرجری میں اسپشلائزیشن کر رہا تھا حالانکہ اس کی دلچسپی ہمیشہ سے پیڈز

میں رہی تھی۔ لیکن جب اسپیشلائزیشن کی بات بابا نے کی تو نجانے کیوں اس کے منہ سے سرجری نکل گیا۔ بابا اس بات پہ حیران بھی ہوئے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ سے اس کی پیڈز میں دلچسپی سے واقف تھے لیکن انہوں نے اسے روکا نہیں تھا۔ یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی کہ اس کی دلچسپی بدل گئی تھی۔ وقت کے ساتھ ایسا ہو جایا کرتا ہے۔

بابا نے عرصہ ہوا اس کے مستقبل کے حوالے سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ اس ایک معاملے میں اس سے خاصے نالاں تھے حالانکہ اپنی تمام تر عادات اور خصوصیات کے حوالے سے وہ بابا کا ہمیشہ سے پیارا بیٹا رہا تھا۔ بس ایک اس بات پہ انہیں ہمیشہ دکھ رہا تھا کہ اپنے مستقبل کو لے کر وہ جتنا کامیاب ہو سکتا تھا، جتنا آگے جا سکتا تھا وہ صرف اور صرف اس کی غیر سنجیدگی کی بدولت ممکن نہیں ہو سکا۔ بابا چاہتے تھے کہ وہ ان کی طرح آرمی میں جائے۔ ان کی خاندان کی نسلیں آرمی سے وابستہ تھیں۔ اس کے بابا اور ان کے سبھی بھائی، ان کے ابا اور دادا کے بھی ابا۔۔۔ نجانے ان سے پچھلے کتنے۔۔۔ وہ اپنے خاندان کا پہلا سیولین تھا۔

بابا نے اس کے ایف ایس سی کے بعد اس کو فوج میں کمیشن کا ٹیسٹ بھی دلوایا تھا۔ ٹیسٹ میں اس کے لئے اپنے کسی اندر کے بندے سے باقاعدہ بوٹیوں کا انتظام بھی کیا تھا تا کہ اس کا ٹیسٹ کلیئر ہو سکے۔ ٹیسٹ کلیئر ہونے کی صورت میں انٹرویو کے تمام معاملات بھی طے کر رکھے تھے لیکن وہ ٹیسٹ میں کچھ انسانوں والے جواب لکھ کر آتا تو پاس ہوتا نا۔ دو بار ٹیسٹ دیا، دونوں بار رہ گیا۔ بابا حیران تھے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شکر تھا کہ اندر کے بندے نے یہ نہیں بتایا کہ جو بوٹیاں اسے تھمائی جاتی ہیں ان کا وہ کیا حشر کرتا تھا ورنہ تو بابا نے اسے گھر سے نکال باہر کرنا تھا۔

ایف ایس سی کے بعد اس نے خود سے میڈیکل میں جانے کی بات کی تھی کیونکہ رہبر اور رؤف میڈیکل میں جانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی بابا چاہتے تھے کہ وہ آرمی ڈاکٹر بنے لیکن وہ اندر سے اس سے بھی انکاری تھا کہ اس کے دوست وہاں نہیں جا سکتے تھے اور جہاں اس کے دوستوں نے جانا تھا، اس نے وہیں تو جانا تھا۔ وہ سول ڈاکٹر بن گیا۔ بابا خاموش تو ہو گئے لیکن اندر سے نالاں ہی رہے۔ ایم بی بی

ایس مکمل کر کے جب وہ فارغ ہوا تو بابا نے چاہا کہ وہ اپنا ایک چھوٹا سا سیٹ اپ بنا لے لیکن وہ ہاسپٹل بنانے کی بجائے گاڑیوں کے بزنس میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ بابا نے اسے اس کی بے وقوفی قرار دیا لیکن اسے جو شوق تھا وہ اس نے پورا کر کے ہی رہنا تھا۔ اس نے اکلوتا بیٹا ہونے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ اسے ہمیشہ سے کچھ نیا کرنے کا شوق رہتا تھا۔ جب اس کا بزنس سیٹ ہو گیا تو وہ اسے ایک دوست کے حوالے کر کے اسپیشلائزیشن کرنے کا سوچا۔۔۔ بابا نے اس بار کوئی رائے نہیں دی۔ اسے اپنی مرضی کرنے دی کیونکہ وہ اسے روکتے بھی تو بھی کرنا تو اس نے اپنی ہی تھی۔ وہ کبھی کبھار اپنے بیٹے کو نہیں سمجھ پاتے تھے۔ کبھی وہ اتنا سادہ مزاج دکھائی دیتا اور کبھی ایک گنجلک دھاگے جیسا جسے وہ کبھی سلجھا نہیں سکتے تھے اور اس کی گرہوں میں مزید اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا تھا۔

منہا اور علی کے نکاح کی تقریب گھر پہ ہی رکھی گئی تھی۔ بابا اور علی کے ابا کا تو پورا ارادہ تھا ایک دنیا جمع کرنے کا لیکن علی نے انہیں "میں بھی اس سال گائنی میں پارٹ ون دے رہی ہوں۔"

"بہت اچھا کر رہی ہیں۔ اس سے آپ زرینہ آنٹی کا کلینک سنبھال لیں گی۔" اسمارہ نے اپنے کرل ہوئے بالوں کو جھٹکا دیا۔

"خیر اب وہ کلینک نہیں رہا۔ ڈیڈ اور مما نے ملکر اسے ایکسٹنڈ کیا ہے۔ اب تو وہ باقاعدہ ڈائیگنوسٹک سنٹر بن چکا ہے۔۔۔ اینڈ لیس۔۔۔ میں ان فیوچر اسے ہی جوائن کروں گی۔ آخر مجھے ہی اسے سنبھالنا ہے۔" سموئیل نے سر کو جنبش دی اور ارد گرد دیکھنے لگا۔ لڑکی سمجھدار ہوتی تو سمجھ جاتی کہ وہ اس سے بات کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا۔ وہ کبھی کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتا تھا۔ یہ ٹھیک ٹھاک بدتمیزی اور بدتہذیبی تھی جو وہ کر رہا تھا لیکن یہ کرنا اس کی مجبوری تھی۔ اگر وہ یہ سب نہ کرتا تو اسے وہ کرنا پڑ جاتا جو ممی چاہتی تھیں اور وہ تو وہ کسی صورت نہیں کر سکتا تھا۔

"سنا ہے آپ نے گاڑیوں کا کوئی شوروم کھولا ہے۔ یہ شوق کب سے ہو گیا۔ آئی مین کہ ایک ڈاکٹر کو ہوسپٹل کھولنے کی بجائے شوروم کھولتے دیکھنا۔۔۔" اس نے بات جان کر ادھوری چھوڑ دی۔

"کھولا تھا شوروم۔ اب وہ دوست کو دے دیا ہے کیونکہ اس سے دل بھر گیا تھا۔ آج کل ایک

ٹریولنگ ایجنسی کھولنے کا ارادہ ہے جو ٹورز ٹرپ ارینج کرے گی۔'' اسمارہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''آر یو سیریس۔۔۔؟''

''یس آئی ایم۔۔۔ میں جلدی بے زار ہو جایا کرتا ہوں۔۔ چیزوں سے بھی اور لوگوں سے بھی۔اسی لئے نئے سے نئے کام کرنا چاہتا ہوں۔ جب وہ کام اچھا چل جائے تو اس سے بھی تنگ آ جاتا ہوں۔ پھر ایک نیا کام اور پھر ایک اور۔ پھر ایک اور۔۔۔'' یہ اتنا بھی جھوٹ نہیں تھا لیکن اس نے تھوڑا زیادہ بڑھا کر بیان کر دیا تھا۔

''اسٹرینج۔۔۔ لاسٹ ٹائم تک جب ہم ملے تھے تو مجھے نہیں لگا تھا کہ آپ کی ایسی نیچر ہے۔'' وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''لاسٹ ٹائم آپ نے میرا اتنا تفصیلی انٹرویو لیا نہیں تھا نا جیسے اب لے رہی ہیں۔ مجھے تو ایسے لگ رہا ہے کہ میں کسی آفس میں جاب کے لئے آیا ہوں یا ضرورت رشتہ کے آفس۔۔ جاب تو آپ مجھے دینے سے رہیں تو کیا۔۔؟'' اس آخری بات پہ اسمارہ کے چہرہ مارے خفت کے سرخ ہوا تو سموئیل کو اپنی چلتی زبان کو قابو کرنا پڑا۔ اسے یک دم سمیرا یاد آئی۔ اپنی پرانی حرکت یاد آ گئی تو شرمندگی نے اسے گھیر لیا۔ وہ سچ میں یہ سب نہیں کہنا چاہتا تھا۔ وہ لڑکیوں کی عزت کرتا تھا لیکن اس وقت ایسی گھٹیا باتیں کرنا اس کی مجبوری تھی۔ ممی نے اسے برا پھنسایا تھا۔۔۔ بلکہ بری طرح گرایا تھا اپنی نظروں میں۔

وہ خاموش ہو گیا۔ خاموشی سے نظریں نیچی کئے کھڑا رہا۔

''سوری۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' بالآخر اسے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کہنا پڑا۔ اسمارہ زبردستی کا مسکرائی۔

''اٹس او کے۔ آپ کے فرینڈ آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔'' وہ خود ہی ایک طرف سے نکل گئی۔

سموئیل کو خود پہ افسوس ہوا۔

ایک بار یہ معاملہ نبٹ جاتا تو وہ اسمارہ سے ملاقات کر کے اپنے اس رویے پہ دل و جان سے معافی مانگ لیتا۔

پھر سارا فنکشن اس نے بوجھل دل سے نبٹایا تھا۔

رات کو ممی اس کے کمرے میں آئیں تو اس نے وہ کہا جو وہ سوچ بیٹھا تھا۔ ممی نے بے حد حیرت سے اس کی بات سنی تھی۔

''تم نے جو کہا ہم نے مان لیا ممی۔ جیسے چاہا وہ پورا کیا۔ ہمارے بھی خواب تھے بیٹے کو لے کر لیکن ہم نے ان خوابوں کو ایک طرف رکھ کر تمہارے خواب پورے کیے۔ لیکن اب یہ نئی ضد کیا ہے کہ تم اسپیشلائزیشن کے لئے باہر جانا چاہتے ہو۔۔۔؟ تم کب سے باہر جانے کی پلاننگ کرنے لگے۔۔۔؟''

''اس میں کیا برا ہے ممی۔۔۔؟ سب ہی باہر جا کر اسپیشلائزیشن کرتے ہیں۔ میں جانا افورڈ کر سکتا ہوں تو کیوں نا جاؤں۔۔۔؟'' یہ دوسرا عجیب جملہ تھا جوان کے بیٹے کے منہ سے نکلا تھا۔ وہ جتنا اپنے ملک سے محبت کرتا تھا کبھی ہجرت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا جینا مرنا اس کا ملک تھا۔ وہ کبھی اسے چھوڑنے کی بات بھی منہ سے نہیں نکالتا تھا حالانکہ اس کے کتنے دوست باہر جا کر سیٹل ہو چکے تھے۔ بابا نے تو خود اس کے میڈیکل میں ایڈمیشن کے وقت اسے کہا تھا کہ وہ باہر چلا جائے تب وہ نہیں مانا تھا اور اب۔

''بیٹی کا جانا تو مجبوری ہے کہ اسے رخصت تو کرنا ہی تھا ہم نے۔ اور تم۔۔۔ ہم بڑھاپے کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ ہم بڑھاپے میں کیا کریں گے۔۔۔؟ کیا سارا دن بیٹھ کر ٹی وی دیکھا کریں گے اور تمہاری یاد میں آہیں بھریں گے۔ یہ یاد کریں کہ ایک بیٹا تھا ہمارا بھی جو باہر چلا گیا۔۔۔ تمہارے فون کا انتظار کریں گے اور آنے کے دن گنیں گے۔ جب جانا چاہیے تھا تب گئے نہیں اور اب جب یہاں رہنے اور شادی کرنے کا وقت ہے تو یہ نئی بات سوجھ رہی ہے۔ کیا تم نے پکا سوچ رکھا ہے کہ ہر اس کام کی مخالفت کرو گے جو ماں باپ کو پسند ہو۔۔۔؟'' ممی جذباتی ہو گئی تھیں، اتنا کہ آخر تک ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ آواز بھرا گئی۔ سموئیل کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر ماں کو گلے سے لگا لیا۔

''صرف سوچا تھا ممی۔ چلا تو نہیں گیا نا۔'' وہ کتنی دیر ماں کو خود سے بھینچ کر تھپکتا رہا۔ وہ اس کے سینے سے لگیں کسی ننھی بچی کی طرح سسک رہی تھیں۔

''اچھا کہیں نہیں جاتا۔ آپ کو روتا چھوڑ کر تو جا بھی نہیں سکتا میں۔۔۔ بس اب آپ دوبارہ سے

میری شادی کی کوئی بات نہیں کریں گی۔۔۔ نہ ہی مجھے مجبور کریں گی۔۔۔ اور وہ اسمارہ۔۔۔ اس کی بات اس کے پیرنٹس جہاں کرنا چاہتے ہیں کرنے دیں۔ انہیں میری طرف سے کوئی امید مت دلائیں پلیز۔'' ممی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔

فنکشن میں اسمارہ سے اس کی کیا بات ہوئی وہ نہیں جانتی تھیں لیکن وہ ان کا بیٹا تھا۔۔۔ سمجھ گیا تھا کہ ممی نے اسمارہ اور اس کی فیملی کو کیوں بلایا تھا۔ اور تبھی فنکشن کا اختتام ہوتے ہی اس نے یہ باہر جانے کا شوشا چھوڑا تھا۔

''انسان کی اکلوتی اولاد اتنی بڑی بلیک میلر نہ ہو۔'' سموئیل ان کی بات پہ ہنسی دباتا ایک طرف ہو گیا۔

ممی کو ایک پل لگا تھا سمجھنے کے لئے کہ شادی کے معاملے کو التوی میں ڈالنے کے لیے اس نے یہ سب ڈرامہ کیا تھا۔ وہ اس کی ماں تھیں، اتنا تو بیٹے کو جانتی تھیں کہ وہ کس کس طرح سے اپنی بات منوانے کا عادی تھا۔

دو دن بعد ہی زرینہ کی خود سے کال آ گئی تھی۔

''عابدہ! آئی ایم سوری لیکن اسمارہ کو سموئیل پسند نہیں آیا۔ وہ اس سے شادی سے منع کر رہی ہے۔'' ممی نے نادم سی زرینہ کی بات پہ زیادہ حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ جانتی تھیں کہ سموئیل اسمارہ کو کیوں پسند نہیں آیا ہوگا کیونکہ وہ چاہتا ہی نہیں تھا کہ اسمارہ اس کو پسند کرے۔

''اسے سموئیل تھوڑا روڈ لگا ہے۔۔۔ اس کی کئی باتوں پہ اسے اختلاف ہے۔ اسے نہیں لگتا کہ وہ دونوں ساتھ چل سکتے ہیں یا اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے جھجک رہی تھیں۔

ممی کا سن کر پارہ بڑھ رہا تھا۔ لیکن بہت مشکل سے سموئیل پہ آتے غصے کو اپنے لہجے اور انداز پہ اثر انداز ہونے سے روکے رکھا۔

''کوئی بات نہیں زرینہ۔ بچوں کی اپنی پسند ہے۔ جیسے وہ خوش، ویسے ہم خوش۔ اسمارہ تو اتنی اچھی بچی ہے کہ اسے ایک سے ایک اچھا لڑکا مل جائے گا۔ جہاں تک سموئیل کی بات ہے اسے بھی اچھی

لڑکی مل ہی جائے گی۔ میرا بیٹا اتنا بھی برا نہیں ہے۔'' وہ تعلقات خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں اسی لئے بات کو خوش اسلوبی سے ختم کر دیا۔ بیٹے کی برائی نہیں سن سکتی تھیں اسی لیے جتا بھی دیا کہ وہ اتنا بھی گرا پڑا نہیں ہے۔ لیکن سموئیل پہ چڑھا غصہ رات تک بھی کم نہ ہو سکا۔

''زرینہ کی کال آئی تھی۔ اسمارہ نے سموئیل کے لئے منع کر دیا ہے۔'' ممی نے بھی کھانے کی میز پہ ہی ذکرِ خیر چھیڑا۔ ان کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب تھا۔ انکار ہی ہونا تھا تو ان کی طرف سے ہونا چاہئے تھا۔ اتنی سبکی تو نہ ہوتی۔ بیٹے کا مسترد کیے جانا ماؤں کو اچھا نہیں لگتا ہوتا۔ انھیں کیسے اچھا لگ سکتا تھا جبکہ ان کا بیٹا ویسا تھا ہی نہیں جیسا اسمارہ کو لگا تھا۔

بابا کا منہ تک جاتا چمچہ وہیں معلق ہو گیا۔ کوئی ان کے شہزادے بیٹے کو بھی منع کر سکتا تھا انہیں یقین نہیں آیا۔ لیکن سامنے کھانا کھاتا وہی شہزادہ بے فکری سے بیٹھا مزے سے کھانا کھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ کوئی اچنبھے کا تاثر نہیں تھا البتہ سکون ضرور تھا۔

بابا نے چمچہ پلیٹ میں رکھ دیا۔

''پہلے تو وہ لوگ بار بار فون کر رہے تھے۔ بات آگے بڑھانا چاہتے تھے تو اب کیا ہوا۔۔۔؟'' ممی نے شاکی نظروں سے بیٹے کو دیکھا جو سر جھکائے ''بیبا بچہ'' بنا کھانا کھا رہا تھا۔ معاملے سے لاتعلقی کا ایسا اظہار تھا کہ مجھے کیا پتہ کس کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔

''اسمارہ کو سموئیل پسند نہیں آیا۔''

''کیا کمی ہے سموئیل میں۔۔۔؟'' ممی اب کیا کہتیں کہ جو جان بوجھ کر کسی کے سامنے اپنی ایسی کمیاں ظاہر کرے جو اس میں ہیں ہی نہیں تو اسمارہ کا کیا قصور۔

''ہر کسی کی اپنی پسند ہوتی ہے عباد صاحب۔ اس بچی کو اب ہم زور زبردستی سے منا تو نہیں سکتے۔''

''اسمارہ کو کیا بھائی پسند نہیں آیا، وہ بھی بھائی کو پسند نہیں آئی ہو گی۔ کیا اس کا گیٹ اپ ایسا تھا جو بھائی کے معیار کے مطابق ہوتا۔؟'' منہا کی بات پہ پہلی بار سموئیل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی بہن اسے کتنا جانتی تھی۔

"کیا خرابی تھی اس کے گیٹ اپ میں۔۔۔آج کل بچیاں ایسا ہی تیار ہوتی ہیں۔اب کیا فنکشن پہ ماسی بن کر آجاتی۔۔۔؟" ممی کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

"خرابی اس کے گیٹ اپ میں نہیں تھی لیکن بھائی کو سمپل لڑکیاں پسند ہیں اور آپ یہ بات جانتی ہیں کہ بھائی کبھی کسی ماڈرن لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔اگر اسمارہ جیسی ماڈرن لڑکیوں سے ہی شادی کرنا ہوتی تو ایسی لڑکیاں تو جا بجا ہیں۔" سموئیل نے تو حیرت کے اس پہاڑ تلے دب ہی جانا تھا۔

بابا ممی دونوں نے سموئیل کو دیکھا تو وہ نظریں چرا گیا۔

"وہ صرف ماڈرن یا فیشن ایبل نہیں ہے بلکہ اسے گھریلو معاملات میں بھی دلچسپی ہے۔اس دن میں جب ان کے گھر گئی تھی تو اتنے زبردست شامی کباب اور پاستا اس نے بنایا ہوا تھا۔آج کل کہاں بچیاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر کے کچن کی شکل بھی دیکھتی ہیں۔تمہیں آتا ہے یہ سب۔۔۔؟" ممی نے منہا کی بھی ٹھیک ٹھاک کلاس لے ڈالی۔

منہا ان کی بات پہ مسکرا دی۔

"مجھے یہ سب نہیں آتا ممی مگر مجھے جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔" انھوں نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"جن کھانوں کو وہ اور اس کی ممی بہت فخر سے اس کا بنایا ہوا بتا رہی تھیں دراصل وہ فوڈی وڈی سے منگوایا گیا تھا۔" سموئیل اور بابا کھانا روک کر یہ بحث سن رہے تھے۔

"تمہیں کس نے کہا یہ۔۔؟"

"کیونکہ میں نے خود اسمارہ کے بک ریک پہ ان چیزوں کا بل پڑا دیکھا تھا جو اس دن کی تاریخ کا تھا۔" ممی اس انکشاف پہ تلملا اٹھیں۔شرمندہ بھی نظر آنے لگیں۔بابا نے ہی پھر بات سمیٹی۔

"ایک اسمارہ پہ دنیا ختم نہیں ہو جاتی۔آپ اور کوئی لڑکی دیکھ لیں۔"

"میرا خیال ہے پہلے یہ سکون سے اپنی اسپشلائزیشن مکمل کر لے،منہا کی رخصتی ہو جائے تو اس بارے میں سوچتے ہیں۔" ممی کو اس سے کیا گیا اپنا معاہدہ یاد تھا۔بابا نے شانے اچکائے۔یہ ڈیپارٹمنٹ ممی کا تھا اور وہ بہتر جانتی تھیں کہ کب کیا ہونا چاہیے۔سموئیل نے ماں کو ممنون نظروں سے

دیکھا جو بیٹے کو شاکی نظروں سے گھور رہی تھیں۔

وہ نظریں چرا کر مطمئن سا کھانا کھانے لگا۔ اسمارہ کا باب تو تمام ہوا تھا۔

دو ہفتے بعد ہی اسمارہ کی منگنی کا کارڈ آ گیا۔ اس کی شادی خاندان کے ایک میڈیکل اسپیشلسٹ سے ہو رہی تھی۔ ممی نے کارڈ دیکھ کر سرد آہ بھری۔

''اچھی لڑکیاں بیٹھی تو نہیں رہتیں۔'' ممی کا موڈ اس دن برا ہی رہا۔

اسمارہ کی منگنی پہ وہ نہیں گیا تھا۔ ممی، منہا اور بابا ہی گئے تھے۔ ممی واپس آ کر اس کی قسمت پہ رشک کر رہی تھیں جو اتنی زبردست فیملی اور لڑکا اسے ملے تھے۔ فنکشن کی تعریف ہو رہی تھی۔ انتظامات کو سراہا جا رہا تھا۔

''خیر اب لڑکا اتنا بھی اچھا نہیں تھا۔ اسمارہ سے صاف عمر میں دس برس تو بڑا لگ ہی رہا تھا۔ اصل میں پتا نہیں کتنا بڑا ہو گا۔'' منہا بھی بولتے وقت کسی کا لحاظ نہیں کرتی تھی۔ وہ یوں بھی خاصی منہ پھٹ مشہور تھی۔

''ایک ویل سیٹیلڈ ڈاکٹر سے اس کی شادی ہونے جا رہی ہے جو امریکہ سے سرجری میں اسپیشلائزیشن کر کے آیا ہے تو کیا وہ بیس برس کا نوجوان ہو گا۔۔۔؟ ویل سیٹیلڈ مرد تو بڑی عمر کے ہی ہوتے ہیں۔۔۔ ویسے بھی مردوں کی عمر کا کیا ہے، کمائی دیکھنی چاہیے۔ اسمارہ کے ساتھ جچ رہا تھا۔'' نجانے کیوں ممی کو اسمارہ سے رشتہ نہ ہونے کا اتنا قلق تھا حالانکہ اب تو ان پہ ثابت بھی ہو گیا تھا کہ وہ گھریلو امور میں کوئی دلچسپی شسپی نہیں رکھتی تھی۔۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ پھر بھی ممی کو کیوں بیٹے کے لئے وہ دنیا کی واحد لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

منہا نے ''واٹ ایور'' والے تاثرات دیے اور چلی گئی۔

سموئیل نے کمرے میں جا کر اسمارہ کو مبارکباد کا پیغام بھیجا تھا۔ بھلے وہ سمجھ رہی ہو کہ اس نے سموئیل کو ٹھکرایا تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ اس نے خود حالات ایسے پیدا کئے تھے کہ وہ ٹھکرایا جائے۔

''صرف مبارک دیں گے۔۔۔؟'' اس نے انگریزی میں جواب دیا۔

''اور کیا کرنا چاہئے۔۔۔؟''

''میرا شکریہ ادا کرنا چاہئے سموئیل عباد کہ میں نے خود انکار کر کے آپ کو اس زحمت سے بچا لیا ۔''سموئیل کو اس کا پیغام دیکھ کر جھٹکا لگا۔وہ جیسا سمجھ رہا تھا ویسا نہیں تھا۔

کچھ دیر وہ موبائل ہاتھ میں لئے خاموشی سے اس پیغام کو دیکھتا رہا پھر اس نے یک دم اسے کال ملا دی۔

''تم جانتی تھی کہ۔۔۔''وہ جملہ مکمل کرنا اسے تضحیک لگا تھا اور وہ مزید اسمارہ کو بے عزت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''تو آپ کو کیا لگا کہ میں انجان ہوں۔کیا میں آپ سے پہلی بار ملی تھی کہ آپ کا برتاؤ مجھے نہ الجھاتا۔ہم کتنی بار پہلے بھی مل چکے تھے سموئیل۔۔۔اور میں جانتی ہوں کہ آپ کتنے سلجھے ہوئے، مہذب انسان ہو اور ایسا انسان اگر یک دم اتنا بدتمیز ہو جائے، جاہلوں کی طرح برتاؤ کرے تو کیا تب بھی سمجھ نہیں آئے گی کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا ہے۔''سموئیل پہلے سے زیادہ اب شرمندہ تھا۔

''اپنے رویے کے لیے معافی چاہتا ہوں۔''اس نے انگریزی میں کہا۔

بعض جملے زبان بدل لینے سے زبان پہ بھاری نہیں گزرتے۔انگریزی زبان میں یہ خاصیت تو ہے یہ ماننا پڑے گا۔

''آپ یہ سب مجھے ڈائریکٹ بھی کہہ سکتے تھے۔''

ان دونوں میں کوئی ایسی بے تکلفی تو تھی نہیں کہ وہ اسے یہ سب براہِ راست کہہ دیتا۔اسے یہی طریقہ بہتر لگا تھا اس سے جان چھڑانے کا کہ لڑکیاں کسی لڑکے کی بدتمیزی برداشت نہیں کرتیں۔یہ ان کی نازک صنف پہ بے حد گراں گزرتا ہے۔اس نے پھر یہی حربہ اپنایا۔۔۔اوچھا تھا لیکن کارگر ثابت ہوا تھا۔

''تمہیں اندازہ کیسے ہوا کہ۔۔۔؟''

''کہ آپ مجھ سے شادی میں دلچسپی نہیں رکھتے۔۔۔؟''اس کا جملہ اچک کر اسمارہ نے مکمل کیا ۔سموئیل خاموش رہا۔

''آپ وہاں سب سے اسی مہذب انداز میں پیش آتے رہے، سوائے میرے۔ تو اس کا کیا مطلب تھا کہ آپ صرف مجھ سے ہی ایسا برتاؤ کر رہے ہیں۔ اسی لئے نا کہ آپ مجھ سے جان چھڑا رہے ہیں۔ تو جو انسان مجھ سے جان چھڑانے کے لئے ایسا کر رہا تھا مجھے کیا ضرورت تھی اس کی جان کو آنے کی۔۔۔؟'' اسمارہ نے یہ سب بالکل ہلکے پھلکے انداز سے کہا۔ اسے کوئی دکھ یا غصہ نہیں تھا۔

سموئیل نے گہرا سانس لیا۔

''تھینک یو اسمارہ۔۔۔ یو آر رِچ آ نائس سول۔۔''

''ابھی بھی سوچ لیں۔ ابھی صرف منگنی ہوئی ہے۔۔۔؟'' اس کی کھنکتی آواز پہ وہ ہنس دیا۔

''نو پلیز۔۔۔'' اسمارہ کا قہقہہ بلند ہوا۔

''نائس سول ہوں۔۔۔ لیکن وہ نہیں ہوں جو آپ کو چاہئے۔'' سموئیل خاموش ہو گیا۔

''وہ جو بھی ہے سموئیل آپ کو آنٹی کو بتا دینا چاہئے۔ اس سے پہلے کہ آنٹی کوئی اور اسمارہ ڈھونڈ لیں۔ اب ہر اسمارہ تو میرے جیسی نہیں ہو گی جو رستے سے ہٹ جائے۔'' سموئیل اس کی بات بالکل گنگ رہ گیا تھا۔

کال کے بعد وہ کتنی دیر ٹیرس پہ کھڑا اس کی باتوں کو سوچتا رہا۔

ممی کی بات یاد آئی کہ اچھی لڑکیاں زیادہ دیر تک تو نہیں بیٹھی رہتیں اور پہلی بار اس کے دل کو کچھ ہوا۔

''وہ تو بہت اچھی لڑکی تھی۔ وہ کہاں اس کے لئے بیٹھی ہو گی۔'' اس نے تصور میں اسے سوچا۔

''آئینور فاطمہ گل۔۔ کاش کہ تم پوری دنیا کے لئے گندی لڑکی بن جاؤ اور ابھی تک بیٹھی ہوئی ہو۔ بس ایک بار میں تمہیں ڈھونڈ نکالوں۔'' بڑی شدت سے اس نے دعا کی تھی۔

☆......☆......☆

وہ کالج جانے لگی تو اس کے برابر والے سیکشن میں، جو فائن آرٹس کا تھا، میں اسے دو شناسا چہرے دکھائی دیے۔ اعظمی اور سندس کا۔۔۔ وہ دونوں آرٹس اکیڈمی میں اس کی اسٹوڈنٹس تھیں اور اس سے فلاور میکنگ سیکھتی رہی تھیں۔ کچھ دن جیولری میکنگ کی کلاس میں بھی آئی تھیں۔ ان دونوں کو یہاں

دیکھ کر اس کا سانس تو رکا ہی رکا وہ دونوں منہ کھولے حیرت سے اپنی استانی کو یونیفارم پہنے، چوٹی بنائے، بیگ اٹھائے، انہی کی کلاس کے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے دیکھ رہی تھیں۔

''مس آپ یہاں۔۔۔؟'' سندس کہے بنا نہیں رہ سکی۔

''کیسی ہیں آپ دونوں۔۔؟'' وہ پھیکا سا مسکرادی۔

ہم میں سے اکثر اپنی اصل دوسروں کے سامنے عیاں ہونے سے گھبراتے ہیں۔ اسے بھی ایک جھجک سی ہو رہی تھی۔

''ہم تو ٹھیک ہیں مس مگر آپ فرسٹ ایئر میں آئی ہیں۔۔؟ آئی مین آپ چھوٹی لگتی تھیں لیکن آپ ہماری کلاس فیلو ہوں گی یہ ہمیں نہیں پتا تھا۔'' سندس ذرا منہ پھٹ سی تھی۔ اسے خاموش رہنا نہیں آتا تھا۔

اعظمی نے سندس کو کہنی ماری۔ اسے مس کی رنگت دیکھ کر برا لگا تھا۔

''میں نے بیچ میں گیپ دیا تھا۔'' خود پہ قابو پاتے اس نے کہہ دیا۔ اعظمی مسکرادی۔

''اٹس اوکے مس۔۔۔ کچھ بھی سکھانے والا استاد ہی ہوتا ہے بھلے اس کی عمر کچھ بھی ہو۔ ہمیں آپ سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔'' فاطمہ کو اس کا جملہ اچھا لگا تھا۔ اس کے اعتماد میں کچھ اضافہ ہوا۔ وہ بھی مسکرادی۔ اس کا دل کیا ان دونوں کو منع کردے کہ وہ یہ بات کسی دوسرے کے سامنے مت دہرائیں لیکن پھر اس نے خود کو کہنے سے باز رکھا۔ وہ دہرا بھی دیتیں تو کیا فرق پڑ جانا تھا۔

کالج کے ساتھ ساتھ وہ شام میں ہمدان کو بھی پڑھاتی تھی۔ ایک دو سوال سمجھا دیتی تو آگے وہ خود کرتا جاتا۔ حساب کے علاوہ باقی مضامین تو یوں بھی ایک بار سمجھ کر یاد کرنے اور لکھ کر دکھانے کے ہوتے تھے۔ کچھ ایسا بھی مشکل نہیں تھا۔ فیس اس کے کہے بنا دوگنا بڑھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ التفات کیوں کیے جارہے تھے لیکن اس نے منع نہیں کیا۔ تین گھنٹے وہ اس سے پڑھتا تھا اگر وہ اتنا لے لیتی تو کیا حرج تھا۔ ہوم ٹیوٹرز ٹھیک ٹھاک فیس لیتے ہیں۔ بھلے وہ ہوم ٹیوٹر نہیں تھی لیکن محنت، وقت اور توجہ مکمل طور پہ اسی طرح دیتی تھی اور پھر ہمدان کے علاوہ اس کے پاس کون سے بچوں کا جمگھٹا تھا۔ یوں ٹیوشن اور اپنی پڑھائی بہت اچھے سے چل رہے تھے۔

"چاچو اس دن آپ کا پوچھ رہے تھے۔" یک دم اسے بیٹھے بیٹھے یاد آ گیا۔ وہ تھوڑا چونکی اور پھر لاپرواہ بن گئی۔

"اچھا۔۔۔" اس نے کسی بھی تاثر کو چہرے پہ آنے سے باز رکھا۔

"پوچھیں گی نہیں کہ کیا پوچھ رہے تھے۔۔۔؟" اسے لگا تھا کہ وہ اشتیاق سے پوچھے گی۔

"نہیں۔۔۔" وہ اپنا کام کرتی رہی۔

"آپ تو کبھی ان کا نہیں پوچھتیں۔ وہ پوچھتے ہیں تو بھی نہیں پوچھتیں کہ وہ کیا پوچھ رہے تھے۔۔۔؟"

فاطمہ نے اسے گھورا۔۔۔اف یہ ہمدان۔

"آپ کی طبیعت کا پوچھ رہے تھے کہ کوئی پریشانی تو نہیں۔ پڑھائی ٹھیک سے جا رہی ہے۔ کچھ چاہیے تو نہیں۔۔۔ یہ بھی کہ آپ ان کی باتیں کرتی ہیں تو میں نے کہا کہ نہیں کرتیں۔ وہ کہنے لگے کہ تم خود کر لیا کرو میری باتیں اور جو جواب وہ دیں وہ مجھے بتا دیا کرو۔ مگر مجھے لگتا نہیں ہے کہ آپ ان کی کوئی بات کرنے میں انٹرسٹڈ ہیں۔" فاطمہ کو تھوڑی ہنسی سی آ گئی جسے اس نے چھپا لیا ورنہ وہ مزید شوخا ہو جاتا اور جا کر چاچو کو بھی بتاتا۔

"تمہیں بالکل ٹھیک لگتا ہے۔ ہم پڑھنے بیٹھے ہیں، باتیں کرنے نہیں۔" اس نے کاپی کی طرف پنسل سے اشارہ کیا کہ وہ کاپی پہ دھیان دے اور اپنا کام کرے۔ ہمدان مایوس سا ہو کر، منہ بناتا ہوا لکھنے لگ گیا۔

فاطمہ نے بھی اپنی توجہ پڑھائی پہ لگانا چاہی لیکن نجانے کیوں وہ شمشماد کہاں سے دماغ میں گھمسن گھیریاں ڈالنے لگا تھا۔ اس نے کئی بار اپنا دھیان مرکوز کرنے کی کوشش کی اور جب ناکام رہی تو کتاب بند کر دی۔ اٹھ کر پانی پیا، منہ دھویا، ایک دو چکر کمرے کے لگائے اور پھر سے پڑھنے بیٹھ گئی۔

ہمدان اسے کن اکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔

"کوئی پریشانی ہے کیا۔۔۔؟" فاطمہ نے اسے کچھ گھور کر دیکھا۔ یہ بچہ تھا یا ایکسرے مشین۔

بہت خطرناک بچہ تھا۔

''بالکل بھی نہیں۔''

''مجھے لگا کہ کچھ ہے۔ چاچو کو بھی شاید یہی لگا ہوگا۔''

''اپنا کام کرو ہمدان۔۔۔'' کچھ ڈپٹ کر وہ غصے والے تاثرات لا کر بولی تو وہ اب کی بار خاموشی سے اپنا کام کرنے لگا۔

جب جانے لگا تو کتابیں سمٹتے ہوئے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''اب تو چھٹی ہوگئی۔۔۔ اب بھی بات نہیں ہوسکتی کیا۔۔۔؟'' فاطمہ خاموش رہی۔

''چاچو کو کیا بتاؤں گا کہ کوئی بات نہیں ہوئی۔'' اسے رہ رہ کر بے چارے چاچو کا خیال آ رہا تھا۔

''انہیں یاد دلانا کہ انہیں بات کرنے سے منع کیا گیا تھا۔'' ہمدان نے برا سا منہ بنایا اور سر ہلا دیا۔

اس رات اس کا دماغ الجھا رہا تھا۔ کچی عمر کی پکی لڑکی کی زندگی میں بھی جب کوئی آ جائے تو دل تو اس کا بھی کچھ کچھ راہ سے ہٹتا ہی ہے۔ تھوڑا بہت تو سوچتا ہی ہے۔ ہلکا سا مسکراتا ہی ہے۔

اگلے دن جب ہمدان آیا تو اس کا چہرہ بڑا سنجیدہ تھا۔ کتابیں کھولتا گیا اور بولتا گیا۔

''چاچو کو میں نے میسج دے دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ بات کہاں کر رہا ہوں۔ میں تو کبوتر کے ہاتھوں پیغام بھیج رہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے پرانا دور لوٹ آیا ہے جہاں کبوتر پیغام لاتے لے جاتے تھے۔''

فاطمہ کا چہرہ کچھ لال پڑا۔

''مجھے ایک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اس جملے میں کبوتر کون ہے۔۔۔؟'' فاطمہ کے منہ سے ہنسی فوارہ چھوٹا۔ ہمدان نے گھور کر اسے دیکھا۔

''یعنی میرا شک ٹھیک ہے کہ کبوتر میں ہی ہوں۔'' فاطمہ ہنستی چلی گئی۔ ہمدان منہ پھلائے اب کتابیں نکال کر خود ہی سے پڑھنے لگ گیا تھا۔ فاطمہ بھی کچھ دیر بعد اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے اسے پڑھانے لگ گئی۔

روزانہ کوئی نا کوئی جملہ، کوئی بات ہمدان اس کے سامنے شمشاد کی کر دیا کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ

وہ نہ مل کر، نہ بات کر کے بھی سچ

میں اسے یاد دلانے کے لئے اس موٹے کبوتر کو بھیجتا ہے تاکہ وہ یاد رکھے کہ وہ اسے کتنا یاد رکھتا ہے۔ ذہن تو اس کا ایسے بھی تھوڑا بٹ ہی گیا تھا۔ ہمدان باز آنے سے رہا تھا۔ شمشاد بات کرنے سے منع نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے بسی سے بس خاموش رہتی اور دل و دماغ اندر سے بولنے لگتے۔

اس سب کا نتیجہ جلد سامنے آیا تھا۔ پہلی سہ ماہی میں اس کے نمبر اس کی توقع سے کم آئے تھے حالانکہ اس نے اپنی پوری کوشش کی تھی لیکن نتیجہ حسبِ منشا نہ آسکا۔ غصہ سارا ہمدان پہ نکلا تھا۔

''کل سے تم پڑھنے نہیں آؤ گے۔'' اتنے غصے سے کہا کہ ہمدان کی بولتی بند ہوگئی۔ وہ بس خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

''آج پڑھ لوں کیا۔۔۔؟'' بیگ زمین پہ رکھتے ہوئے اس نے فاطمہ کو دیکھا۔

''آج آخری دن ہے۔'' مہینہ ختم ہونے میں ویسے بھی دو دن ہی باقی تھے۔

''دو دن تو پڑھا ہی سکتی ہیں۔'' اس نے تاریخ کا اندازہ لگا کر کہا۔ فاطمہ خاموش رہی۔

''میرا قصور کیا ہے۔۔۔؟'' مسکین سی صورت بنا کر وہ وہیں بیٹھ گیا۔

''میری اپنی پڑھائی ڈسٹرب ہو رہی ہے تمہیں پڑھانے سے۔ میرے گریڈز کم ہو رہے ہیں۔ ایسا رہا تو میں کیسے میڈیکل میں جاؤں گی۔۔۔؟ میری محنت بے کار جائے گی۔'' سچ بھی یہی تھا۔

''پھر میں ایسا کیا کروں کہ ایسا نہ ہو۔۔۔'' فاطمہ نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول پڑا۔

''ٹیوشن ختم ہونے کے علاوہ بتائیں۔'' فاطمہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''تم خاموش رہا کرو۔'' اسے کہنا پڑا۔

ہمدان نے سر ہلایا۔۔۔ ''اب سے نہیں بولوں گا۔۔۔'' وہ جھٹ سے نہ بولنے پہ آمادہ ہو گیا جو کہ دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔

''منظور ہے۔۔۔ بس مجھے پڑھانا نہیں چھوڑنا۔'' فاطمہ اس کے سامنے بے بس ہو جاتی تھی۔ نجانے کیا تھا اس بچے میں کہ وہ اسے منانا جانتا تھا۔

اگلے دن وہ نہیں آیا لیکن شام بیل بجنے پہ اس نے گیٹ کھولا تو سامنے شمشاد کھڑا تھا۔ فاطمہ کی سانس پل بھر کو تھم گئی۔

"آپ نے ہمدان کو آنے سے کیوں روکا۔۔۔؟ آپ جانتی بھی ہیں کہ وہ آپ سے ہی پڑھنا چاہتا ہے۔"

اس کا لہجہ ہموار تھا۔ فاطمہ کو ہمت ہوئی کہ وہ کہہ دے اسے جو بھی کہنا ہے۔ یہ موقع اسے بار بار نہیں ملنا تھا۔

شمشماد خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ فاطمہ کو الجھن ہونے لگی۔ وہ بھلے اس سے ایسی ویسی کوئی بات نہیں کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں جو اتنا چیخ چیخ کر بول رہی تھیں کہ فاطمہ کو اپنا دل بری طرح دھڑکتا محسوس ہوا۔ منگنی کے بعد یہ پہلی بار تھا کہ وہ دونوں روبرو ہوئے تھے۔ وہ پہلی بار اس قسم کے جذبات سے واقف ہوئی تھی۔ اپنی ہی کیفیات اسے سمجھ میں نہیں آرہی تھیں لیکن اتنا وہ اعتراف کرتی تھی کہ رشتہ بھلے گھر والوں کی مکمل مرضی سے طے ہوا تھا لیکن اپنے دل و دماغ سے وہ اس انسان کا خیال مکمل طور سے جھٹک نہیں پائی تھی اور اب تو وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

بڑی مشکل سے ہمت کر کے اس نے خود کو کہنے کے قابل بنایا۔

"میں اسے پڑھا دوں گی لیکن میری ایک شرط ہے۔۔۔"

ناول سپاس گزار کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 7

اس کی بات پہ شمشاد کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

''کیسی شرط۔۔۔؟''

''ہمدان آپ کے بارے میں مجھ سے آئندہ کوئی بات نہیں کرے گا اور یہ بات پہلے آپ کو سمجھنا ہوگی کہ آپ خود اس بچے سے میرے متعلق بات نہیں کریں گے۔'' وہ اس کی بات پہ اس کی شکل دیکھنے لگا تو فاطمہ نے نظریں چرا لیں۔

''رشتے کے وقت میرے نہ بات کرنے کی شرط رکھی گئی تھی تو میں نے تو کبھی آپ سے بات کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ نہ آپ سے رابطہ کرنے کی کوئی کوشش کی۔ اب اس بچے کے بات کرنے سے آپ کو کیا مسئلہ ہے۔۔۔؟ کیا مجھے اپنی زندگی میں کہاں بولنا ہے، کیا بولنا ہے آپ سے پوچھ کر کرنا ہوگا۔؟'' اسے برا لگا تھا۔۔۔ بالکل برا لگا تھا کیونکہ اس کی مردانہ انا یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ وہ اس کی ہر بات پہ آمنا و صدقنا کہہ دے۔ وہ جس ماحول میں پلا بڑھا تھا وہاں عورتوں کی کم ہی سنی جاتی تھی۔ اس نے گھر میں اپنی ماں کی بھی کم ہی سنی تھی اور وہی کرتا تھا جو اس کا من کہتا اور یہاں وہ اس کی سنے چلا جا رہا تھا۔

''آپ اس سے میرے بارے میں پوچھتے رہیں گے، ذومعنی طریقے سے پیغامات پہنچاتے رہیں گے، وہ ہر بات میں آپ کی بات کرے گا، تو کیا میں ڈسٹرب نہیں ہوں گی۔۔۔؟'' شمشاد نے آبرو اچکا کر اسے دیکھا۔

''اس میں کیا ڈسٹرب ہونے والی بات ہے میں بالکل نہیں سمجھ پا رہا۔۔۔؟''

اب وہ اسے کیا سمجھاتی کہ وہ اس کی بات کرتا ہے تو ہمدان من و عن اسے بتا دیتا ہے اور وہ اپنے

دل کو اسے سوچنے سے روک نہیں پا رہی۔ وہ بھی عام لڑکیوں کی طرح سے سوچنے لگتی ہے کہ اس کا ایک عدد منگیتر ہے جو اسے چاہتا ہے، اس کی پرواہ کرتا ہے اور سارا مسئلہ یہی تھا کہ وہ عام لڑکی نہیں بننا چاہتی تھی۔

وہ چاہتی ہے کہ وہ فی الحال اس کی زندگی سے کسی آسیب کی طرح غائب ہو جائے تاکہ اس کا نشان تک باقی نہ رہے۔ اسی طرح وہ یکسو ہو کر پڑھائی کر پائے گی۔

''مگر میں ہوتی ہوں ڈسٹرب۔۔۔ آپ مہربانی فرما کر اس سے میرا تذکرہ مت کیا کریں۔''
ایک ٹھنڈی آہ شمشاد کے منہ سے نکلی اور اس نے سر ہلایا۔ وہ سر جو وہ ہلانا نہیں چاہتا تھا وہ ہل گیا۔ نجانے کیوں وہ اس لڑکی کے سامنے ایسا بے بس ہو جاتا تھا کہ اس کی کہی سب مان لیتا تھا۔ ایسا کیا تھا اس میں کہ دل عجب طرح سے اس کی جانب کھنچتا تھا۔

''نہیں کروں گا۔۔۔ اور کچھ۔۔۔؟'' فاطمہ نے سر نفی میں ہلایا۔

''کیا کوئی شرط میں بھی رکھنے کے لائق ہوں یا میرا کام بس مانتے رہنا ہے۔۔۔؟'' اس کے سوال پہ فاطمہ کا دل ڈر گیا۔ وہ اس کی کسی شرط کی پابند نہیں ہونا چاہتی تھی پھر بھی اس نے سر ہلایا کہ وہ کہے کیا کہنا چاہتا ہے لیکن اس ہاں میں یہ اعتراف نہ تھا کہ وہ اس کی شرط مان بھی جائے گی۔

شمشماد نے کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھا پھر بولا۔

''ابھی نہیں۔ میں اپنی شرط کو آنے والے وقت پہ اٹھاتا ہوں۔'' فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایسا کیا تھا کہ وہ ابھی نہیں کہنا چاہتا تھا اور آنے والے وقت کے لئے ادھار کر رہا تھا۔ اسے آنے والے وقت سے ڈر لگا تھا۔

''رابطہ میں نہیں رکھ سکتا، آپ سے کبھی مل نہیں سکتا، ہمدان تک سے بات نہیں کر سکتا، میرے نام کی انگوٹھی آپ کی انگلی میں نہیں ہے۔۔۔ کیا میں کہیں آپ کی زندگی میں ہوں بھی یا نہیں۔۔۔؟'' وہ خاموش رہی تھی۔

انگوٹھی اس نے گم ہونے کے ڈر سے امی کے پاس رکھوا دی تھی لیکن اس سے وضاحت نہ دی گئی۔ اپنی وضاحت دینا آئینور فاطمہ گل کو دنیا کا مشکل ترین کام لگتا تھا۔

شمشاد نے اس کی خاموشی پہ ایک گہری نظر اس پہ ڈالی اور تلخی سے مسکرا دیا۔ اسے دیکھ کر جو چمک فاطمہ کی نظروں پہ، چہرے پہ آنا چاہئے تھی وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح اجنبی تھے جیسے پہلے تھے۔۔۔ میں ہمدان کا چاچو ہوں۔۔۔ میں اس کی ٹیوٹر ہوں۔۔۔ اور بس۔۔۔

اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا اور تیزی سے واپس مڑ گیا۔ فاطمہ نے اس کے تیزی سے ڈگ بھرتے قدموں کو دیکھا۔ اس کا کہا آخری جملہ اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

وہ دروازہ بند کر کے اندر ہوئی تو امی اسے پھر سے ویسی ہی نظروں سے گھور رہی تھیں جیسے پہلے دیکھتی تھیں۔

''بات ہی کرنا ہوتی ہے تو اندر بلا کر کیا کرو۔۔۔ یوں دروازے میں کھڑے ہو کر بات کرنے سے سو باتیں بنیں گی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اپنی ماں کو کبھی نہیں سمجھا سکتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے حساب سے سمجھتی تھیں۔

''جب خود بات کرنا ہو گی تو بلا لوں گی۔ ابھی وہ خود ہمدان کی بات کرنے آیا تھا۔ آئندہ یہ نوبت بھی نہیں آئے گی۔'' امی نے خائف سی نظروں سے اسے دیکھا۔ اس لڑکی سے کوئی بعید بھی نہ تھی کب کیا کر جاتی۔ چپکے سے انگوٹھی اٹھاتی اور کہتی یہ لو اور پھر واپس لوٹ کر مت دیکھنا اور پھر کسی کھانے پہ سہولت سے ماں باپ کو بتا دیتی کہ شمشاد سے تعلق توڑ لیا ہے میں نے۔ اب اس موضوع پہ کوئی بات نہ کرے۔۔۔ ہاں وہ یہ سب کر سکتی تھی انہیں ڈر لگتا تھا۔ اولاد جب مضبوط ہو جائے تو ڈر لگنے ہی لگتا ہے اور فاطمہ اپنی شخصیت میں اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ انہیں سچ میں اس سے ڈر لگتا تھا۔

''کہیں کچھ ہوا۔۔۔''

اس نے کوفت سے ماں کی بات کاٹی۔

''کچھ نہیں ہوا۔۔۔'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگیں۔

اس نے ماں کا شانہ نرمی سے تھپکا اور اندر چلی گئی۔ یہ اس کی طرف سے دلاسہ تھا کہ امی کچھ بھی نہیں ہوا۔ انہوں نے گہرے گہرے سانس لئے اور اپنا سینہ تھپکا۔ یہ ان کی خود کو تسلی تھی کہ کچھ نہیں ہوا۔

لیکن جب تک وہ ساری بات ابا سے نہ کہہ دیتیں تسلی کہاں ہوتی تھی۔ یہ بھی ہمارے ہاں کی اکثر ماؤں کی سائیکی ہے۔ سوامی نے اسی طرح ڈرتے ڈرتے ابا کے پاس جا کر ساری روداد بتاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس لڑکی سے ڈر لگتا ہے۔۔۔ اپ کو منگنی نہیں کرنا چاہئے تھی۔ سیدھا سیدھا نکاح کرتے۔" ابا کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

وہ کتنی دیر اپنے کمرے میں کتابیں کھولے اپنی خالی انگلی کو دیکھتی رہی تھی۔ قیمتی انگوٹھی کے کھو جانے کا ڈر اس کی مالیت سے جڑا تھا نا کہ اس تعلق سے جو نیا نیا بنا تھا۔ کیا واقعی اس کے دل میں اس رشتے کو لے کر کوئی جگہ بن ہی نہیں پائی تھی یا وہ ضد پہ اڑ کر اسے بنانا نہیں چاہتی تھی۔

اس کی ایک ہم جماعت منگنی شدہ تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں ایک نازک سی انگوٹھی ہمیشہ رہتی جسے وہ اکثر دیکھ کر مسکراتی پائی جاتی اور دیگر لڑکیاں اسے چھیڑتے ہوئے۔۔۔ اس عمر کی ایسی نسبتوں میں ایسا ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ دیگر لڑکیاں آہیں بھرتیں کہ دیکھو اسے تو جیون ساتھی مل بھی گیا اور ہم ایسے ہی بیٹھی ہیں۔ کیسی خوش قسمت تھی نا وہ جس پہ سب رشک کرتی تھیں۔ وہ حیران ہوتی کہ اتنی سی عمر میں انہیں ساتھی مل جانے کی کتنی فکر ہے۔ کیا ان کے پاس زندگی میں کوئی مقصد نہیں تھا ایک شادی کے سوا۔۔۔ پھر وہ اپنی اس ہم جماعت کو دیکھتی جو منگنی شدہ تھی اور ایسی آہوں پہ یوں مسکراتی جیسے نانگا پربت سر کر آئی ہو۔ وہ اپنے آپ پہ حیران ہوتی کہ وہ بھی اسی فہرست میں شامل ہے لیکن نہ ہاتھ میں انگوٹھی ہے نہ چہرے پہ کوئی ایسی مسکان۔۔۔ نہ ذہن میں ایسی سوچیں جن پہ گھنٹوں اکیلے بیٹھ کر مسکرایا جا سکے۔۔۔ اسے تو یہ تک بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ کے ٹو پہ جا کر جھنڈا گاڑھ آئی ہے مطلب کہ ایک عدد منگیتر رکھتی ہے۔۔۔ نہ اس نے کبھی کسی کو خبر لگنے دی تھی۔

پھر شمشاد کا کہا جملہ۔۔ وہی ذہن میں اٹک گیا۔۔۔

ہمدان اس کے بعد سے آنا تو شروع ہو گیا لیکن آتے ہی کتابیں نکالتا اور پڑھنا شروع کر دیتا۔ اسے یاد کر کے سناتا اور بنا کوئی بات کئے چلا جاتا۔

فاطمہ کو اس کے ایسے رویے کی عادت نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا وہ اس سے خفا ہے۔ اپنی ناراضگی جتا رہا ہے کہ کچھ بھی ہو جائے اب بات نہیں کروں گا۔ اچھی طرح باور کروا رہا ہے کہ میں پڑھنے آتا ہوں، باتیں کرنے نہیں اس لئے اب سے کچھ نہیں بولوں گا۔

اسے خود ہی کہنا پڑا۔

''اب یہ تو نہیں کہا تھا کہ مجھ سے ناراض ہی ہو جاؤ۔۔۔'' اس کا کام چیک کرتے ہوئے اس نے سنجیدہ صورت لے کر بیٹھے ہمدان کو دیکھا۔

''ناراض نہیں ہوں۔۔۔ ناراض ہوتا تو منہ یوں ہوتا نا۔۔۔'' اس نے منہ کا غبارہ بنا کر دکھایا تو فاطمہ کی ہنسی نکل گئی۔

''لیکن بات بھی تو نہیں کرتے۔۔''

''بات کی تو پھر کہیں گی کہ کل سے مت آنا۔۔۔''

''اب نہیں کہوں گی۔۔۔'' ہمدان نے اسے آنکھیں سکوڑ کر بغور دیکھا۔

''اب یاد رکھیے گا۔۔۔'' فاطمہ نے سر ہلایا۔ وہ بھلا اس کے بولنے سے کہاں تنگ ہوتی تھی۔ وہ تو اس کا پالتو مٹھو تھا جس کی باتیں اسے پرسکون کر دیتیں، ہنسا دیتیں۔۔۔ تنگ تو وہ چاچو کے ذکر سے ہوتی تھی۔ بس وہ چاچو کی باتیں نہ کیا کرے وہ تو اتنی چنی منی سی خواہش رکھتی تھی۔

''گھر پہ سب خیریت ہے۔۔۔؟'' کام دیکھتے ہوئے اس نے یونہی پوچھ لیا۔ یہ سوال وہ عموماً کیا کرتی تھی جب اس کا شمشاد سے کوئی رشتہ نہ تھا اور جب ہو گیا تھا تو بھی پوچھ لیتی۔

''میں بے گھر ہوں۔۔۔'' فاطمہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھا۔

''یہ کیوں کہہ رہے ہو۔۔۔؟''

''کیونکہ میرا کوئی گھر نہیں، کوئی گھر والے نہیں۔'' اس نے اب بھی ناسمجھی سے ہی اسے دیکھا۔

''کس نے کہا یہ۔۔۔؟''

''چاچو نے کہا تھا کہ آپ کے لئے میں بے گھر ہوں۔۔۔ نہ میرا گھر ہے اور نہ کوئی گھر والے

۔۔۔" وہ سمجھ گئی تھی اسی لئے خاموش ہوگئی۔ اس کے بعد سے ہمدان نے کبھی شمشاد کے حوالے سے کوئی بات نہیں تھی۔ معلوم نہیں شمشاد ہی بات نہیں کرتا تھا یا بات کر کے اسے سختی سے منع کر دیتا تھا کہ فاطمہ کے سامنے خاموش رہے۔ فاطمہ نے بھی یہ سوال کرنا خود سے چھوڑ دیا کہ گھر پہ سب خیریت ہے۔ کم از کم اس سے وہ یکسو ہو کر پڑھنے لگی تھی۔

اس کے فائنل قریب ہی تھے۔ دن رات اسے بس ایک ہی چیز کی فکر تھی کہ اسے اپنا بہترین دینا ہے اور پھر ساتھ پوری دل جمعی سے دعا بھی کرنی ہے۔۔۔ بہترین کوشش اور دل سے کی گئی ڈھیروں دعا کا نتیجہ کبھی برا آ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تہجد کے وقت جاگ جاتی۔ پہلے نوافل پڑھ کر دعا کرتی اور پھر پڑھنے بیٹھ جاتی۔ صبح کے وقت میں اللہ نے برکت رکھی ہے اور اپنے کاموں کا آغاز علی الصبح ہی کرنا چاہئے۔۔۔ جو مخلوق بھی صبح سویرے رزق کی تلاش میں نکلے وہ بہترین رزق پا لیتی ہے۔ اس نے یہی گر اپنایا تھا۔ وہ رات کو وقت سے کھانا کھا کر سو جایا کرتی تھی۔ رات میں دیر تک پڑھائی اس نے ترک کر کے صبح جلدی اٹھ کر پڑھنے کا کلیہ اپنایا تھا۔ اس سے سبق زیادہ بہتر یاد ہوتا تھا۔

امتحانات آئے اور ختم بھی ہو گئے۔ لیکن سب کے سب بہترین ہوئے۔۔۔ اس نے اگلے سال کی کتابیں ابا سے منگا کر انہیں پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ کالج کھلنے سے قبل ہی اس کی دیگر ہم جماعتیں اکیڈمیز لگوا کر کورس مکمل کر رہی ہیں۔ وہ یہ تو نہیں کر سکتی تھی لیکن خود سے اس نے پڑھنا اور سمجھنا شروع کر دیا۔ سائنس نہ سہی، آرٹس کے مضامین تو وہ خود سے تیار کر سکتی تھی۔ وقت ضائع کرنا اس نے ایک عرصہ ہوا چھوڑ دیا تھا کہ جو وقت کو ضائع کرتا ہے، وقت پھر اسے ضائع ہونے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

اس دنیا میں کامیابی اسی کا مقدر بنتی ہے جو مسلسل لگا رہے، یہ دیکھے بنا کہ وہ کتنا کامیاب اور کتنا ناکام ہو رہا ہے۔۔۔ جو انسان یہ راز پا لیتا ہے کہ مسلسل لگے رہنا ہی اصل چابی ہے جو بند تالوں کو کھولتی ہے۔۔۔ وہی کامیاب ہوتا ہے۔

جس دن اس کا نتیجہ آیا وہ بے یقینی کا دن تھا کہ بنا کسی ٹیوٹر اور اکیڈمی کے اس لڑکی نے اپنے کالج میں ٹاپ کیا تھا۔

ابا اسے اپنے ساتھ لگا کر سسکنے لگے تھے تو وہ بھی آبدیدہ ہوگئی۔

"فاطمہ! ناممکن کو کیسے ممکن بنایا جاتا ہے یہ میں نے تم سے سیکھا ہے میری بیٹی۔ تمہاری کوششیں مجھے دیوانے کا خواب لگتی تھیں۔ لیکن تم نے ثابت کیا کہ تمہارے جیسے عزم کے ساتھ آگے بڑھنے والا انسان تو پہاڑ بھی ہلا سکتا ہے تو ڈاکٹر بننا کیا مشکل ہے۔" نمبروں سے زیادہ بے یقینی ابا کی بات سے ہوئی تھی۔ ابا نے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ باپ کے منہ سے نکلی بات نے اسے باور کرا دیا تھا کہ محنت کا صلہ صرف کامیابی کی صورت میں ہی نہیں بلکہ اور صورتوں میں بھی مل جاتا ہے۔ ابا کے الفاظ کسی امرت سے کم نہ تھے جنھوں نے اسے نئے عزم سے بڑھنے کے لئے ایندھن مہیا کیا تھا۔

امی نے اس دن محلے بھر میں مٹھائی بانٹی تھی جو ابا خوشی خوشی لائے تھے۔

فاطمہ کو کامیابی کی دو خوشیاں تھیں۔۔۔ ایک نمبروں کی اور دوسری امی ابا کی اس کی کامیابی پہ خوش ہونے کی۔ پہلی خوشی کا تو اس نے پہلے سے تصور کر رکھا تھا لیکن دوسری خوشی کا اسے تصور بھی نہیں تھا۔

شام میں شمشاد کی امی اور دونوں بھابھیاں آئی تھیں۔ ہمدان بھی ساتھ تھا۔ مٹھائی کا ایک بڑا ڈبہ میز پہ دھرا تھا جب وہ ان سب سے ملنے آئی جو گلے مل کر اسے مبارک باد دے رہی تھیں۔ ہمدان نے ماں کے ہاتھ سے ایک بڑا تھیلا تھام کر دیا۔

"اس میں تحفے ہیں۔" بڑے رازدارانہ انداز میں اس نے بتایا۔

"کیسے تحفے۔۔؟" فاطمہ بھی اسی انداز سے پوچھنے لگی۔

"میں نے نہیں لیے۔ وہ کسی اور نے لیے ہیں۔ دیکھ کر بتائیں کہ پسند آئے یا نہیں۔" اس کے "کسی اور" کہنے پہ اسے ہنسی آ گئی جسے وہ چھپا گئی تھی۔

"دیکھ لوں گی لیکن بعد میں۔" یوں سب کے سامنے تحائف کھول کھول کر دیکھنا اسے کبھی بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

"تمہاری انگوٹھی کہاں ہے بیٹا۔۔؟" اس کی ہونے والی ساس کسی ایکسرے مشین کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔

فاطمہ نے چونک کر ساس کو دیکھا اور پھر اپنی خالی انگلی کو۔ اس کی انگلی تو ہمیشہ خالی ہی ہوتی تھی۔
"بچی ہے نا تو ڈرتی ہے کہ گم نہ ہو جائے کہیں۔۔۔ اسی لئے اتار کر مجھے دے دی کہ امی آپ سنبھال لیں۔ کالج آنا جانا ہوتا ہے، سو بار ہاتھ دھوتے ہوئے اتارتی ہے تو ڈر لگا رہتا ہے گم ہو جانے کا۔"
یہ وضاحت امی نے دی تھی جو سچی بھی تھی۔ شاید امی پہلی بار روایتی ماؤں کی طرح اس کی ڈھال بنی تھیں۔
"لڑکیوں کو اپنے سہاگ کی نشانیاں پہن کر رکھنی چاہیں تا کہ پتا چلتا رہے کہ ان کے سر کا سائیں موجود ہے۔ ہمارے خاندان میں ان باتوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ پھر اتنی ذمہ داری تو انسان کو اپنی چیزوں کی اٹھانی چاہئے کہ قیمتی چیزوں کو سنبھال کر رکھا جائے اور انہیں گم نہ ہونے دیا جائے۔" تبھی ہمدان کی ممی اور تائی اتنا سج سنور کر آئی تھیں۔ وہ ہمیشہ ہی ایسے سونے کی کان بنی پھرتی تھیں۔ کم از کم فاطمہ نے تو جب بھی دیکھا۔۔۔
"کیا اپنی کتابوں کو بھی ادھر ادھر رکھ کر بھول جاتی ہے۔۔۔؟" وہ جانتی تھیں کہ پڑھائی کے لئے وہ کتنی حساس ہے اسی لئے وہاں لا کر مارا تھا کہ اس کی 'سی' تک نہ نکل سکے۔ فاطمہ نے ضبط سے سر جھکا لیا۔
امی پھیکا سا مسکرا دیں۔
"راحمہ نے سنا کہ چاچی نے اتنی شاندار کامیابی حاصل کی ہے تو کہتی ہے کہ میں بھی ان کی طرح ڈاکٹر بنوں گی۔" ہمدان کی ممی نے جھٹ سے بات بدلنا چاہی۔ وہ یہاں خوشی بانٹنے آئے تھے اور ساس نے ماحول میں تناؤ زیادہ پیدا کر دیا تھا۔
بڑی بہو تو چائے کے ساتھ بنی اشیاء سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ ان کی اس تمام گفتگو میں دلچسپی صفر تھی۔
فاطمہ کسی کے لئے رول ماڈل بن گئی تھی یہ سننا بھی عجب طرح سے خوشی دے رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔
"ہمارے ہاں تو لڑکے اتنا نہیں پڑھتے، لڑکیاں کہاں پڑھیں گی۔" اس کی ساس نے عجیب طرح سے جتایا جس پہ فاطمہ کا ماتھا ٹھنکا۔ کیا وہ یہاں ہر بات پہ اسے جتانے آئی تھیں کہ اس کی پڑھائی ان کی آنکھ میں کس بری طرح چبھ رہی ہے۔
"یہ تو بس شمشاد کی خواہش تھی کہ اسے پڑھی لکھی بیوی چاہئے۔۔ وہ بھی ڈاکٹر۔۔ ورنہ

ہمارے خاندان کی بہوئیں بیٹیاں اتنا نہیں پڑھتیں۔'' اس جملے پہ اس کا دل تھم گیا۔
ایک نئی سوچ نے اسے گھیر لیا تھا کہ کیا وہ اس لئے چنی گئی تھی کہ وہ ڈاکٹر بننے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن اس کے حالات اجازت نہیں دیتے تھے۔۔۔ اور اس کی صورت شمشاد کو اپنی خواہش کی تکمیل ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ کیا شمشاد اپنی کسی خواہش کو اس میں ڈھونڈ رہا تھا۔۔؟

''اوہو مما۔۔ وہ تو پرانی نسل تک بات محدود تھی۔اب تو راحمہ کو بھی پڑھنے کا بہت شوق ہے اور اس ہمدان کا حال تو آپ نے دیکھا ہی ہے۔'' ہمدان کی ممی نے نرمی سے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔
ساس تو کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔گھوم پھر کر بات پھر فاطمہ کی پڑھائی پہ آ جاتی۔
''نسل کوئی بھی ہو۔۔۔ آج کل یونیورسٹیوں کا ماحول اس قابل نہیں ہے کہ بچیوں کو پڑھنے بھیجا جائے۔''
''دنیا کہاں سے کہاں نکل رہی ہے اور ہم بچیوں کو یونیورسٹی نہیں بھیج سکتے۔۔۔؟'' ابا نے نرمی سے اپنی بات کی۔وہ بھلے بیٹی کو پڑھانے کے قابل نہیں تھے لیکن پڑھائی کے مخالف بھی تو نہ تھے تو پھر ایسی ویسی کوئی بات کیوں آسانی سے ہضم کر لیتے۔

''ہمیں دنیا سے کیا لینا دینا۔۔ ہمیں تو اپنی خاندانی عزت کو دیکھنا ہے۔''
''مما۔۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔اس وقت تو ہم فاطمہ کو مبارک دینے آئے ہیں۔'' مسز ممتاز تھیں تو چھوٹی بہو لیکن بڑی کے مقابلے میں سمجھدار لگتی تھیں۔ بڑی بہو تو بس کھانے سے انصاف کرنے وہاں بیٹھی تھیں۔
''یہ لو بیٹا۔۔۔'' اس کی ساس نے سر ہلا کر اپنے پرس میں سے ہزار ہزار کے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے جو اس نے تھام لئے۔امی ان کا اس تکلف پہ شکریہ ادا کرنے لگیں۔
باقی سب کے لئے ماحول پھر سے معمول پہ آ گیا تھا لیکن اس کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

☆......☆......☆

''گھر میں کتنا سناٹا چھا گیا ہے۔۔ رونق ختم ہو گئی ہے بچوں کے جانے سے۔'' زیور بابا نے گہری سانس بھری۔ان کا اپنا تو کوئی خاندان تھا نہیں تو یہی ان کا خاندان تھا۔بچپن سے جوانی اور جوانی

سے پڑھا پایہیں کیا تھا۔ اس گھر کا ہر سکھ ان کا سکھ اور ہر دکھ ان کا دکھ تھا۔

''ابھی تو شکر ہے کہ دانش صاحب ادھر آ گئے ہیں اور ان کے بچوں کی وجہ سے گھر میں کچھ نا کچھ تو رونق رہتی ہے۔ ورنہ تو گھر کاٹنے کو دوڑتا۔'' دانش کے بچے ویسے پر اعتماد نہیں تھے جیسے ولید کے تھے۔۔ نہ وہ زیادہ بولتے تھے نہ چیختے چلاتے اور شرارتیں کرتے تھے۔۔۔ بچے ان دو کاموں سے دور رہیں تو تشویش کی بات ہوتی ہے۔

زیور بابا نے سر ہلایا۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ دانش کی بیگم جو ہر کسی کو کاٹنے کو دوڑتی ہے اس کا کیا کیا جاتا۔ جو عرصے سے شوہر اور بچوں کا دردِ سر تھی اور اب اس گھر کے مکینوں کا سر درد بنتی جا رہی تھی۔

پچھلی شام ہی جب زیور بابا خود سے پودوں کی کاٹ چھانٹ دیکھ رہے تھے کہ مالی کے کام سے وہ زیادہ مطمئن نہیں رہتے تھے اور اذکاران کے ساتھ کھڑا اس سارے عمل کو دیکھتا ہوا سوالات کر رہا تھا تو رطابہ باہر آئی تھی۔ اس نے دور کھڑے ہوئے اذکار کو غصے سے بلایا تھا۔

''ذکی۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔؟'' وہ انگریزی میں چلائی۔

ذکی کانپ کر رہ گیا تھا۔ اس کا پھیکا پڑتا رنگ زیور بابا سے مخفی نہ رہ سکا۔

''میں پودوں کو دیکھ رہا ہوں۔'' وہیں کھڑے کھڑے اس نے ماں کو جواب دیا۔

''تم مالی نہیں ہو۔۔۔ جس کا کام ہے اسے کرنے دو اور اس گھر کے نوکروں سے دور رہو۔'' گفتگو انگریزی میں تھی لیکن زیور بابا کی ساری زندگی اسی گھر میں گزری تھی۔ ان مکینوں کے درمیان جن کا معمول تھا انگریزی میں بات کرنا۔۔۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ کیا بات ہو رہی ہے۔

اذکار نے بے بسی سے زیور بابا کو دیکھا جو نرمی سے مسکرا دیے۔ ان کے چہرے پہ کوئی ناگوار تاثر نہیں ابھرا تھا۔ اذکار کو تسلی ہوئی کہ وہ رطابہ کی بات نہیں سمجھ سکے۔

تبھی اس کا اطمینان اگلے پل ہی رخصت ہو گیا جب زیور بابا نے اسے سر سے اشارہ کیا کہ وہ اندر چلا جائے۔ اذکار کو شرمندگی نے گھیر لیا کہ زیور بابا گفتگو سمجھ گئے تھے اسی لئے تو اسے اندر جانے کا کہہ رہے

تھے۔ وہ ان کی دل آزاری نہیں چاہتا تھا۔ بھلے وہ اس گھر کے نوکر تھے لیکن ان کے انداز میں ایک ایسی پدرانہ شفقت تھی جو اسے دادا سے درکار تھی ۔ دادا کا اس سے اچھا تعلق تھا لیکن ویسا نہیں جسے دوستی کہا جا سکے۔ ان کی ایک الگ سے کلف زدہ شخصیت تھی جو انہیں اپنی ہی اولاد سے کھل کر محبت کرنے سے روکتی تھی۔ اولاد اور اس کی اولاد کے قریب ہونا اور دوستی کرنا ان کی شخصیت کے خلاف تھا۔ اصول رشتوں سے کہیں بڑے تھے اور اصول کہتے تھے کہ اولاد سے محبت ایک حد میں رہ کر کرو اور وہ حد بے حد محدود تھی۔ اسی لئے اس گھر میں اسے سب سے زیادہ محبت زیور بابا سے تھی جن کے وجود سے اسے عجیب قسم کا انس تھا۔

''آئی ایم سوری بابا۔'' وہ سر جھکا کر معذرت کرتا، بنا ان کی طرف دیکھے اندر چلا گیا تھا۔ زیور بابا کو صرف ایک بات کا افسوس تھا اور وہ تھا اس بچے کی ذہنی حالت کا جسے وہ محسوس کر سکتے تھے۔ لیکن اسکی بہتری کیلئے وہ کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے کیونکہ بہر حال کتنے ہی وفادار، پرانے ہی سہی وہ اس گھر کے نوکر ہی تو تھے۔ مکینوں کے درمیان اٹھنے بیٹھنے، محبت اور عزت پانے سے ان کا رتبہ نہیں بدل گیا تھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

رطابہ نے اذکار کا ہاتھ مضبوطی سے تھامنے سے پہلے ایک بار زور سے جھٹکا اور ہلکا سا کان مروڑا۔ زکی کے منہ سے سی تک نہ نکلی۔ وہ ماں کی ایسی ہلکی پھلکی مار کا عادی تھا۔ اسے یہ جسمانی مار اتنا متاثر نہیں کرتی تھی جتنا وہ ذہنی اذیت جو ماں اسے مختلف صورتوں میں دیتی تھی۔

رطابہ نے خشمگین نگاہوں سے زیور بابا کو دیکھا جو ہنوز اپنے کام میں مگن تھے۔

''اس بڈھے کا علاج کرنا پڑے گا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی اور اذکار کو گھسیٹ کر اندر لے گئی۔

اور زیور بابا جیسے سادہ مزاج اور بے ضرر انسان نہیں جانتے تھے کہ وہ عورت ان کے پیچھے پڑ چکی ہے جسے اپنے ماں باپ کا بھی لحاظ کئے ایک زمانہ گزر چکا ہے اور اس کا پیچھے پڑنا ان کے لئے زندگی کا ایک بڑا طوفان لانے والا ہے۔

''زیور میرے جوتے کدھر رکھے ہیں پالش کر کے۔۔۔؟'' صاحب کی آواز پہ زیور بابا عابدہ کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے باہر نکلے تھے۔ صاحب کے کمرے کی ترتیب انہی کے ذمے تھے۔ بھلے سارا گھر

تلپٹ ہو جائے لیکن اس ترتیب میں تبدیلی صاحب کو گوارہ نہ تھی وہ جانتے تھے۔

سیڑھیوں کے پاس کھڑے وہ بالکل تیار تھے۔ بس پاؤں میں جوتے پہننا باقی تھے جو زیور بابا ان کے کمرے میں صبح ہی چھوڑ کر آئے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ قریبی ایک سکول میں پرنسپل کے منصب پہ فائز تھے۔ جہاں سے لوٹ کر وہ شام آفیسرز کلب گالف کھیلنے جاتے تھے۔ ہمیشہ سے مصروف زندگی گزارنے والے کرنل نواز سدھو نے اس عمر میں بھی خود کو کافی مصروف رکھا ہوا تھا۔

''اندر ہی رکھے تھے صاحب۔'' کرنل صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ آگے بڑھے اور انہیں بتائے کہ کہاں رکھے تھے۔

زیور بابا نے کمرے میں جا کر ہر طرف جوتے تلاش کر لئے لیکن انہیں کہیں نہ ملے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ صبح صبح کوئی ان کے علاوہ کرنل صاحب کے کمرے میں گیا ہو اور اس نے جوتوں کی جگہ تبدیل کر دی ہو پھر بھی اپنی قوتِ یادداشت کے دھوکا دینے کے ڈر سے انہوں نے سارا کمرہ چھان لیا تھا لیکن جوتے وہاں ہوتے تو ملتے۔

''میں دوسرے نکال دیتا ہوں۔ آپ تب تک ناشتہ کر لیں۔'' زیور بابا کو پرانے ملازم ہونے کی وجہ سے اتنی رعایت تھی کہ وہ بڑے صاحب کو مشورہ دے دیتے تو بھی وہ برا نہیں مناتے تھے۔ کرنل سدھو نے سر ہلایا اور اسی طرح باہر چلے گئے۔

زیور بابا کی حیرت کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ جوتے پالش کر کے وہ خود کرنل صاحب کے کمرے کے سنگھار میز کے برابر رکھ کر گئے تھے جہاں تیار ہو کر وہ آخر میں جوتے پہنا کرتے تھے۔ سالوں کا ایک معمول تھا جو انہیں از بر تھا پھر آج کیا ہوا تھا۔

اسی کے ہم رنگ دوسرے جوتے نکال کر انہوں نے جلدی سے پالش کئے اور ٹھیک اسی جگہ پہ رکھ دیے جہاں وہ صبح جوتے رکھ کر گئے تھے لیکن ان کی الجھن دور نہیں ہوئی تھی۔ کرنل سدھو تیار ہو کر چلے گئے تو بھی زیور بابا اسی الجھن میں مبتلا رہے۔

''ہو جاتا ہے کبھی کبھار۔'' عابدہ نے لاپرواہی سے انہیں تسلی دی جیسے یہ کوئی بڑی بات نہ ہو لیکن بات بڑی تھی۔ ان کے لئے یہ بات بڑی ہی تھی کیونکہ سدھو صاحب کے ہاں اس قسم کی غلطیوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ تو ان کی سالوں کی خدمات کی وجہ سے رعایت دی گئی تھی۔ دیگر ملازمین کی غلطیوں کو زیور بابا چھپا لیا کرتے تھے اسی لئے وہ صاحب کے عتاب سے بچ جاتے تھے لیکن خود وہ صاحب کے ساتھ براہِ راست کام کرتے تھے اور ان کی غلطی چھپانے والا کوئی نہیں تھا۔

دو دن بعد ہی دھوبی گھاٹ سے کپڑے آئے تھے اور اب ان میں کرنل صاحب کی سب سے اہم پتلون نہیں تھی جس پہ ایک زلزلہ آیا ہوا تھا۔

''فون لگاؤ اسے اور پوچھو اس سے کہ اس نے واپس کی بھی تھی یا نہیں۔'' زیور بابا نے فون تو لگا لیا لیکن جانتے تھے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ وہ کپڑے ہمیشہ گن کر دیتے اور لیتے تھے۔ اس بار بھی گن کر ہی لائے تھے تو واپس نہ کرنے کا کیا سوال تھا۔ دھوبی نے انکار ہی کرنا تھا۔

''کہاں چلی گئی پھر۔۔۔؟ تم کب سے اتنے لاپرواہ ہو گئے ہو زیور۔۔۔؟'' پہلی دفعہ کی غلطی خیر تھی، دوسری دفعہ پہ یہی ہونا تھا۔

''میں نے دھیان سے ہی لگائے تھے الماری میں۔۔۔''

''تو جنات نے اچک لی۔۔۔؟'' زیور بابا کو خاموش ہو جانا پڑا۔ وہ صاحب کے غصے کے وقت خاموشی کو بہتر سمجھتے تھے۔

بہت ڈھونڈنے پہ بھی پتلون نہیں ملی تھی۔ پورا ہفتہ صاحب کے عتاب کا وہ شکار رہے اور پھر کہیں صاحب کا موڈ بحال ہوا۔ لیکن پتلون گئی کہاں یہ سمجھ نہیں آسکا۔۔۔

اگلے ہفتے ہی وہ ہو گیا جس سے پچھلی ساری الجھنیں سلجھ گئی تھیں۔

اس روز زیور بابا ڈرائنگ روم میں اپنی سرپرستی میں صفائی کروا رہے تھے۔ جب ان سے کچھ فاصلے پہ رکھا گلدان چھناکے سے زمین بوس ہوا تھا۔ گلدان کئی سال سے وہیں پڑا تھا۔ کبھی اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں اور اب۔۔۔

"اتنا قیمتی گل دان توڑ دیا۔" رطابہ وہیں کہیں آس پاس تھی۔ جھٹ سے نکل کر سامنے آ گئی۔ اس کے مخاطب زیور بابا تھے اور وہ کینہ توز نظروں سے انہی کو دیکھتے ہوئے جتا رہی تھی۔ زیور بابا نے حیرت سے رطابہ کو دیکھا پھر زمین پہ بکھرے گل دان کو جو مالکن اپنی زندگی میں ایران سے خرید کر لائی تھیں۔ یہ کوئی اٹھارہ برس پہلے کی بات تھی اور تب وہ اس گل دان کی قیمت ہر آنے جانے والے کو آٹھ ہزار بتاتی تھیں۔

"میں نے۔۔۔؟" نہ ان کا ہاتھ لگا، نہ وہ ٹکرائے پھر وہ کیسے اس سب کے ذمہ دار ہو گئے۔ وہ تو خاصے دور کھڑے تھے میز سے پھر بھلا ان سے کیسے۔۔۔؟ حیرت کا شدید جھٹکا انہیں لگا تھا۔

"تو کیا میں نے توڑا ہے۔۔۔؟ میں جو یہاں تھی ہی نہیں۔۔۔" رطابہ اس وقت بالکل گلی محلے کی عورتوں کی طرح دو بدو لڑنے کھڑی تھی۔ اس کے تیور دیکھ کر زیور بابا خاموش ہو گئے۔

"تم بتاؤ عروسہ گل دان کیا ان سے نہیں ٹوٹا۔۔۔؟ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔۔۔؟" عروسہ کام والی تھی جو اس گھر میں کافی سالوں سے آ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ زیور بابا اپنی نگرانی میں کتنے محتاط ہو کر صفائی کرواتے تھے۔ لیکن کبھی کام کے دوران نہ انہوں نے خود ڈنڈی ماری نہ انہیں مارنے دی۔

"چیز ہی تھی بی بی ٹوٹ گئی۔۔۔ کسی سے بھی ٹوٹ سکتی ہے۔" عروسہ نے نظریں چرا لیں مگر زیور بابا کو زبردست جھٹکا لگا۔ وہ رطابہ کی بات کا ایسا جواب دے گی ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے انکار نہیں کیا تھا۔

"یہ بات تم شام کو پاپا کے سامنے بتانا کہ یہ سب کیا دھرا ان کا ہے۔"

زیور بابا بالکل گنگ تھے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا اور کیوں ہو رہا تھا ان کی سمجھ سے باہر تھا۔

"بابا بزرگ بندے ہیں بی بی اور بزرگوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔" عروسہ کی آواز مارے باندھے نکل رہی تھی۔

"بزرگ ہیں تو آرام کریں۔ سارے گھر میں کیوں اپنا رعب جماتے پھرتے ہیں جیسے کہیں کے سیٹھ لگے ہوں۔" رطابہ سر جھٹک کر اندر چلی گئی۔ عروسہ سے مزید کام نہیں ہو سکا تھا۔ وہ جھٹ سے

رطابہ کے پیچھے ہی نکلی تھی۔ زیور بابا اس سے کوئی سوال کر لیتے تو وہ کیا کرتی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

زیور بابا گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھے اور کانچ کا ایک ایک ٹکڑا ہاتھ سے چننے لگے۔ سر جھکا رکھا تھا کہ گویا وہ ہی مجرم ہیں۔ انہی سے یہ سب ہوا ہے۔ یہ گل دان کے ٹکڑے نہیں تھے، یہ ٹکڑے ان کی ذات کے تھے، ان کی عزت ِ نفس کے، ان کے مان کے اور انہیں ایک ایک کر کے انہیں خود ہی سمیٹنا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جو چپکے سے گر کر ان کی قمیض میں جذب ہو رہے تھے۔ اس گھر میں انہیں رہتے ہوئے ساٹھ سال ہو چکے تھے۔ ساٹھ سال تک کبھی ان کے سر کسی نے ایسا جھوٹا الزام نہیں لگایا لیکن اب۔۔۔

"ارے یہ گل دان۔۔۔ یہ کیسے ٹوٹ گیا۔۔۔؟" وہ عابدہ تھی جو وہاں سے گزری تو لپک کر اندر آئی۔

"کیا کر رہے ہیں بابا۔ آپ کے ہاتھ میں کانچ چبھ جائے گا۔ چھوڑیں۔۔۔" عابدہ نے انہیں روکا اور اسی کشمکش میں ایک ٹکڑا ان کے ہاتھ میں جا لگا اور خون بہنے لگا۔

"کہا تھا نا بابا۔۔۔" عابدہ نے جھٹ سے اپنے دوپٹے کا سرا چیر کر جلدی جلدی ان کے ہاتھ پہ لپیٹا۔

"اس گھر کے لئے میرے خون کا آخری قطرہ بھی حاضر ہے۔" خون جو ہاتھ سے بہہ رہا تھا۔۔۔ سرخ تھا۔۔۔ دکھائی دے رہا تھا۔ آنسو جو آنکھ سے بہہ رہے تھے۔۔۔ بے رنگ تھے۔۔۔ چھپ کر جذب ہو گئے تھے۔ درد کس کا زیادہ تھا۔۔؟ کوئی زیور بابا سے پوچھتا تو وہ کہتے ان آنسوؤں کا جو آنکھ سے بہہ رہے ہیں۔

"مگر یہ ٹوٹا کس سے۔۔؟" عابدہ نے پٹی کی دو گرہیں کس کر باندھ دیں۔ یہ تو عارضی پٹی تھی۔ وہ انہیں باقاعدہ مرہم لگا کر پٹی کرے گی یہ اس نے سوچ رکھا تھا۔

"مجھ سے ہی ٹوٹا ہو گا۔۔۔" عابدہ چونکی۔

"آپ سے۔۔۔؟" پھر اس نے سر نفی میں ہلایا۔

''آپ سے کیسے ٹوٹ سکتا ہے۔۔؟'' وہ بالکل یہ بات نہیں مان سکتی تھی۔

''اب بوڑھا ہو گیا ہوں نا۔شاید مجھے اب آرام کرنا چاہئے۔میرا یہاں کام دھندا ختم ہو چلا ہے۔۔''

''بابا۔۔۔؟'' وہ ان کا ہاتھ تھامے حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

''یہ سب کس نے آپ سے کہا ہے۔۔۔؟'' بابا نے سر جھکا لیا۔

عابدہ نے انہیں اٹھایا۔

''آپ اپنے کمرے میں جائیں۔یہ میں سمیٹ دوں گی۔۔۔'' وہ نرمی سے انہیں دروازے سے باہر تک لائی اور انہیں اپنے کمرے کی طرف بھیج دیا۔خود وہ خاموشی سے وہیں کھڑی رہی۔

اس نے عروسہ کو آواز دی جس کا کام صفائی کا تھا۔

''یہ اندر کانچ بکھرا ہے سمیٹ دو۔'' عروسہ نے اندر جھانک کر دیکھا۔شکر تھا کہ زیور بابا اندر نہیں تھے۔ورنہ وہ ان کا سامنا کیسے کرتی۔

عابدہ جاتے جاتے واپس لوٹی۔

''بابا تمہیں صفائی کروانے یہاں لائے تھے نا۔تو تم تو یہیں ہو گی۔'' عروسہ خاموشی سے جھاڑو لگاتی رہی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

''یہ گل دان کیا بابا سے ٹوٹا ہے۔۔۔؟'' وہ ہنوز خاموش تھی۔اس نے جتنا بولنا تھا، بول لیا تھا۔ اب وہ زبان بندی کی پابند تھی۔

''کسی نے بابا کو کچھ کہا ہے۔۔۔؟'' عروسہ نے کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو عابدہ کو غصہ آ گیا۔

''میں تم سے بات کر رہی ہوں عروسہ۔کیا بہری ہو گئی ہو۔۔؟'' اس نے جھک کر عروسہ کا کندھا ہلایا۔وہ جھاڑو وہیں چھوڑ کر جھٹ سے کھڑی ہو گئی۔

''کیوں بابا کیا خدا ہیں جن سے کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔کوئی چیز نہیں ٹوٹ سکتی۔۔؟'' اس نے چیخ کر کہا لیکن اس کا لہجہ اتنا کھوکھلا تھا کہ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ جھوٹ پہ شور کا پردہ ڈال کر اسے دبانا چاہتی ہے۔

''مجھے اس خاندان کے ساتھ کام کرتے ہوئے پندرہ سال ہو چلے ہیں عروسہ اور ان سالوں میں بابا سے کبھی کوئی چیز نہیں ٹوٹی نہ ہی کوئی چیز ادھر سے ادھر ہوئی ہے۔ مجھے سچ بتاؤ کہ یہ کیا قصہ ہے۔۔۔؟''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ تمہیں قصے کہانیوں کا اتنا شوق ہے تو جا کر بابا سے ہی پوچھ لو۔'' عروسہ نے عابدہ کو پرے کیا اور کانچ سمیٹ کر انہیں پھینکنے کے لئے لے گئی۔

عابدہ مزید الجھ گئی تھی۔

شام میں سارا قصہ خود ہی سامنے آ گیا جب کرنل سدھو لاؤنج میں اپنی مخصوص نشست پہ بیٹھے تھے اور رطابہ ان کے سامنے ایک طرف پرسکون سی بیٹھی تھی۔ منظر بتاتا تھا کہ شکاری نے اپنا جال بچھا دیا ہے۔ عروسہ ابھی تک کام کر کے گھر نہیں گئی تھی حالانکہ وہ تو دوپہر تین تک چلی جایا کرتی تھی۔

کرنل سدھو نے ڈرائیور صدام کو زیور بابا کو بلانے بھیجا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ وہاں داخل ہوئے تو لاؤنج میں موجود حاضرین کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ انہیں کیوں بلوایا گیا ہے۔ ان کا سر خود بخود جھک گیا۔

''یہ سب کیا ہے زیور۔۔۔؟'' وہ ان سے عمر میں کچھ ہی بڑے تھے، بچپن ان کے ساتھ کھیلتے ہوئے ہی گزرا تھا، تو وہ انہیں نام سے ہی بلاتے تھے۔

زیور بابا خاموش رہے۔

''اگر تم سے نقصان ہوا ہے تو جواب دو۔''

''اس نقصان کا ان کے پاس کیا جواب ہو سکتا ہے۔ نقصان ہونا تھا ہو گیا۔'' رطابہ کے لب و لہجے سے طنز اور حقارت کی باس اٹھ رہی تھی۔

''عروسہ تم بتاؤ کیا ہوا تھا۔۔۔؟'' عروسہ سے دوبارہ پوچھا جا رہا تھا اور جواب پھر سے دہرانا مشکل تھا کیونکہ اب اسے جواب زیور بابا کے سامنے دہرانا تھا۔

''مالک! بابا اب بوڑھے ہو گئے ہیں تو اکثر ان سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کا ذہن اور جسم اب کام کے قابل نہیں رہا۔'' الفاظ تھے کہ انگارہ جو کسی نے زیور بابا

کی زبان پہ رکھا اور وہ راکھ ہوئی۔ اسی تکلیف سے ان کی آنکھیں بہہ نکلیں۔

عروسہ کے وہ الفاظ دروازے سے لگی عابدہ نے بے یقینی سے سنے اور اسی بے یقینی سے زیور بابا کو دیکھا جن کے پاس اب بھی خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ نحیف سا وجود اس چھت تلے بے بسی کی تصویر بنے کھڑا تھا۔

''کچھ کہو زیور۔ خاموش کیوں کھڑے ہو۔ کیا کوئی جواب نہیں ہے تمہارے پاس۔۔۔؟''

کرنل سدھوان سے جواب چاہتے تھے جو خاموش تھے۔ جواب ایک طوفان لا سکتا تھا اور وہ طوفان کی خواہش اس گھر کے لئے کبھی نہیں کر سکتے تھے۔ جھوٹ وہ بول نہیں سکتے تھے اور خاموش اسی لئے تھے کہ ان کی خاموشی ہی ان کا سچ تھی۔

''ٹھیک ہے اگر تمہیں کچھ نہیں کہنا تو میں کہہ دیتا ہوں پھر۔'' کتنی دیر انہیں خاموشی سے دیکھنے کے بعد کرنل سدھو کو بولنا پڑا۔

''گل دان کی بات نہیں ہے۔ بات ہے ذمہ داری سنبھالنے کی، معاملات کو دیکھنے کی جواب شاید تم سے ہو نہیں پا رہا۔ عمر کا تقاضا ہے، میں سمجھتا ہوں۔ اب میری اپنی ہمت عمر کے ساتھ ساتھ ختم ہونے لگی ہے جبکہ میں نے فوج کی مشکل زندگی گزاری ہے۔ تم تو مجھ سے بھی بڑے ہو زیور۔ سو میرا خیال ہے تمہیں آرام کرنا چاہئے۔ اب کام کی زیادتی تمہارے اور ہمارے لئے ٹھیک نہیں ہے۔'' عابدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور رطابہ کے چہرے پہ چمک۔ عروسہ کے چہرے پہ اضطراب و پشیمانی اور زیور بابا کے وجود پہ بس دبیز خاموشی۔۔۔

''ملازموں کی سرپرستی تو شاید رطابہ بھی کر سکتی ہے۔ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔'' رطابہ اپنی کامیابی پہ کھل کر مسکرائی۔ راج اس کا ہونا تھا جیسے ہمیشہ سے تھا۔

کرنل پاپا نے اس کی طرف دیکھا کہ وہ کیا کہتی ہے۔ رطابہ نے جھٹ سے سر ہلایا۔

''بالکل۔۔۔ اس میں بھلا کیا مشکل ہے۔ میں پہلے بھی جاب کے ساتھ مینج کر رہی تھی جب اپنے گھر میں تھی تو یہاں بھی کر سکتی ہوں۔'' کام مشکل تھا یا نہیں یہ وہ نہیں جانتی تھی لیکن اس کی نفسیات

ایسی تھی کہ اسے اپنے سے کمتر پہ حکم چلانے کی ایسی عادت تھی کہ اب وہ کسی ایسے سے کوئی حکم سننا گوارا نہیں کرسکتی تھی جسے وہ خود سے کمتر سمجھتی تھی اور یہاں زیور بابا ایسی ہی شخصیت تھے۔

''جہاں تک میرے معاملات دیکھنے کی بات ہے تو وہ فرحان دیکھ لے گا۔''

فرحان ان کے آفس بوائے کا نام تھا جو آفس میں ہی رہائش پذیر تھا۔اسے رہائش کا مسئلہ تھا جو اس طریقے پہ حل ہوسکتا تھا کہ کرنل سدھوا سے گھر لے آتے اور وہ ان کی ذاتی نوعیت کے تمام کام بھی سنبھال لیتا۔

''اب تمہاری مرضی ہے زیور کہ تم یہیں رہنا چاہو یا اپنے گاؤں واپس جانا چاہو۔کوئی تم پہ زور زبردستی نہیں کرے گا۔''

زیور بابا نے ان کی بات کے آخری جملے پہ اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کئے اور جوڑ دیے۔اس بات کا انہیں پہلے سے احساس ہو گیا تھا کہ اس گھر میں اب کم ہی قیام بچا ہے لیکن اب وہ کہاں جاتے سوال یہ تھا۔جس گاؤں کا کرنل صاحب نے اتنے آرام سے نام لیا تھا وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ابا کو فوت ہوئے کئی برس گزر چکے تھے۔ان کی تو دوسری بیوی بھی چل بسی تھی۔ایک سوتیلی بہن تھی جس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ پردیس ہوتی تھی۔اس نے زیور کو ہمیشہ سوتیلا ہی سمجھا تھا۔گاؤں میں جو اکا دکا چچازاد، ماموں زاد تھے وہ بھی مرکھپ گئے یا ان کی طرح قریب المرگ تھے۔اگلی نسل میں سے تو کسی کا نام تک نہ جانتے تھے۔ہوش سنبھالتے ہی اس گھر میں آ گئے تھے اور تب سے اب تک اپنی جوانی میں دو تین بار ہی گاؤں جانا ہوا تھا۔پھر سالوں گزر گئے وہاں مڑ کر نہ گئے۔اب کس حیثیت سے وہاں جاتے اور کس کے پاس جاتے۔

ہاتھ نیچے گرے اور بابا خاموشی سے وہاں سے نکل گئے۔

رطابہ اپنی جیت پہ ایک تفاخرانہ چال چلتی ہوئی اپنے کمرے میں لوٹ گئی۔اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا تھا۔

عروسہ بھی خاموشی سے نکل کر چلی گئی۔بس عابدہ تھی جس کا سکتہ نہیں ٹوٹ رہا تھا۔اس کا زیور بابا سے پندرہ سال پرانا رشتہ تھا۔شفقت کا، محبت کا، رحمدلی کا، احترام کا، روحانیت کا۔۔۔ اس اللہ

کے ولی کا وہ سارا حال جانتی تھی کہ وہ کتنا گپت ہے اور کتنا عیاں۔۔۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اس جیسا سادھو انسان نہیں دیکھا تھا۔ بے غرض، مخلص، اللہ والا اور ہمدرد۔۔۔

اس نے کرنل صاحب جتنا اصول پرست اور سخت دل بھی نہیں دیکھا تھا جنھوں نے کتنی آسانی سے اتنے پرانے ملازم، جو ملازم کم اور مکین زیادہ تھا، کو اتنی آسانی سے ایک طرف کر دیا تھا۔ کوئی رعایت دیے بنا، اس کا مقدمہ سنے بنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

رات کھانے سے کچھ دیر پہلے ہی دانش آفس سے لوٹا تھا۔ لباس تبدیل کر کے جب وہ ہال میں آیا تو کھانا لگ چکا تھا۔ کرنل پاپا، رطابہ اور بچے پہلے سے میز پہ موجود اس کا انتظار کر رہے تھے۔ عابدہ کھانے کے دوران وقتاً فوقتاً میز کا جائزہ لینے آجاتی کہ کہیں چیز کی ضرورت نہ ہو اور رطابہ اسے مسلسل ہدایات دے رہی تھی۔

دانش نے کھانے کے دوران ہی زیور بابا کی غیر موجودگی کو محسوس کیا جب ان کا کام رطابہ کرتی پائی گئی۔

''زیور بابا کہاں ہیں۔۔۔؟''

''زیور کچھ ٹھیک نہیں رہا۔ اس سے کام نہیں ہو سکتا تو میں نے اسے کاموں سے ہٹا دیا ہے۔'' کرنل پاپا نے چاولوں کا چمچہ بھرتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔ ان کی بات پہ دانش کا منہ کی جانب بڑھتا ہاتھ یک دم تھم گیا۔ اذکار جو کھانا کھا رہا تھا وہ بھی چونکا گو بات اسے ٹھیک سے سمجھ نہیں آسکی تھی لیکن کچھ عجیب ضرور لگی تھی۔

''کیا ہوا ہے انہیں۔۔۔؟'' دانش نے کچھ ناسمجھی سے پوچھا۔

''بڑھاپا سب سے بڑی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ وہ اب معاملات نہیں سنبھال سکتا اسی لئے میں نے رطابہ سے کہا ہے کہ وہ براہِ راست معاملات دیکھ لے جیسے لائبہ دیکھتی تھی۔'' دانش نے حیرت سے باپ کو دیکھا اور پھر رطابہ کو جس کے چہرے پہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ وہ محسوس کر سکتا تھا اور ایک لمحہ لگا تھا اسے سب کچھ سمجھنے میں۔۔۔

''زیور بابا بالکل ٹھیک ہیں پاپا۔ انہیں کچھ بھی ایسا نہیں ہوا کہ انہیں نوکری سے نکالا جائے۔'' اس بات پہ اذکار چونکا تھا۔ بات اس کی سمجھ میں اب آئی تھی کہ بابا کو کرنل پاپا نے نوکری سے نکال دیا تھا۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا جو مزے سے کھانا کھا رہی تھی۔ باپ کی طرح وہ بات سمجھا تو نہیں تھا لیکن اسے یہ ضرور پتا چل گیا تھا کہ اس کی ماں بابا کے جانے سے سب سے زیادہ خوش ہوگی کیونکہ یہی تو وہ چاہتی تھی۔

''وہ اب بوڑھا ہو چکے ہیں اور ان سے چیزیں خراب ہو رہی ہیں۔ صبح ہی ان نے تمہاری ممی کا ایرانی واز ٹوٹ گیا ہے۔ اب کیا گھر کی تمام چیزیں انہیں توڑنے کے لئے دے دی جائیں۔ ملازموں کو اتنا سر نہیں چڑھانا چاہئے۔۔'' رطابہ نے رسانیت سے کہا۔

''ملازم نہیں ہیں وہ۔ اس گھر کا فرد ہیں۔ اتنا پرانا رشتہ ہے ان کا اس گھر سے۔۔۔'' دانش کو بھی اذکار کی طرح برح لگتا تھا کہ ان کے لئے ملازم کا لفظ ادا کیا جائے۔ اس کا پورا بچپن ان کی گود میں گزرا تھا۔ وہ اس کے دل میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔

رطابہ نے شانے اچکا دیے۔

''پرانا رشتہ ہے یا نیا، ہیں تو ملازم ہی۔۔۔'' دانش نے غصے سے بیوی کو دیکھا اور پھر باپ کو جو سکون سے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے خیالات بھی رطابہ سے ملتے جلتے تھے تبھی انہوں نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ وہ دونوں ایک جیسے بے حس تھے۔

دانش نے غصے اور بے بسی سے کھانے کی پلیٹ پرے سرکا دی اور میز سے اٹھ گیا۔

''جو بھی ہوا ہے پاپا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

کرنل سدھو نے دانش کو اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا لیکن روکا نہیں۔ اذکار کی بھوک بھی اڑ چکی تھی لیکن وہ پھر بھی خاموشی سے چمچ پلیٹ میں ہلاتا رہا۔ کرنل پاپا سے ڈانٹ کے ڈر سے وہ میز سے اٹھ کر نہیں جا سکتا تھا۔

رات کو رطابہ جب کمرے میں آئی تو دانش بالکونی میں کھڑا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر غصے سے پھنکارا۔

''تم نے اپنے زہر سے اس گھر کو بھی ڈس لیا رطابہ۔ آخر تم کتنی بڑی ناگن ہو جو کسی کو

بھی نہیں بخشتی۔ کسی کو بھی ڈسنے سے باز نہیں آتی۔ تم چاہتی کیا ہو۔۔؟"

رطابہ کو اس بات پہ غصہ نہیں آیا۔ وہ بس مسکرا دی۔

"دیکھ لو کتنی جلدی پاپا کے دل میں جگہ بنا لی میں نے اور اس گھر میں بھی۔" یہ اس کی ایک بڑی فتح تھی جس پہ وہ خوش تھی۔ چیخنے چلانے کا اس کا کوئی موڈ نہیں تھا۔

"تم نے بابا کے ساتھ یقیناً کچھ کیا ہوگا ورنہ پاپا ان کو ایسے کبھی ایک طرف نہیں کر سکتے تھے۔"

"ایک ملازم کے لئے تم گھر کا سکون تباہ کرنا چاہتے ہو۔" دانش نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اگر ان کے ساتھ کچھ برا کیا ہے نا تم نے رطابہ تو یاد رکھو کہ اس شخص کا صبر تم پہ ضرور آئے گا کیونکہ وہ عام انسانوں سے بہت الگ انسان ہے۔"

رطابہ نے دانت پیس کر شوہر کو دیکھا جو پھر سے بالکونی کی طرف جا رہا تھا اور سر جھٹک دیا۔ اسے کسی عام خاص کی پرواہ ہی کہاں تھی۔۔۔؟

☆......☆......☆

اس رات عابدہ زیور بابا کے کمرے میں انہیں کھانا دینے گئی تھی ورنہ وہ خود ہی کچن میں بیٹھ کر کھا لیا کرتے تھے۔ وہ اپنی چارپائی پہ پڑے تھے۔ اس کمرے میں بھی خاموشی تھی اور ان کی ذات میں بھی اس کا بسیرہ تھا۔

"کھانا کھا لیں بابا۔"

کھانا اس نے وہیں میز پہ رکھ دیا۔

"آپ نے صاحب کو حقیقت کیوں نہ بتائی بابا۔۔۔ سب بتا دیتے۔ اپنی صفائی میں کچھ تو کہتے۔ خاموش کیوں رہے۔۔؟"

"خاموشی سو طوفانوں کا بند ہے۔" عابدہ نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

"میں جانتی ہوں یہ سب عروسہ نے کیا ہے وہ بھی رطابہ بی بی کے کہنے پہ۔ اگر میں جانتی ہوں تو آپ بھی تو جانتے ہوں گے۔"

''وہ اپنی جگہ چاہتی تھی جو میں نے اسے دے دی۔ جگہ اسی کی تھی، قابض میں تھا۔ بس بھلے طریقے سے کہہ دیتی مجھے تاکہ میں اپنی جگہ تو کچھ ڈھنگ سے بنالیتا۔'' عابدہ جانتی تھی کہ انہوں نے سب جانتے بوجھتے ہوئے بھی رطابہ کو بچایا تھا۔ یہ تو ان کی فطرت ہی نہیں تھی کہ کسی کے خلاف کچھ کہتے۔

''آپ نے صاحب کو کچھ نہیں بتایا تو مجھے بتانے دیں بابا۔'' اس ناانصافی پہ اس سے چپ نہیں بیٹھا جارہا تھا۔ کوئی بھی باضمیر انسان خاموش نہیں رہ سکتا۔

''نہ۔۔۔ نہ ۔۔۔'' انہوں نے سر نفی میں ہلایا۔

''اس گھر کی ایک نسل تباہ ہوجائے گی اس حقیقت سے۔ میرا کیا ہے، میں تو اکیلا بندہ ہوں۔ نہ رشتے نہ گھربار۔ آج نہیں تو کل تو میں نے بے کار ہونا ہی تھا تو وقت سے پہلے ہی سہی۔۔۔ لیکن دانش کے بچے بیوی ہیں، گھر ہے۔۔۔ صاحب کی سختی سے کون نہیں واقف۔۔۔ ان کا ایک سخت فیصلہ کچھ بھی توڑ سکتا ہے، تباہ کرسکتا ہے کیونکہ دھوکا اور جھوٹ صاحب کبھی برداشت نہیں کرتے پھر وہ بھلے کتنا ہی چھوٹا کیوں نا ہو۔ بعض اوقات ہمیں بہت کچھ بچانے کے لئے ایک آدھ چیز قربان کرنا پڑتی ہے۔'' اور یہ نوکری نہیں تھی جو انہوں نے قربان کی تھی، یہ تو برسوں کا بنایا ان کا مقام اور عزتِ نفس تھی جس کی بڑی قربانی ان جیسا انسان ہی دے سکتا تھا۔

''میں کبھی یہ نہیں سمجھ سکی بابا کہ تم انسان ہو یا کوئی فرشتہ ہو جو ہم جیسوں کے بیچ آگیا ہے۔ تم جیسے بے غرض انسان کا اس غرض بھری دنیا میں کیا کام۔ کیا انسان اتنا بے غرض بھی ہوسکتا ہے کسی دوسرے کے لئے جتنا تم ہو۔ اور اگر ہوسکتا ہے تو تمہارا حال دیکھ کر مجھے لگتا ہے بابا کہ اسے نہیں ہونا چاہئے۔۔''

''یہ دوسرے نہیں ہیں۔ میرے اپنے ہیں ۔ میں نے پوری زندگی اس گھر کو دی ہے۔ اب چاہتا ہوں کہ موت بھی اسی گھر کو دے جاؤں۔'' عابدہ منہ پہ چادر رکھے رونے لگی۔

''تم جو راز جانتی ہو، اس کو خود تک رکھنا عابدہ۔۔۔ بس اس گھر سے وفاداری کا یہی حق ہے۔''

کھانا اسی طرح رکھ کر وہ چلی گئی تھی۔ زیور بابا اسی طرح لیٹے رہے۔

''تم نے یہ سب رطابہ بی بی کے کہنے پہ کیا ہے نا۔۔۔؟ تم جانتی تھی کہ زیور بابا بے گناہ ہیں۔

انہوں نے کچھ نہیں کیا پھر بھی تم نے جھوٹ بولا۔'' اگلے دن جب عروسہ کام مکمل کر کے پانی پینے کچن میں آئی تو عابدہ نے بختی سے اسے گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

''میں مالکوں کا کھاتی ہوں۔ان کے سامنے جواب دہ ہوں، تمہارے یا زیور بابا کے سامنے نہیں۔'' عروسہ کبھی بھی اتنی ڈھیٹ اور بدتمیز نہیں رہی تھی جس کا مظاہرہ وہ اب کر رہی تھی۔

''انسانیت اور خدا خوفی بھی کسی شے کا نام ہے عروسہ۔۔''

''کسی نے میرے ساتھ انسانیت اور خدا خوفی دکھائی تھی کہ میں اس سے کام لیتی۔ بڑے صاحب کیا میرے بچے کا کہیں علاج نہیں کروا سکتے تھے، اتنے تعلقات ہیں ان کے۔۔۔ انہوں نے انسانیت کا کوئی سبق نہیں پڑھ رکھا تھا کیا۔وہ تو بہت پڑھے لکھے ہیں۔''اس نے طنز کیا۔عابدہ خاموش ہوگئی۔

''تو کیا کرتی پھر۔اپنے بیمار بچے کو مرنے کے لئے چھوڑ دیتی اور اس بابا کا ساتھ دیتی جس کا کوئی گھر بار نہیں ہے۔اسے کیا فرق پڑ جانا تھا ایک الزام سے۔۔؟ بس یہی کہ اس کی نوکری ختم ہوگئی ۔پڑا تو وہ اسی گھر میں ہے نا۔کھا پی رہا ہے۔جی رہا ہے۔کچھ نہیں گیا اس کا ۔میں اگر یہ سب نہ کرتی تو میرا بچہ نہ بچ پاتا۔'' عابدہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''تم نے بی بی سے پیسے لئے ہیں علاج کے۔۔۔؟''

''پیسے نہیں لئے۔بی بی خود اس کا علاج اپنے ہسپتال میں کروائیں گی۔بدلے میں ایک چھوٹا سا جھوٹ ہی تو بولنا تھا میں نے۔سو بول دیا۔ایک بے بس ماں ہوں میں۔کیا مجھے اپنے بچے کی جان بچانے کے لئے اتنا بھی نہیں کرنا چاہئے تھا۔۔؟'' عابدہ نے دکھ سے عروسہ کو دیکھا جو اب زمین پہ بیٹھی رو رہی تھی۔انسان بن کر سوچتی تو غلط کیا تھا عروسہ نے۔لیکن ماں بن کر سوچتی تو ایک ماں نے اپنے بچے کی زندگی بچائی تھی۔

ظلم تو رطابہ نے کیا تھا جو کسی کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔عروسہ کے بیٹے کو دل کا عارضہ تھا ۔علاج اس غریب کے لئے ممکن نہ تھا۔ڈاکٹرز نے آپریشن تجویز کیا تھا اور اس میں تاخیر سے بچے کی جان جا سکتی تھی۔آپریشن کا خرچا وہ غریب کہاں سے اٹھاتی۔ایسے میں رطابہ کی پیشکش نے اسے سوچنے

پہ مجبور کر دیا کہ ایک جھوٹ اگر اس کے بچے کی زندگی بچا سکتا ہے تو اسے وہ جھوٹ بول دینا چاہیے۔

"تم نے ٹھیک کیا ہے بیٹا۔" دونوں عورتوں نے کرنٹ کھا کر دیکھا۔ کچن کا وہ دروازہ جو باہر لان میں نکلتا تھا، پہ زیور بابا کھڑے تھے۔

"تم ماں ہو اور اپنا اکلوتا بیٹا بچانے کا تمہیں پورا حق ہے۔" زیور بابا اندر چلے آئے۔ ان کا لہجہ ویسا ہی نرم تھا جیسے ہوا کرتا تھا۔

"اگر کسی اللہ کے بندے کی عزت کا سوال ہو اور دوسری طرف کسی کی زندگی کا تو میں یہی کہوں گا کہ کسی کی زندگی بچا لو۔ تم نے یہی کیا۔۔۔۔ اچھا کیا۔" عروسہ اپنے دوپٹے میں منہ دیے رونے لگی۔ عابدہ کی آنکھیں برسنے لگیں۔

"مجھے پہلے سے پتا ہوتا تو میں بھی تمہیں یہی کرنے کو کہتا۔۔۔"

عروسہ بس روتی رہی۔

"اللہ کا شکر ہے کہ اب تمہارے بیٹے کا علاج ہو جائے گا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس سلسلے میں، میں تمہارے کسی کام تو آیا ورنہ کب سے کوشش میں تھا کہ کچھ کر سکوں لیکن بس دعا کے سوا کچھ کر نہیں پاتا تھا۔ صرف دعاؤں سے کام نہیں بن رہا تھا۔ دوا بھی تو ضروری تھی۔ اب دیکھو دوا بھی ہو جائے گی۔" عروسہ جھٹ سے اٹھی اور زیور بابا کے قدموں میں گر کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"مجھے معاف کر دو بابا۔ خدا کا واسطہ ہے مجھے معاف کر دو۔ میں مجبور ہو گئی تھی۔ میں نے خوشی سے کچھ نہیں کیا۔ میرا تو ایک ہی بیٹا ہے نا، جسے بچانے کے لیے میں دن رات محنت کر کے پائی پائی جمع کر رہی ہوں لیکن وہ پائی لاکھوں میں نہیں بدل پا رہی۔ اسے کچھ ہو جاتا تو میری زندگی میں کیا بچنا تھا۔ میں تو پھر ویسے ہی مر جاتی۔ ایک آسان راستے نے اس کی زندگی بچا لینا تھی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ مجھے کچھ نظر ہی نہیں آسکا پھر۔ مجھے معاف کر دو۔ تمہیں تمہارے رب کا واسطہ مجھے اور میرے بیٹے کو بددعا نہ دینا۔" زیور بابا نے جھک کر عروسہ کو اٹھایا۔ اس کا وہ دوپٹہ جو اس نے ان کے قدموں میں ڈال دیا تھا، اٹھا کر اس کے سر پہ اوڑھا دیا۔

"جھلی! میں کیوں بددعا دینے لگا۔ اللہ تیرے پتر کی لمبی حیاتی کرے۔ میری تو زندگی اتنی بچی نہیں لیکن چلو جتنی بچی ہے وہ تیرے بچے کو لگ جائے۔ میں خوش ہوں کہ اب اس کا علاج ہو جائے گا وہ بھی مفت میں۔ تو اب مزید خوار نہیں ہو گی۔" زیور بابا دل سے سب کہہ رہے تھے یہ ان کے چہرے سے عیاں تھا۔

"مگر میں نے تجھے خوار کر دیا بابا۔۔" وہ پھر سے رونے لگ گئی۔

زیور بابا نے کسی باپ کی طرح اس کے سر پہ ہاتھ دھرا۔

"بھلے چنگا ہوں۔ سر پہ چھت اور کھانے کو روٹی مل رہی ہے اور اس بڈھے باوے کو کیا چاہئے۔" عروسہ نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

زیور بابا نے اس کے ہاتھ تھام کر نیچے کیے۔

"اللہ گواہ ہے مجھے کوئی شکوہ نہیں۔ تو نہ دل برا کر۔ اب جا۔ تجھے دیر ہو رہی ہے۔" عروسہ نے دوپٹے سے ہی اپنا ناک منہ پونچھا اور سلام کر کے نکل گئی۔

عابدہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔

"تو اس دنیا کا نہیں ہے بابا۔ تو تو کہیں اور کا ہی ہے۔" زیور بابا نے کولر سے پانی کا گلاس بھرا۔

"تو تو دعائیں ہی دیتا رہے گا لیکن میرے دل سے کسی کے لئے بددعا نکل رہی ہے۔۔۔"

زیور بابا نے وہیں ہاتھ بلند کر کے اسے روک دیا۔

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ ایسے کسی اللہ کے بندے کو بددعا نہیں دیتے۔ ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور کیا اب ہم اللہ کے کنبے کو بددعائیں دیں گے۔۔۔؟"

"نہیں دیتے ہوں گے لیکن اس کے لئے تو اب واجب ہے کہ کوئی اسے بددعا دے ہی ڈالے جو سب کے لئے کسی بددعا سے کم نہیں ہے۔ وہ اللہ کے کنبے میں سے ہو ہی نہیں سکتی۔" بابا جانتے تھے اس کا اشارہ کس کی طرف تھا۔ انہوں نے ہاتھوں سے اپنے کانوں کو چھوا اور استغفار کر کے واپس چلے گئے۔

☆......☆......☆

ٹرپ سے واپس لوٹنے کے چار دن بعد تک آئینور کالج نہیں آئی تھی۔ اس کا جو نمبر تحریم کے پاس تھا وہ بھی بند ہی جا رہا تھا۔

''ہو سکتا ہے سفر کی تھکاوٹ سے بیمار ہو گئی ہو۔'' سمیرا نے لاپرواہی سے تبصرہ کیا۔

''وہ اتنی نازک نہیں ہے کہ سفر کی تھکان اسے بیمار کر دے۔''

''ہے تو انسان ہی نا۔ انسان کتنا ہی مضبوط کیوں نا ہو، بیمار پڑ ہی جاتا ہے۔''

اس کی غیر موجودگی کو محسوس کر کے عباد نے بھی ان کے گروپ سے حال احوال پوچھتے ہوئے سرسری سا پوچھا تھا کہ آئینور کیوں نہیں آ رہی جس پہ سمیرا نے ناگواری سے رخ موڑا تھا۔

''اسے سب سے زیادہ فکر ہو گی۔'' وہ بس ایسے بڑبڑائی تھی جو کسی نے محسوس تک نہ کیا۔ یہ اس کے اندر کا کینہ تھا کہ عباد کا آئینور کے لئے فکر مند ہونا بھی اسے سخت کھل رہا تھا۔۔۔ اتنا کہ آئینور تک بری لگ رہی تھی۔

''ہم میں سے کسی کا اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ اب کالج آئے گی تو ہی پتا چلے گا۔'' تحریم کی بات پہ عباد بھی کچھ پریشان ہوا تھا۔

پانچویں دن وہ کالج آئی تو بہت خاموش سی تھی۔

''تم کیا مریخ پہ چلی گئی تھی کہ زمینی رابطہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں پریشانی سے برا حال تھا ہمارا۔'' تحریم نے اسے لتاڑا۔

''بس کچھ مسئلہ ہو گیا تھا۔'' وہ جتنی ہشاش بشاش گئی تھی، بہت ہی پژمردہ سی لوٹی تھی۔

''شیئر کرنا چاہو تو میں حاضر ہوں۔'' اسے ہمیشہ تحریم کی مخلصی پہ پیار آتا تھا۔ وہ دھیما سا مسکائی۔ تحریم سمجھ گئی کہ وہ ہمیشہ کی طرح اپنے مسائل کسی سے بانٹنے کے حق میں نہیں ہے۔ اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھپکا۔

''مضبوط لڑکی! کبھی زندگی میں کمزور پڑنے لگو تو اس نکمی کو یاد کر سکتی ہو۔'' آئینور نے محبت سے اسے دیکھا جو سب کے لئے ہمیشہ ایک لاپرواہ اور غیر سنجیدہ لڑکی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اندر سے وہ

کتنی حساس ہے۔

سیرت گروپ کی انشراح خاص اس سے پوچھنے اپنی سیٹ چھوڑ کر آئی تھی۔

"خیریت تھی نا آئینور۔ تم کہاں غائب ہوگئی تھی۔۔۔؟ ہمیں لگا کہ کہیں شادی وادی نہ کروالی ہو۔"

آئینور کا رنگ پھیکا پڑا تھا۔ اسے بھی تحریم کی طرح مذاق کی عادت تھی لیکن اس کا انداز قدرے بھونڈا ہوتا تھا۔

"بس گھر میں کام تھا۔" وہ سر جھکا کر اپنے نوٹس دیکھنے لگی۔

انشراح پھر سمیرا کو لے کر ایک طرف چلی گئی تھی۔ دونوں کونے میں کھس پھس کرنے لگیں لیکن آئینور کو ان کی نظریں خود پہ محسوس ہوتی رہیں۔ کیا وہ اس کے بارے میں بات کر رہی ہیں۔۔۔؟

سر مصدق کی کلاس ختم ہونے کے بعد وہ چاروں کافی دیر لیکچر ہال میں بیٹھی رہیں کہ کلاس نکلے، رش ختم ہو تو وہ آخیر میں نکلیں۔ تبھی عباد اسے ایک کونے میں کسی سے بات کرتا ہوا لیکن اسے دیکھتا ہوا دکھائی دیا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو وہ مسکرا دیا۔ آئینور نے سختی سے رخ پھیر لیا۔ اسے ٹرپ کے دوران کئے گئے سمیرا کے طنز بخوبی یاد تھے اور وہ مزید کسی کو باتوں کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ یوں بھی ان چار دنوں میں جو کچھ ہو چکا تھا، اب کسی مسکراہٹ کی کوئی جگہ نہیں بچی تھی۔

"آئینور۔۔۔" چھٹی کے وقت وہ گیٹ کی طرف جا رہی تھی جب پھولی ہوئی سانس کے ساتھ وہ بھاگتا ہوا اس کی طرف آتے اسے دور سے پکار رہا تھا۔ آئینور نے اسے دیکھا تو اسے مروتاً رکنا پڑا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں۔۔ اتنے دن کالج نہیں آئیں۔"

"ٹھیک ہوں۔ کچھ کام تھا۔" ٹرپ والی نرم خوسی آئینور کہیں جا چھپی تھی اور پھر سے وہی اجنبی آئینور سامنے کھڑی تھی۔ اس کے لہجے نے عباد کو چونکایا تھا۔ اس کی مسکراہٹ سمٹی اور وہ کچھ الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔

"اتنے دن آپ نہیں آئیں اور کسی کو کچھ پتا بھی نہیں تھا۔۔۔"

اس کی بات آئینور نے سختی سے کاٹ دی۔

"تو کیا ہو گیا جو نہیں آئی۔۔ اور آپ کو ضرورت بھی کیا تھی کسی سے کچھ بھی پتا کرنے کی۔۔۔؟"

" وہ صبح سے کئی لوگوں کے سوالات کا جواب دیتے دیتے اکتا گئی تھی اور وہ اکتاہٹ اب اس پہ تمام

ہوئی تھی۔ وہ مزید الجھ کر اسے دیکھنے لگا۔ کیا کہیں کچھ ہوا تھا جس نے اسے تلخ بنا دیا تھا۔۔۔؟

''سوری۔۔۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ چلتی ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' یک دم اسے خود ہی اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہو گیا اور اس نے معذرت کی اور آگے بڑھ گئی۔ عباد تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی آئینور کو دیکھتا رہا۔

آنکھیں بھر آئیں تھیں اس کی کیونکہ وہ، وہ نہیں تھی جس کا اس نے مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے سختی سے آنکھوں کو رگڑا۔ وہ جانتی تھی وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا ہو گا لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ مڑ کر اب دیکھنے کے لئے کچھ نہیں بچا تھا۔

ہوتا ہے نا کہ زندگی کبھی ایسے موڑ پہ لے آتی ہے کہ کچھ لوگ اچھے لگتے ہیں، پیارے ہوتے ہیں لیکن ان کا ساتھ آپ کے لئے نہیں ہوتا۔ تو ایسے پیاروں کو جھٹکنے کے لئے ہمیں برا بننا پڑتا ہے۔ وہ بھی بن گئی تھی۔

سڑک کے کنارے ڈبڈبائی آنکھوں سے چلتی ہوئی آئینور فاطمہ گل سوچ رہی تھی۔

''آئی ایم سوری سوئیل عباد۔۔۔ رئیلی سوری۔۔۔ مگر تمہارے اندر کی سوچ تمہارے چہرے پہ آنے لگی ہے اور مجھے اس سوچ سے ڈر لگتا ہے۔''

وین آ چکی تھی۔ اس نے ایک دو دھکے مردوں کے کھائے، کسی کی جان بوجھ کر لگنے والی کہنی اور کسی کا ہاتھ لیکن بالآخر وہ لیڈی سیٹ پہ بیٹھنے میں کامیاب ہو گئی۔

''جو لوگ زندگی کی چاہ نہیں ہوتے، قسمت انہیں زندگی میں داخل کر دیتی ہے اور جو چاہ بنتے ہیں وہ زندگی کے ہم سفر نہیں بن سکتے۔'' بیگ سے ٹشو نکالتے اس نے اپنی آنکھوں کو رگڑا اور دوپٹہ چہرے پہ اس طرح سے گرا دیا کہ کوئی اس کا چہرہ نہ دیکھ پائے۔

اس دن چھٹی سے پہلے سمیرا کسی کام سے لائبریری گئی تھی۔ وہ تینوں ساتھ نہیں تھیں۔ جب وہ تینوں کینٹین سے پرے والے لان میں پہنچیں تو وہاں سمیرا ریچل کے ساتھ بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ ریچل کلاس کی ایسی لڑکی تھی جسے کوئی بھی زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی ڈریسنگ کلاس میں سب سے الگ

ہوتی تھی اور سب کا خیال تھا کہ وہ سب کی نظروں میں آنے کے لئے ایسا کرتی ہے۔ ریچل کا عباد پہ کرش تھا اور یہ بات ایک زمانہ جانتا تھا کیونکہ وہ اس کا اظہار برملا کرتی تھی اور عباد اس بات سے بہت تنگ ہوتا تھا کہ ایک لڑکی کا نام اس سے خواہ مخواہ جوڑا جاتا ہے حالانکہ وہ اسے دیکھتا تک نہیں۔ اور یہی ریچل کا مسئلہ تھا کہ وہ اسے دیکھتا کیوں نہیں۔۔۔؟

اس لان میں وہ کم ہی آتی تھیں۔ آج ان کی مخصوص سیڑھیوں پہ کوئی اور گروپ بیٹھا تھا اور سامنے والے لان میں رش زیادہ تھا تو وہ یہاں پچھلے لان میں چلی آئیں۔

''یہ تو لائبریری نہیں گئی تھی۔'' صدف نے سب سے پہلے سمیرا کو دیکھا تھا۔

''یہ لیچڑ کے ساتھ کیسے۔۔؟'' تحریم نے خود سے ریچل کو 'لیچڑ' کا نام دیا تھا کیونکہ وہ جب دیکھو عباد کے ساتھ لیچڑ ہونے کی کوشش میں رہتی تھی۔ سمیرا کی جیسے ان پہ نظر پڑی وہ اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔ تحریم نے اسے ان نظروں سے دیکھا کہ 'کدھر بیٹا'۔۔۔

''اس نے کچھ پڑھنے کے لئے روک لیا تھا۔'' تحریم اسے ہنوز اسی طرح دیکھتی رہی جیسے اس کی بات کا اعتبار نہ ہو کیونکہ ریچل نے کچھ بھی پڑھنا ہوتا تو اس کا پہلا ہدف عباد ہی ہوتا تھا اور عباد کبھی کسی کو پڑھانے سے انکار نہیں کرتا تھا۔ سمیرا نے بھی زیادہ صفائی نہیں دی۔ صدف نے آئینور سے کوئی ٹاپک ڈسکس کرنا تھا تو ان دونوں کی ڈسکشن شروع ہوگئی۔

آف ٹائم سے کچھ وقت پہلے وہ سب اٹھ کر سامنے کی طرف چلی آئی تھیں جب انہیں ریچل اور عباد ایک کونے میں کھڑے کسی بات پہ بحث کرتے دکھائی دیے۔ عباد کے چہرے پہ برسوں کی اکتاہٹ تھی اور ریچل کے چہرے پہ وہی بے بسی۔

''لیں جی اب ریچل بی بی عباد صاحب کے گرد لٹو کی طرح پھر سے گھومنے لگی ہیں اور عباد کا بس نہیں چلتا کہ اس کو کالج سے باہر اٹھا کر پھینک دے۔ لیکن ہمت ہے ان کے ضبط کی بلکہ ایکس توپوں کی سلامی ہے۔'' یہ منظر دیکھتے ہی تحریم کی زبان میں کھجلی ہوئی اور وہ کمنٹری شروع ہوگئی۔

''اف یہ ریچل۔۔ اس کو کیا ملتا ہے عباد کے گرد طواف کر کے۔۔؟ کیا اس کی کوئی سیلف

ریسپیکٹ نہیں ہے۔۔۔؟'' صدف نے کوفت سے دیکھتے کہا۔ سمیرا مزے سے کچر کچر چپس کھاتی رہی ۔آئینور نے بس سرسری سا دیکھا اور رخ موڑ لیا۔

''تمہیں لگتا ہے اب بھی کہ اس کی کوئی سیلف ریسپیکٹ ہے وہ بھی عباد کے سامنے۔۔۔؟'' سمیرا نے طنز کیا۔

تبھی آئینور کو گیٹ کے سامنے ملٹی رنگ کی شرٹ میں شمشاد دکھائی دیا اور اس کا سانس رک گیا۔

ساڑھے چار سال میں یہ پہلی بار تھا کہ وہ اسے کالج سے لینے آیا تھا۔ شمشاد کو دیکھ لینے کے بعد اب اس کا وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا اس سے پہلے کہ وہ اسے دیکھ کر اس تک آجاتا اور اپنا تعارف کرواتا، آئینور کو چلے جانا بہتر لگا۔

وہ یک دم سب سے اجازت لے کر جلدی سے گیٹ کی طرف چلی گئی۔ ان تینوں کی توجہ ریچل اور عباد کی طرف تھی اسی لئے زیادہ محسوس نہیں کیا۔

تاہم عباد کی نظر اچانک گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر ایک اجنبی انسان سے بات کرتی ہوئی آئینور پہ پڑی۔ وہ کبھی اس طرح کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ اجنبی کے چہرے اور آنکھوں کی مسکراہٹ نے اسے چونکایا تھا۔ وہ کون تھا اس بات نے عباد کو الجھا دیا تھا۔ ریچل نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

'' اس کا بوائے فرینڈ ہے۔'' عباد کو اس کی بات پہ جھٹکا لگا تھا۔

ناول سپاس گزار کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 8

عباد نے بے یقینی سے ریحل اور پھر اس منظر کو دیکھا جہاں گیٹ پہ کھڑا شمشاد اب مسکراتے ہوئے آئینور کو اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ آئینور اپنی مرضی سے اس شخص کے ساتھ جا رہی تھی۔ان دونوں کے مابین کیا رشتہ تھا یہ شمشاد کی آنکھوں میں اتنے دور سے بھی دکھائی دے رہا تھا۔اس رشتے کے رنگ سب عیاں کر رہے تھے۔

''آئینور ایسی نہیں ہے۔'' اس کے دل نے ہولے سے اسے تسلی دی تھی۔ دنیا جھوٹ بول سکتی ہے لیکن دل نہیں۔لیکن سامنے کے منظر کو وہ کیا نام دیتا۔

عباد کی نظریں وہیں جمی تھیں اور اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ انہیں آئینور سے ہٹا نہیں پا رہا تھا ۔اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔اس لڑکی کو کسی اور کے ساتھ دیکھنا، وہ بھی کسی ایسے کے ساتھ جس کے جذبات انڈ انڈ کر سارے جہاں کو بتانے کے لئے کافی تھے کہ وہ اس کے لئے کیا ہے، عباد کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

ریحل نے اس منظر کو دیکھنے کے بعد پھر سے عباد کو دیکھا اور اس کی نگاہوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''تمہیں کبھی کسی لڑکی کو ایسے دیکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔'' اس کا لہجہ ہموار ہونے کے باوجود عباد کو طنزیہ محسوس ہوا تھا۔

''وہ کسی لڑکی نہیں ہے۔۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔

بھری دنیا میں، اتنے سالوں میں ایک معصوم اور سادہ دل لڑکی جو دنیا سے الگ ہی سوچتی تھی ۔۔۔الگ ہی چلتی تھی۔۔۔اسے ملی تھی اور اب وہ کیسے مان جاتا کہ وہ سب جیسی تھی۔ایک عام لڑکی تھی

۔وہ نہیں مان سکتا تھا۔ وہ خود بھی کہتی کہ میں تو عام سی لڑکی ہوں تو وہ ہنس دیتا۔ اس نے اتنے سال دور سے اور ان چند دنوں میں اسے قریب سے دیکھا تھا۔ وہ باقیوں جیسی تھی ہی نہیں۔

''ایسا کیا ہے آئینور میں۔۔۔؟'' ریچل کو اتنی جلن ہوئی تھی کہ اس کا دل کیا وہ ایک تیزاب کی بوتل آئینور پہ انڈیل دے تا کہ وہ جان سکے کہ ریچل کیسی جلن میں مبتلا ہے۔

''وہ جو مجھے کبھی کہیں نہیں ملا کچھ ایسا ہی ہے۔'' جواب دل میں دیا گیا تھا کہ معاملہ دل کا تھا۔

عباد کی نظروں سے آئینور اوجھل ہو چکی تھی۔ اس نے سر جھٹکا۔ وہ خواب سے حقیقت میں آ چکا تھا۔

''تم کیا کہہ رہی تھی۔۔۔؟'' ریچل کے لئے سلسلہ کلام جوڑنا مشکل تھا کیونکہ عباد کے وجود پہ بڑا بڑا لکھا تھا کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ پھر وہ بات کس سے کرتی۔۔۔؟

''کچھ نہیں۔۔۔ اس وقت تمہیں چلے جانا چاہئے۔'' اس نے انگریزی میں کہا اور پھر سر نفی میں ہلا کر خود ہی وہاں سے چلی گئی۔ وہ اس شخص کی آنکھوں میں کسی اور کے لئے وہ جذبات دیکھ ہی نہیں سکتی تھی جو وہ خود کے لئے دیکھنا چاہتی تھی۔

''اس کا بوائے فرینڈ ہے۔'' ریچل کا کچھ دیر پہلے کا کہا جملہ اس کے کانوں میں گونجا۔ عباد نے الجھ کر جاتی ہوئی ریچل کو دیکھا۔ دل کیا کہ وہ اسے روک کر پوچھ لے کہ اس نے اتنی بڑی بات کہہ کیسے دی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم گیٹ کی جانب بڑھ گئے۔ وہ کسی کا پیچھا کرنے جیسی گری ہوئی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ اس سے نادانستگی میں ہو رہی تھی۔ ایک خاص لڑکی کے لئے وہ عام سا ہونے جا رہا تھا تا کہ یہ جان سکے کہ کیا وہ بھی عام سی ہی ہے۔

گیٹ سے باہر سڑک پار کرنے کے لئے عباد کو دور ایک گاڑی کی فرنٹ سیٹ پہ آئینور بیٹھی دکھائی دی تھی۔

''اس کا کوئی رشتے دار ہو سکتا ہے۔ آئینور ایسی نہیں ہے۔'' اس سے زیادہ وہ اس کے پیچھے جانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اس کی عزت نفس دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی، اسے کچھ تو خیال کرنا تھا اس کا۔۔۔ وہ اب سڑک پار کر کے فوٹو اسٹیٹ کی دکان کی طرف جا رہا تھا۔

وہ پورا دن اس کا اسی منظر کے جھٹکنے ابھرنے کی کیفیت میں گزرا اور اگلے دن یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ رتیچل کے پاس وہ خود گیا تھا۔

''کل تم نے کہا تھا کہ وہ اس کا بوائے فرینڈ ہے۔ تم کسی کے بارے میں ایسی بات منہ سے کیسے نکال سکتی ہو۔ وہ لڑکی ایسی نہیں ہے۔'' رتیچل جو کتابیں کھول کر بیٹھی ساتھ رکھی پلیٹ سے برگر اٹھا کر منہ میں ڈال رہی تھی یک دم عباد کے بنا کسی تمہید کے بات شروع کرنے پہ چونکی تھی۔

برگر اس نے واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

''ہر لڑکی سرعام ایسے کام نہیں کرتی عباد ڈیئر۔ لیکن کرتی وہی کام ہے جو دوسری لڑکیاں ڈنکے کی چوٹ پہ کرتی ہیں۔'' عباد کو آئینور کے لئے یہ سب سننا برا لگا تھا۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

''تمہیں کسی کے بارے میں ایسی رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''اگر تمہیں یقین نہیں ہے تو اس کی دوستوں سے جا کر پوچھ سکتے ہو۔'' وہ ایسی گھٹیا حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

''بلکہ رکو۔ میں کال ملاتی ہوں اس کی دوست کو۔ تم سپیکر پہ سب سن سکتے ہو۔'' وہ ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس نے رتیچل کو یہ سب کرنے سے روکا بھی نہیں تھا۔

اس نے کال ملائی۔ کچھ دیر بیل جاتے رہنے کے بعد دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا۔ ہیلو کی آواز کے ساتھ ہی وہ پہچان گیا تھا کہ وہ سمیرا تھی۔ سمیرا براہِ راست اس کے سامنے ہوتی تو کبھی یہ بات ہو ہی نہیں سکتی تھی لیکن اب چونکہ وہ نہیں جانتی تھی کہ عباد بھی اس کی گفتگو سن رہا ہے تو رتیچل نے سہولت سے پوچھا۔

''مجھے کچھ پوچھنا تھا یار۔ اگر تم آئینور کے ساتھ ہو تو پلیز کچھ فاصلے پہ چلی جاؤ۔ بات ایسی ہے کہ سب کے سامنے نہیں کی جا سکتی۔'' رتیچل نے یہ کہہ کر عباد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بہت غیر آرام دہ تھے۔

''ہاں بولو۔ میں ایک طرف ہی ہوں۔ خیریت ہے نا۔۔۔؟''

''کیا آئینور کا کوئی بوائے فرینڈ ہے۔۔۔؟'' اس کی بات پہ سمیرا نے کچھ تعجب کا اظہار کیا۔

''آئینور کا بوائے فرینڈ۔۔۔؟ تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو۔۔؟''

''بتاؤ نا یار کیا اس کا کوئی بوائے فرینڈ ہے۔ کل وہ کسی لڑکے کے ساتھ جا رہی تھی۔'' دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر اس نے گہرا سانس لیا۔

''وہ کلیئر تو نہیں بتاتی کہ اس کا کسی کے ساتھ افیئر ہے لیکن یس۔۔۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اس کی لائف میں کوئی ہے۔'' عباد کے اوپر ٹنوں کے حساب سے کوئی بوجھ آ گرا تھا کہ اس کے نیچے دب کر اس سے سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔

''تو مطلب کل جو اسے لینے آیا تھا وہ اس کا بوائے فرینڈ تھا۔''

''میں نے تو نہیں دیکھا کہ کل وہ کس کے ساتھ گئی ہے لیکن اگر وہ کسی کے ساتھ گئی تھی اور وہ اس کا بھائی نہیں تھا جو اس کو کبھی کبھار لینے آتا ہے تو پھر عین ممکن ہے کہ وہی ہو۔'' سمیرا کی بات پہ ریچل نے جتاتی نظروں سے عباد کو دیکھا۔ عباد کا چہرہ۔۔ اس کے تاثرات۔۔۔ ریچل کو اس پہ ترس آیا۔۔۔ اسے یہ سب نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اگر وہ اس سے محبت کی دعوے دار تھی تو اسے کچھ ترس اس انسان پہ کھا لینا چاہئے تھا جو مرض عشق میں مبتلا تھا۔

مزید اس سے وہاں کھڑا ہونا مشکل تھا۔ وہ کچھ کہے بنا وہاں سے چلا گیا اور ریچل نے بھی کال وہیں کاٹ دی۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اب وہ پھر سے برگر کھانے لگ گئی۔

☆......☆......☆

یہ اس سے اگلے دن کی بات تھی جب گھر میں ایک ہنگامہ ہوا تھا۔

دانش آفس میں بیٹھا اپنے کسی کلائنٹ سے بات کر رہا تھا جب اس کے موبائل پہ کسی پی ٹی سی ایل نمبر سے کال آنے لگی تھی۔ ایک بار اس نے کاٹ دی تو دوسری بار پھر سے آنے لگی۔ اب اس نے کلائنٹ سے معذرت کی اور ایک طرف جا کر کال اٹھالی۔

''مسٹر دانش نواز۔۔۔؟''

''یس۔۔۔''

''میں اذکار کے سکول سے بات کر رہی ہوں۔ ان کی کلاس ٹیچر آپ سے آج ہی ملنا چاہتی ہیں۔اٹس ارجنٹ۔'' دانش نے اسی وقت کلائنٹ کا کام نمٹا کر باقی کام ایک کولیگ کے حوالے کیا اور اذکار کے سکول کی طرف نکل گیا۔

سکول پہنچ کر وہ پرنسپل آفس کی طرف ہی گیا تھا۔ پرنسپل اپنی سیٹ پہ موجود نہیں تھیں اسی لئے اسے وزیٹنگ روم میں بٹھا دیا گیا جہاں پندرہ منٹ بعد اذکار اپنی کلاس ٹیچر کے ساتھ آیا تھا۔اس کا بیگ اس کی ٹیچر کے پاس تھا۔اذکار کا چہرہ ستا ہوا تھا اور وہ نیچے ہی دیکھ رہا تھا۔ کچھ غیر معمولی تھا جس نے دانش کو چونکایا۔ ٹیچر نے بیگ وہیں رکھ دیا اور اذکار کو باہر جھولوں کی طرف بھیج دیا۔

''سر میں پہلے بھی ایک دو بار نوٹ کر چکی ہوں کہ اذکار مینٹلی ڈسٹربڈ ہے لیکن آج جو کچھ ہوا ۔۔۔'' بنا کوئی تمہید باندھے اس کی ٹیچر کہہ رہی تھیں۔

دانش نے الجھی نظروں سے انہیں دیکھا۔

''آج اذکار کو میں نے ریڈنگ کے لئے کھڑا کیا تو وہ بالکل خاموش تھا۔ میں نے اسے ریڈنگ کرنے کے لئے کہا تو اس نے یک دم رونا شروع کر دیا۔ وہ اس بری طرح رو رہا تھا کہ ساری کلاس ہی پریشان ہوگئی۔'' دانش کا سانس رک سا گیا۔

''عموماً بچے ایسا مونٹیسوری کلاسز میں تو کرتے ہیں لیکن اس لیول پہ نہیں کرتے۔ نہ کلاس میں کوئی ایسی بات ہوئی تھی جس پہ روتا نہ ایسا تھا کہ وہ ریڈنگ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے میں نے اسے وقتی طور پہ کلاس سے باہر بھیج دیا تاکہ کلاس کا ماحول متاثر نہ ہو لیکن کلاس ختم ہوتے ہی میں نے اسے سکول کی سائیکالوجسٹ کے پاس بھیج دیا۔'' دانش سب کچھ بالکل صم بکم کی کیفیت میں سن رہا تھا۔

''سائیکالوجسٹ نے اس کا کافی دیر تک سیشن کیا ہے۔اس نے جو کچھ بھی انہیں بتایا وہ میں نہیں جانتی۔ان کو کسی بچے کی بھی سیشن کے دوران کی گئی باتیں کسی کو بھی بتانے سے منع کیا گیا ہے لیکن انہوں نے یہ بتایا ہے کہ اذکار شدید مینٹل سٹریس کا شکار ہے اور اگر سب ایسا ہی رہا تو وہ شدید ڈپریشن میں جا

سکتا ہے۔" بت بنے دانش نے کرب سے آنکھیں اور مٹھیاں دونوں بھینچ لیں۔

جو حالات چل رہے تھے یہ سب ہونا کوئی انہونی نہیں تھی لیکن وہ پھر بھی اسے انہونی ہی لگی تھی۔

"اگر گھر میں کوئی پرابلم ہے بھی سر تو پلیز بچے کو اس سے دور رکھیں۔ والدین کے جھگڑوں میں یا کسی بھی گھریلو سیاست میں بچے کو کیوں لا رہے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہ بچہ کتنا حساس ہے۔"

وہ کیا بتاتا کہ سب سے بڑی پرابلم تو بچے کی ماں ہے، اب بچے کو کیسے کوئی ماں سے دور رکھ سکتا ہے۔

"میں پوری کوشش کروں گا۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے بروقت اطلاع کر دی۔" اس نے انگریزی میں کہا اور اذکار کا بیگ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

وہ کوشش۔۔۔ جو وہ کئی سالوں سے کر رہا تھا۔۔۔ ویسی ہی مزید کوشش۔۔۔ وہ مزید کرے گا۔

"ذکی۔۔۔" دور سے اس نے جھولوں پہ کھیلتے اذکار کو پکارا۔ اذکار جلدی سے بھاگتا ہوا باپ کی طرف آ گیا۔

"چلیں۔۔" اس نے سر جھکائے کھڑے اذکار سے پوچھا تو اس نے سر ہلا دیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر بھی اس نے اذکار سے کچھ نہیں پوچھا۔

وہ خاموش تھا اور گاڑی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اب تک ایک بار بھی اس نے باپ سے نظریں نہیں ملائی تھیں جیسے وہ کسی پچھتاوے کا شکار ہو۔ اسے شرمندگی ہو۔

دانش نے ایک طرف گاڑی روک دی۔ تب اذکار نے چونک کر باپ کو دیکھا جو اسے دیکھ رہا تھا پھر سے نظریں جھکا لیں۔ وہ جانتا تھا کہ باپ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔

"کیا ہوا تھا ذکی۔۔۔؟" اس کا لہجہ اتنا نرم تھا کہ اس کا اپنا دل بھر آگیا۔

"آپ جانتے ہیں۔"

"تم بتاؤ۔ میں نہیں جانتا۔"

"زیور بابا کو ماما نے کرنل پاپا سے کہہ کر نکلوا دیا کیونکہ ماما نہیں چاہتی تھیں کہ میں ان سے بات کروں۔" دانش نے تکلیف بھرا سانس لیا۔ وہ اس سارے معاملے کو اس تناظر سے دیکھ رہا تھا جو شاید

غلط نہیں تھا۔ زیور بابا کو نکلوانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔

''ایسا نہیں ہے ذکی۔ بابا ہمارے گھر رہتے ہیں، وہ کہیں گئے تو نہیں ہیں بیٹا۔ بس وہ بوڑھے ہو گئے ہیں، بیمار ہو گئے ہیں اسی لئے انہیں کام سے منع کر دیا گیا ہے۔ انہیں کسی نے کہیں سے نہیں نکالا۔ یہ ان کا گھر ہے۔ بھلا وہ یہاں سے کہاں جائیں گے۔۔۔؟'' ذکی نے بے یقینی سے باپ کو دیکھا کہ کیا وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ دانش نے سر اثبات میں ہلا دیا تا کہ وہ اس کی بات کا یقین کر سکے۔

''وہ ہمارے لئے دادا جیسے ہیں ذکی۔ ہم انہیں گھر سے کیسے نکال سکتے ہیں۔۔۔؟'' بیٹے کے اعتماد کو مضبوط کرنے کے لئے اسے کہنا پڑا۔

''وہ دادا جیسے نہیں ہیں۔ دادا جیسے ہوتے تو ماما کبھی ان سے بدتمیزی نہ کرتیں۔ دادا سے تو ماما ڈرتی ہیں کیونکہ وہ ڈانٹتے ہیں۔ زیور بابا نے کبھی کسی پہ غصہ تک نہیں کیا اس لئے ان سے کوئی کیوں ڈرے گا۔ مما کے لئے وہ نوکر ہیں اور نوکروں کو تو ماما پہلے بھی نکالتی رہی ہیں۔'' اس نے باپ کو دیکھا اور اتنا کہہ کر منہ پھیر لیا۔

دانش کے پاس اس بات کے جواب میں کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اپنے بچے کو جھوٹ کی ملمع کاری کر کے سچ نہیں بتا سکتا تھا۔ جو بچہ سچ کو خود پرکھنے لگ جائے اس کے سامنے جھوٹ بولنا خود اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرنا ہے۔

دانش نے اسے گھر کے سامنے اتار دیا۔ اسے واپس آفس جانا تھا۔

''ذکی۔۔۔ ماما کو کچھ مت کہنا۔ میں خود ان سے بات کروں گا۔'' اذکار نے سر ہلا دیا۔ جب وہ گیٹ سے اندر داخل ہوا تو دور اسے لان کی ایک سمت میں جہاں زیور بابا کا کمرہ تھا، وہ دھوپ میں بیٹھے دکھائی دیے۔ اپنا بیگ وہیں لان میں چھوڑ کر ان کے پاس چلا گیا۔

گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے، ہاتھ میں تسبیح لئے، آنکھیں بند اور ہونٹ ہلاتے وہ ذکر میں مصروف تھے۔

وہ ان کے پاس وہیں زمین پہ بیٹھا تو انہوں نے آنکھیں کھولیں۔

''آئی ایم سوری بابا۔'' اپنے ننھے ننھے ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

چمکنے لگے جو بہنے کو تیار تھے۔

''زکی بابا۔۔۔'' زیور بابا بالکل گنگ رہ گئے۔

''ماما نے جو کیا ہے اس کے لئے میں آپ سے سوری کرتا ہوں۔'' دنیا کے والدین اولاد کے کئے کی معافیاں مانگتے ہیں کہ وہ نادان ہے اور وہ نادان اپنی ماں کے کئے کی معافی مانگنے وہاں بیٹھا تھا۔

بابا نے جھٹ سے اس کے ننھے ہاتھوں کو اپنے جھریوں بھرے، سخت، کھردرے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''نہ میرا بیٹا۔۔۔نہ۔۔۔'' اس کے ہاتھوں کو وہ دیوانہ وار چومنے لگے۔

''آپ کا کیا قصور۔۔؟ آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ماما کو معاف کر دیں۔۔۔وہ آئندہ نہیں کریں گی۔۔۔کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ ہمیشہ یہی کریں گی۔۔۔لیکن پھر بھی انہیں معاف کر دیں۔'' وہ سسکیاں لے رہا تھا۔

زیور بابا نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر اسے خود سے بھینچ لیا۔وہ نو سال کا بچہ کس کرب سے گزر رہا تھا وہ محسوس کر سکتے تھے۔کوئی بچہ جب اپنی ماں کی طرف سے کسی کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ کس ذہنی اذیت میں مبتلا ہوگا اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ تھا۔انہیں افسوس تھا۔وہ حساس دل رکھنے والا کہاں سے اس سنگ دل کے ہاں پیدا ہو گیا تھا۔۔۔اسی لئے اللہ نے آزر کے ہاں ابراہیم علیہ سلام کو پیدا کیا کہ وہ انسان کو سمجھا سکے کہ ظالم والدین کے ہاں نیک اولاد بھی پیدا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔۔۔ بس ایسے بچوں کی آزمائش بہت کڑی ہوتی ہے۔

''ذکی بابا۔۔ایسا تو کچھ نہیں ہوا کہ جس پہ آپ مجھ سے معافی مانگیں۔۔آپ تو اللہ کے باغ کے پھول ہیں۔آپ تو فرشتوں جیسے معصوم ہیں۔ایسے پیارے سے پھول کو بھلا معافی کی کیا ضرورت ہے۔آپ ایسے مت روئیں۔مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔بی بی نے کچھ ایسا نہیں کیا۔مالک تو ملازموں کے ساتھ ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا۔مجھے کوئی گلہ نہیں ہے کسی سے۔اور آپ سے تو بالکل بھی نہیں ہے۔''

''آپ میری ماما کی شکایت اللہ سے نہ کرنا بابا۔ پلیز ان کی کوئی شکایت اللہ سے نہ کرنا۔'' زیور بابا کو اس کی بات پہ شدید جھٹکا لگا تھا۔

''آپ نے شکایت کر دی تو اللہ ان کو سزا دے گا۔ میری ٹیچر کہتی ہیں کہ اللہ کی سزا بہت سخت ہوتی ہے۔ اس کی سزا سے پھر کوئی نہیں بچا سکتا۔''

زیور بابا نے تو اپنا معاملہ اللہ کی عدالت میں پیش کر دیا تھا لیکن اب لگ رہا تھا کہ انہیں اللہ کو منصف بنانے کی بجائے گواہ بنا کر کہہ دینا چاہئے تھا کہ ایک عورت جس کے ہاتھوں ان کی عزت محفوظ نہ رہ سکی، اس عورت کو انہوں نے اس بچے کے لئے معاف کیا جو اپنی ماں کا تاوان اپنے ذہنی کرب سے ادا کر رہا تھا۔۔۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کاش وہ اس بچے کی تکلیف کو اپنے ہاتھ سے دور کر سکتے ۔لیکن ان کے الفاظ اگر اس کو حوصلہ دے سکتے تھے تو انہیں یہ کام کر دینا چاہیے تھا۔

''میں اللہ کے بندوں کی شکایت اللہ سے نہیں کرتا۔''

اذکار نے اپنے آنسو صاف کر کے انہیں دیکھا۔

''اللہ اپنے بندوں کی شکایت سن تو لیتا ہے لیکن بندے سے بندے کی شکایت سننا اسے اچھا تو نہیں لگتا ہو گا کیونکہ ساری مخلوق اسی کا کنبہ ہے۔'' ذکی نے تھوک نگلا۔

''آپ کی ماما کی بھی نہیں کروں گا۔''

''اللہ انہیں سزا تو نہیں دے گا۔۔۔؟'' وہ کیا کہتے کہ اس عورت نے تو خود اپنی اولاد کو تکلیف میں مبتلا کر کے اپنے لیے سزا کا انتخاب بہت پہلے ہی کر لیا تھا لیکن اسے اس کا احساس نہیں تھا۔ کاش کہ وہ جان جاتی کہ انسان کا اس دنیا کا سب سے قیمتی سرمایہ وہ فصل ہوتی ہے جس کا نام اولاد ہے۔ اس کی ساری ریاضتیں اسی ایک فصل کی آبیاری کے لئے ہی تو ہوتی ہیں۔۔ اس عورت نے اپنی ہی فصل کو گھن لگا دیا تھا اور گھن جب کسی شے کو لگ جائے تو اسے کہاں چھوڑتا ہے۔ خاتمہ اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

بابا نے ایک گہرا سانس لیا۔

''نہیں میرے بچے۔۔۔ اللہ رحمان ہیں، رحیم ہیں۔ وہ تو بہت پیار کرتے ہیں بندوں سے۔ وہ

کسی کو سزا نہیں دیتے۔" اس کو خود سے لگائے وہ تھپکنے لگے تھے۔

"بندوں کو دینا اور دیتے رہنا اللہ کو پسند ہے۔ اس سے لینا اور اسے درد دینا اللہ کو کیسے محبوب ہو سکتا ہے۔" یہ وہ نہ کہہ سکے کہ یہ تو بندہ ہی ہے جو اپنے ہاتھوں اپنا مقدر ایسا لکھتا ہے۔

"بابا۔۔۔!" اس نے خود کو ان سے الگ ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"یہاں سے کہیں مت جایئے گا۔ مجھے آپ سے بات کرنا بہت زیادہ اچھا لگتا ہے۔" بابا اس معصوم کی بات پہ مسکرا دیے۔

اس کے گالوں کو ہولے سے تھپکا۔

"چلو اب اندر جاؤ اور جا کر یونیفارم بدل لو۔ پھر عابدہ سے کہنا کھانا بنا دے۔" ذکی نے سر ہلایا اور ان کے ہاتھ کو نرمی سے چھو کر اندر چلا گیا۔

زیور بابا اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ ان کی کوئی اولاد ہوتی اور اس کی بھی کوئی اولاد ہوتی تو وہ اس سے اتنی ہی محبت کرتے جتنی انہیں اذکار سے تھی۔ اللہ نے اگر بہت سے پیاروں کو لے لیا تھا تو اس کے بدل میں بہت سے پیارے لوگوں کا ساتھ ساری زندگی ساتھ رکھا تھا۔

☆......☆......☆

دانش آفس کا کام نبٹا کر ایمرجنسی کا بول کر جلدی نکل آیا تھا۔ نکلنے سے بہت پہلے ہی اس نے کال کر کے رطابہ کو بتایا تھا کہ وہ اسے لینے آئے گا۔ رطابہ نے حیرت سے اس کی بات سنی تھی لیکن کوئی بحث نہیں کی تھی۔

واپسی پہ وہ اسے ہسپتال سے لے کر، اس کی گاڑی وہیں پارک چھوڑ کر اسے اپنے ساتھ قریبی پارک میں لے گیا تھا جو عموماً اس وقت خالی ہی ہوتا تھا۔

"ہم یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔۔؟" رطابہ دانش کے خود کو لینے آنے پہ ہی قدرے حیران تھی اور اب یہاں۔۔۔ دانش اسے معمول سے زیادہ الجھا ہوا لگا تھا۔

"مجھے بات کرنا تھی تم سے۔ گھر پہ مجھے ٹھیک نہیں لگا اور کہاں لے کر جاتا۔"

''اور یہاں پبلک میں لانا تمہیں ٹھیک لگا۔۔؟ یہاں چیخنا، چلانا، تماشا کرنا تمہیں ٹھیک لگا۔۔۔؟''
وہ طنزیہ اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے پوچھ رہی تھی۔
''فکر مت کرو۔ میں نہیں چیخوں گا۔'' اس کا لہجہ اتنا تھکا ہارا تھا جیسے وہ برسوں کی اس مسافت سے تنگ آ چکا ہے۔ اب اس میں چیخنے کی بھی ہمت ختم ہو چکی تھی۔
''گھر پہ بچے ہوتے۔ ان کے سامنے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ذکی پہلے ہی بہت سفر کر رہا ہے۔'' رطابہ چونکی۔
''ذکی۔۔۔؟''
''رطابہ! میری بات غور سے سنو پلیز۔ پلیز اللہ کا واسطہ کہ چیخے چلائے بنا میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا۔'' اس وقت وہ پارک کے قدرے سنسنان گوشے میں تھے۔ وہاں ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ کوئی تماشا نہیں چاہتا تھا لیکن اگر کوئی تماشا لگنا بھی تھا تو انجان لوگوں کے سامنے ہی لگنا تھا جو تماشا دیکھتے اور اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔۔۔ بات ختم۔۔۔ کم از کم ان کے بچوں تک اس کے اثرات نہیں جانا تھے۔
''ذکی کے سکول سے مجھے کال آئی تھی۔ ان کے سکول کی سائیکالوجسٹ نے اس کا سیشن لیا ہے۔''
''سائیکالوجسٹ۔۔۔؟'' اسے جھٹکا لگا تھا۔
''ذکی شدید مینٹل سٹریس میں ہے۔ یہ شدید ڈپریشن میں بدل جائے گا اگر ہم نے اپنا تعلق نہ بدلا۔'' وہ بہت ضبط سے ٹھہر ٹھہر کر اسے بتا رہا تھا۔
''ہو سکتا ہے کہ میں ایک شوہر نہیں ثابت ہو سکا۔ تمہیں مجھ سے ساری زندگی نفرت ہی رہی اور نفرت ہی رہے گی۔ تم مجھے بطور شوہر قبول نہیں کر سکی۔۔۔ لیکن تم میرے سے ہٹ کر اپنے بچوں کا تو سوچو رطابہ۔ تم ایک ماں بھی تو ہو۔ کیا تمہیں یہ دکھائی نہیں دیتا کہ ہمارے آپس کی چیخ چیخ سے ہمارے بچے متاثر ہو رہے ہیں۔ ان کی ذہنی صحت اثر انداز ہو رہی ہے۔'' وہ سچ میں اتنا تھکے ہارے انداز میں بات کر رہا تھا جیسے اتنی سی بات کہنے میں بھی اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

''کیا بچوں کا سوچنا صرف میرا فرض ہے۔۔۔؟'' دانش نے کرب سے آنکھیں موندیں۔

''نہیں۔۔۔'' مزید تھکاوٹ آمیز لہجہ۔

''میرا بھی ہے۔ہم دونوں کا ہے۔''

''تو ہر بار تم مجھے ہی کیوں یہ احساس دلاتے ہو کہ میں ہی بچوں کی پرواہ نہیں کرتی۔۔۔جو کچھ ہو رہا ہے وہ میری وجہ سے ہے۔۔۔میں نے انہیں اس حال تک پہنچایا ہے۔اپنا ذکر کرنا تم کیوں بھول جاتے ہو۔۔۔؟'' وہ وقت کبھی آنا ہی نہیں تھا جب سامنے کھڑی وہ عورت سکون سے کسی بات کو سنتی اور اسے سمجھ کر احساس کرنے کی کوشش کرتی کہ حالات کیا ہو چکے تھے۔

''میں نے پہنچایا ہے یار۔۔۔میں نے۔۔۔میں نے ہی کیا ہے سب۔میں مانتا ہوں کہ مجھ سے ہی ہوا ہو گا سب کچھ۔مجھے ہی نہ رہنا آیا خاندان میں اور نہ اپنا خاندان بنا کر رکھنا آیا۔مجھے بیوی کو طریقے سے رکھنا نہیں آیا۔میں ہی برا شوہر ہوں اور برا باپ بھی ہوں۔۔مجھ سے ہی کوتاہیاں ہوئی ہیں۔۔۔میں تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہا یار۔۔میں ہی کمینہ ہوں جس سے اپنے رشتے نہیں سنبھالے گئے۔سب قصور میرا ہی ہو گا یقیناً۔'' وہ کوئی طنز نہیں کر رہا تھا۔وہ بس تھک کر ہار مانتے ہوئے سارے گناہ اپنے کھاتے میں ڈال رہا تھا کہ اصل مجرم میں ہوں۔وہ سخت بیزاری سے یہ سب کہہ رہا تھا کیونکہ اس وقت اس کا مقصد بات سمجھانا تھا اور یہ تبھی ممکن تھا کہ وہ سارے قصور اپنے کھاتے میں ڈال دیتا۔

''لیکن اب میں ہاتھ جوڑ کر۔۔۔'' اس نے ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کیے۔

''تم سے درخواست کرتا ہوں رطابہ۔۔۔'' اس کی آنکھیں بھرا گئیں۔

''کہ پلیز ہمارے بچوں کا ذرا سا خیال کرو۔۔۔'' آواز بھرا گئی۔

''میرا نہیں بس بچوں کا۔۔۔'' اسے لگا کہ بس اگلے جملے کو ادا کرتے وہ رو دے گا۔

''پلیز بچوں کا خیال کر کے وہ سب مت ہونے دو جو ہوتا رہا ہے۔'' اس کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

''پلیز ذکی کا خیال رکھو۔وہ بہت زیادہ حساس بچہ ہے۔۔۔یہ وقت ہے جب بچوں کو ہماری ضرورت ہے رطابہ۔اگر یہ وقت گزر گیا تو اپنے ساتھ وہ تباہی کے اثرات چھوڑ کر جائے گا جنہیں ہم

واپس نہیں پلٹا سکیں گے۔ بچوں کی تربیت کا یہی وقت ہے۔ اس وقت ہم سے جو غلطیاں ہو رہی ہیں، بعد میں ہم انہیں ٹھیک نہیں کر پائیں گے۔'' ضبط کرنے سے اس کی آنکھوں کی لالی بڑھ گئی تھی۔

اس نے ہاتھ اسی طرح اس کے سامنے بندھے رہنے دیے اور اپنے کپکپاتے ہوئے لبوں کو بھینچ کر اپنا چہرہ ذرا سا پھیر لیا۔ رطابہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

دانش کی آنکھ سے ایک آنسو گال پہ بہہ نکلا۔ اس نے ہاتھ پہلو میں گرا دیے اور پورا پلٹ گیا۔ وہ رو رہا تھا لیکن سامنے کھڑی عورت اس کی کبھی بھی ویسی ہم سفر نہیں رہی تھی جس کے سامنے وہ آنسوؤں کو بہہ جانے دیتا۔

''ٹیچر نے کیا کہا ہے۔۔۔؟ مجھے ڈیٹیل بتاؤ۔'' وہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہی تھی پھر اس نے دانش کے برابر آ کر اس کے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

''ذکی سے اس کی کیا بات ہوئی میں نہیں جانتا۔ وہ یہ سب کسی سے ڈسکس نہیں کرتیں۔۔۔ لیکن ذکی شدید منٹل سٹریس میں ہے، جس کی وجہ سے وہ آج کلاس میں رو پڑا۔'' رطابہ کے لئے یہ جھٹکا ہی تھا۔

''مگر ایسا کیا ہوا ایک دم سے کہ۔۔۔'' وہ الجھ گئی۔

''ذکی اس بات پہ ڈسٹرب ہے کہ تم نے زیور بابا کو کام سے نکلوایا ہے۔'' سچ سن کر رطابہ کے چہرے کے تاثرات بدلے۔

''واٹ۔۔؟'' بے یقینی تھی، صدمہ تھا اور غصہ پل بھر میں عود آیا۔

''وہ اس نوکر کی وجہ سے سکول میں رو پڑا۔۔۔؟''

''نوکر نہیں ہے وہ رطابہ۔۔۔ نوکر ہی تو نہیں ہے وہ۔۔۔'' اس نے نرمی سے اس کی بات کاٹی۔

''اس بوڑھے نے ہی ہم بہن بھائیوں کا ساری عمر خیال رکھا ہے۔ باپ ہمارا سارا دن آفس میں ہوتا، پوسٹنگ پہ کبھی کہاں کبھی کہاں۔۔۔ تب وہ بوڑھا ہی ہمارا باپ بن جاتا۔ ہمیں کبھی اس نے باپ کی کمی نہیں محسوس ہونے دی۔ اب وہی بوڑھا ذکی کا دادا بن گیا ہے۔ نوکر مت کہو انہیں۔۔۔ ذکی

کے لئے وہ اپنے دادا سے بڑھ کر ہے۔ اس نیک صفت، بے ضرر انسان کو نوکر مت کہو۔'' اس کی نرماہٹ، ملتجی لہجہ کسی کام نہیں آنا تھا کیونکہ سامنے کھڑی اس عورت کے لئے خود سے کمتر لوگوں کا کینہ دل سے کبھی جاتا نہیں تھا اور وہ اکثر لوگوں کو خود سے کمتر ہی سمجھتی تھی۔

''تم جو بھی کہو دانش۔۔۔ ہے تو وہ ایک ملازم ہی۔ کسی ملازم کے لئے ایسے جذبات رکھنا کہ اس کے لئے سکول میں سب کے سامنے رویا جائے۔۔۔ او گاڈ۔'' جھرجھری لے کر اس نے سر جھٹکا۔

''انسان جانور بھی پالے نا تو اس کے چلے جانے سے دکھی ہوتا ہے۔ وہ تو پھر انسان ہیں۔''

''کہیں گیا تو نہیں ہے نا وہ۔۔ وہیں اسی گھر میں پڑا ہوا ہے۔ پھر کیوں اتنا حساس ہو رہا ہے ذکی اس کے لئے۔۔۔؟ اس سے پہلے اپنے گھر میں دین محمد کو، زہرہ کو، چاند بی بی کو میں نکال چکی ہوں۔۔۔ ملازم رکھے جاتے ہیں، نکالے جاتے ہیں۔۔۔ ان کو سر آنکھوں پہ بٹھا کر دل میں نہیں بسایا جاتا یہ بات تمہیں اور تمہارے بیٹے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جب کوئی ملازم کام کے قابل نہ رہے تو اسے شوکیس میں سجا کر اس کی سیوا نہیں کی جاتی۔''

اگر کچھ دیر پہلے بچوں کے لئے کچھ فکر ایک ماں کے دل میں آئی ہی تھی تو اب ایک متکبر عورت نے اسے پس منظر میں ڈال دیا تھا۔

''ملازم نہیں ہیں وہ رطابہ۔۔۔ فرد ہیں ہمارے گھرانے کے۔ دادا ابو نے انہیں رکھا تھا۔ تب سے کبھی بھی کسی کو انہیں نکالنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پاپا کو بھی نہیں۔۔۔''

''ہاں تو تب وہ کام کرنے کے لائق تھے۔ اب نہیں رہے۔''

''پرانے وفادار اگر بوڑھے ہو جائیں تو انہیں کباڑ سمجھ کر گھر سے باہر نہیں کر دیا جاتا کہ کوئی بھی کباڑیہ چاہے تو انہیں اٹھا کر لے جائے۔۔۔ بیچ دے یا کچرے میں پھینک دے۔ ان کی وفاداری کا اتنا پاس تو کیا جاتا ہے کہ وہ خدمت جو وہ ہماری کرتے رہے ہیں ساری عمر، اس کے برابر نہ سہی، اس سے کچھ کم ان کی ہم کریں جب وہ دنیا میں تنہا رہ گئے ہوں۔ کیا کسی کی ساری عمر کی خدمت اور وفاداری کا اتنا حق بھی نہیں بنتا۔'' وہ بحث جو وہ نہ کرنے کا عزم کر کے یہاں آیا تھا، پھر سے شروع تھی۔

"تم رکھتے ہو گے ایسے ہمدردانہ جذبات ملازموں کے لئے، مجھ سے ایسی امید نہ کرو۔" دانش نے اسے تاسف سے دیکھا۔ یہ ہمدردی نہیں، انسانیت تھی اور رطابہ دانش میں طبیب ہونے کے باوجود جس شے کا فقدان تھا وہ انسانیت ہی تھی۔ اسی لئے یہ ایک لاحاصل بحث تھی۔

"کم از کم اتنی امید تو رکھ سکتا ہوں کہ تم بچوں کے جذبات کا خیال رکھو گی۔" رطابہ خاموش رہی تھی۔ اس نے کوئی عہد وعدہ نہ کیا تھا۔

"چلیں۔۔؟" دانش اسے دیکھ کر رہ گیا۔ کاش وہ وقت کو پلٹا سکتا ہوتا تو اپنے لیے ایک ایسی عورت کا انتخاب کرتا جس کی اولین ترجیح اولاد ہوتی۔

دونوں کچھ فاصلے کے ساتھ واپسی کا سفر طے کرنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

زندگی پھر سے بے حد مصروف ہو چکی تھی۔ کالج شروع ہونے کے بعد وہ پہلے سے زیادہ محنت کر رہی تھی۔ اس بار وہ فرسٹ ایئر سے زیادہ نمبر لے گی یہ اس کا ہدف تھا۔ رزلٹ کے بعد سے کالج میں اس کا الگ ہی مقام بن چکا تھا۔ وہی لڑکیاں جو اکیڈمیز سے پڑھ کر، کورس ختم کر کے آتی تھیں اور کلاس میں بڑھ چڑھ کر سوال و جواب کرتی تھیں تا کہ اساتذہ کو متاثر کر سکیں، ان پہ رعب جما سکیں اب اس ایک لڑکی سے، جو کلاس میں گونگی ہوتی لیکن ایک ایک بات دھیان سے سن کر لکھتی جاتی، مرعوب ہو گئی تھیں۔۔۔ وہ لڑکی جو کسی ٹیوشن، اکیڈمی کے بغیر بھی سب پہ بازی لے گئی تھی، وہ اب سب سے زیادہ اساتذہ کی نظروں میں آ چکی تھی، آئینور فاطمہ گل تھی۔۔۔

"آئینور تم نے آگے کیا سوچا ہے کس میڈیکل کالج میں جاؤ گی۔۔۔؟"

اس دن کلاس میں مس سارہ آئی تھیں لیکن انہیں کسی کام سے جانا پڑا تھا۔ وہ جانے سے قبل کلاس کو کچھ سوالات حل کرنے کے لئے دے گئی تھیں۔ کچھ من چلی لڑکیاں ان کے نکلتے ہی کتابیں بند کر کے باہر نکل گئی تھیں اور کچھ جو پڑھنے کے لئے ہی آتی تھیں وہ سوالات حل کرتی رہی تھیں۔ کچھ ایسی بھی تھیں جو اٹھ کر مس سارہ کی جگہ کھڑی ہو کر بورڈ پہ سوال حل کرنے لگ گئی تھیں تا کہ دکھا سکیں کہ وہ کتنی قابل ہیں

۔آئینور اس سب سے بے نیاز خاموش بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی۔اس کی پچھلی نشستوں پہ وردہ کا گروپ بیٹھا تھا جن کی پڑھائی میں کم اور زندگی میں کیا کرنا ہے میں زیادہ دلچسپی تھی۔اس وقت بھی وہ اپنے مستقبل کی شاندار منصوبہ بندی کرنے میں مصروف تھیں۔

انہی میں سے ایک مزنہ تھی جس نے اپنے گروپ کی بحث میں اسے بھی مدعو کر لیا۔

''میڈیکل کالج۔۔۔؟'' آئینور نے کچھ حیران سا اسے اور اس کی ساتھیوں کو دیکھا۔

''کیوں میڈیکل میں نہیں جانا تم نے۔۔؟ کیا سادہ بی اے کرنے کے لئے اتنی جان مار رہی ہو یا پھر پیا دیس سدھارنے کے لئے۔۔؟'' ان کے گروپ کی نرمین نے مزاحیہ انداز میں کہا تو سب ہنس دیں۔

''جہاں اللہ کا حکم ہوا۔۔۔'' اس نے یہ کہہ کر دوبارہ توجہ اپنے کام پہ مرکوز کر دی۔اس کی اپنی کوشش ہمیشہ سے یہی تھی کہ اس کا داخلہ راولپنڈی میڈیکل میں ہی ہو کیونکہ وہ ہوسٹل کے اخراجات پورے کرنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔لیکن اس سوال نے اسے یہ سوچنے پہ مجبور کیا تھا کہ اگر ایسا نہ ہوا اور اس کا داخلہ کسی دوسرے شہر کے میڈیکل کالج میں ہو رہا ہوا تو وہ کیا کرے گی۔۔۔؟ کیا اس کے پاس کوئی پلان بی تھا۔۔۔؟ یک دم اس کے ذہن میں شمشاد کا سراپا لہرایا جو اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے پہ آمادہ تھا اور ساتھ ہی اس نے سر جھٹک دیا۔

''میری تو ایف اے کے بعد شادی ہے۔باقی تعلیم اپنے سسرال جا کر پوری کروں گی۔'' یہ کلاس کی وہ منگنی شدہ لڑکی تھی جسے سب حسرت سے دیکھتی تھیں۔

''جن لڑکیوں کی منگنیاں ہو جائیں پھر وہ جلد ہی شادی کر کے سسرال چلی جاتی ہیں اور ان میں سے کم ہی آگے پڑھ پاتی ہیں۔ بعد میں بچوں کی ذمہ داریاں، گھر کی ذمہ داریاں کہاں پڑھنے کی اجازت دیتی ہیں۔'' یہ کلاس کی زونیا تھی جسے سب زبیدہ آپا کہتے تھے کیونکہ اس کے پاس ہر وقت ہر مسئلے کو حل کرنے کے ٹوٹکے موجود ہوتے تھے جو وہ مفت میں سب کو دیتی پھرتی تھی۔

''بالکل ٹھیک کہا زبیدہ آپا نے۔۔۔''

"جی نہیں۔۔۔ میرا منگیتر خود ماسٹرز کر چکا ہے اور اب آگے ایم فل میں ایڈمیشن لے چکا ہے۔ اس کا اپنا ارادہ پی ایچ ڈی کا ہے اور وہ مجھے بھی کہتا رہتا ہے کہ انسان کو ڈھیر پڑھنا چاہئے۔ اس لئے میں تو ایسی کوئی امید نہیں رکھتی کہ پڑھائی سے میری جان کبھی بھی چھوٹ سکتی ہے کیونکہ وہ جیسے ہی کوئی ڈگری مکمل کرتا ہے کوئی نئی ڈگری شروع کر دیتا ہے اور ڈگری نہ کرے تو کوئی کورس شروع کر دیتا ہے۔ وہ مجھے بھی ایسے ہی چلائے گا۔"

"شوہر زیادہ پڑھا لکھا ہو تو کم پڑھی لکھی بیوی کو بھی ساتھ چلا لیتا ہے لیکن اگر کم پڑھا لکھا ہو تو پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ چلنا مشکل ہوتا ہے۔" تیزی سے کام کرتی آئینور کا ہاتھ وہیں تھما تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ان سب کی طرف دیکھا۔ کوئی اسے نہیں دیکھ رہا تھا لیکن اسے لگا کہ سب اسے ہی دیکھ کر یہ بات کہہ رہے ہیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے زبیدہ آپا۔۔۔ کم پڑھا لکھا شوہر بیوی کے لئے بہت مسائل پیدا کرتا ہے۔ میرے اپنے بھائی جان نے میٹرک کر کے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور میری بھابھی ایم بی اے ہے۔ بچپن سے رشتہ طے تھا اسی لئے خالہ منع نہیں کر سکیں لیکن بھائی اور بھائی میں تعلیم کا یہ فرق ہر جگہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ بھلے میرا بھائی ہے لیکن بھابھی کے سامنے اس کی شخصیت یک دم دب جاتی ہے۔ انہیں احساس ہے اسی بات کا اسی لئے شاید کبھی ان دونوں کی زندگی ویسی نہیں ہو سکی جیسے عام جوڑوں کی ہوتی ہے۔"

آئینور بت بنی انہیں دیکھ رہی تھی۔ اب کام جاری رکھنا اس کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔

شمشاد اور آئینور۔۔۔ آئینور اور شمشاد۔۔۔

وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور شمشاد خود ایف اے پاس تھا۔ اس سوچ نے اسے مزید کام کرنے ہی نہیں دیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے ڈاکٹر بننے سے ان دونوں کا تعلیمی فرق تو بہت زیادہ ہو جائے گا۔ وہ سوچ سکتی بھی کیسے تھی، ڈاکٹر بننا اس کی اولین خواہش تھی، شمشاد تو بعد میں اس کی زندگی میں آیا تھا اور وہ بھی بنا اس کی خواہش کے۔۔۔ ابا نے بھی رشتہ طے کرتے ہوئے صرف خاندان دیکھا تھا۔ لوگ اچھے تھے، لڑکا شریف تھا، ان کا خاندان معاشی لحاظ سے مضبوط تھا، چلتا ہوا

خاندانی کاروبار تھا لیکن جو چیز ابا نظر انداز کر گئے وہ لڑکے کی تعلیم تھی۔ ابا نے اس معاملے میں کوئی حساب کتاب نہیں کیا تھا۔

اس دن اس کی ہونے والی ساس کی گفتگو پھر سے یاد آ گئی کہ شمشاد کو ہی ڈاکٹر بیوی کا شوق تھا اور وہ پھر سے الجھ گئی تھی۔

نئے وسوسے نے اسے رات تک بے چین رکھا تھا۔

اگلے دن کالج میں ہی غائب دماغی سے گزارنے کے بعد اس نے بہت سوچا کہ اسے اس معاملے پہ کسی سے کھل کر بات کرنی چاہئے۔ لیکن کس سے۔۔۔؟ اس کی کوئی ایسی گہری سہیلی نہیں تھی جس سے وہ دل کی ہر بات کہہ سکتی۔ اک نیا اور اک ہوا کہ اگر کبھی وہ کسی الجھن پریشانی کا شکار ہو تو اس کے پاس تو ایسا کوئی انسان موجود ہی نہیں ہے جس کے سامنے وہ دل کا غبار نکال سکے۔۔۔ بہنیں، امی یا کوئی خاص سہیلی۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔۔ سب اس سے کیوں اتنے دور تھے۔۔۔ اس نے خود تو کسی کو بھی اپنے سے دور نہیں کیا تھا۔ یہ اس کا نصیب تھا کہ اس کے پاس قریبی رشتے کے نام پہ کوئی رشتہ نہ تھا۔ خونی رشتے تو تھے لیکن قربت سے محروم۔۔۔ اس رات پہلی بار آئینور فاطمہ گل کو احساس ہوا کہ وہ مالی اعتبار سے ہی نہیں، رشتوں کے اعتبار سے بھی کتنی غریب ہے۔ کوئی ایک انسان، فقط ایک انسان بھی نہیں تھا جس کے سامنے وہ اپنا دل کھول سکے، اس سے لگ کر رو سکے۔ اپنی تھکاوٹ کی، کمیوں اور محرومیوں کے قصے سنا سکے۔ کیا وہ ساری زندگی اکیلی ہی اپنے دکھ اور اذیتیں سہتی رہے گی یا کوئی کاندھا اسے بھی کبھی میسر آئے گا جس پہ سر ٹکا کر وہ سب کہہ ڈالے گی۔

میڈم شیریں۔۔۔ اگلے پل ہی اسے خیال آیا تھا۔ ہاں میڈم شیریں سے وہ سب نہ کہہ سکے لیکن ساری صورتحال بتا کر مشورہ تو لے سکتی ہے۔ وہ اسے مخلصی سے چند بول تسلی کے کہہ تو سکتی تھیں۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ اگلے دن میڈم شیریں کے پاس جائے گی۔

اگلے دن کالج سے آنے کے بعد دوپہر کو اس نے آرام نہیں کیا تھا۔ وہ اکیڈمی چلی گئی تھی۔ میڈم مصروف تھیں لیکن اس کے لئے وقت نکال لیا تھا۔ کچھ جھجکتے ہوئے اس نے انہیں اپنی الجھن سمجھا دی تھی

۔وہ خاموشی سے سب سنتی رہیں۔اس کے خاموش ہونے پہ انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"یہ محض ایک امکان ہی ہے نا فاطمہ کہ وہ ایسا ہو سکتا ہے۔امکانات کے بارے میں سوچ کر اپنا حال کیوں تباہ کر رہی ہو۔۔۔؟"

"لیکن امکان تو ہے نا۔۔۔کیا ایسے کتنے کپلز ہم نے نہیں دیکھے جن میں تعلیمی فرق کی وجہ سے نبھاہ نہیں ہو سکا۔۔۔؟" میڈم نے سر ہلایا۔

"بالکل دیکھے ہیں۔اور یہ سچ بھی ہے کہ کم پڑھا لکھا مرد اگر پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کر لے تو اکثر کم مائیگی کا شکار ہو جاتا ہے۔پھر بیوی اگر ڈاکٹر ہو تو اور بھی مشکل کیونکہ ایک ڈاکٹر بیوی کے مسائل کو عام گھرانوں میں سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔اس کا پیشہ کسی بھی وقت میں اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔کام کی نوعیت عام پیشوں سے زیادہ گھمبیر ہوتی ہے۔اسی لئے لوگ زیادہ تر ڈاکٹرز کے لئے ڈاکٹرز ہی ڈھونڈتے ہیں کیونکہ ایک ہی پیشے سے منسلک افراد ایک دوسرے کے مسائل کا بہتر ادراک کر سکتے ہیں۔" وہ خاموش رہی۔

"لیکن اس لڑکے نے کچھ سوچ سمجھ کر تم سے شادی کی بات کی ہوگی۔"

"بقول ان کی ماں کے انہیں ڈاکٹر بیوی چاہئے تھی۔۔۔" میڈم نے گہرا سانس لیا۔

"عموماً وہ مرد جو خود ڈاکٹر نہیں بن پاتے یا زیادہ نہیں پڑھ پاتے ان کی ایسی ہی خواہشات ہوتی ہیں۔لیکن پھر انہیں خاندانوں میں بہو کے پیشے پہ اعتراض بھی بہت ہوتے ہیں۔چونکہ خواہش تو پوری ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر مل گئی ہے، معاشرے میں واہ واہ ہو گئی ہے تو یہی کافی ہے۔بعد میں نوکری نہیں کر نے دی جاتی۔گھر بٹھا دیا جاتا ہے۔ملک و قوم کا پیشہ بھی ضائع اور لڑکی کی ذہانت کو کسی کھوہ کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے۔" معاشرے کے وہ حقائق بیان کر رہی تھیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں لیکن ہم ان پہ بات نہیں کرنا چاہتے۔

"میری بہن اور بہنوئی میں بھی شاید شروع سے اختلافات کی یہی وجہ رہی ہے کہ بہنوئی کم مائیگی کا شکار ہیں اور بہن ضرورت سے زیادہ احساس برتری کا۔۔۔" اس کے اپنے گھر میں ایک مثال موجود

تھی لیکن وہ کبھی غور نہیں کر پائی تھی۔ آج اسے یہی لگ رہا تھا کہ ان دونوں کے باہم تعلقات بھی اسی وجہ سے مسائل کا شکار ہیں۔

''بہتر ہے فاطمہ کہ تم اپنے والد صاحب سے کھل کر اس مسئلے پہ بات کرو۔'' میڈم نے مخلصانہ مشورہ دیا۔

''ابا سے میں کیسے اس موضوع پہ بات کر سکتی ہوں۔۔۔؟'' بیٹی ہو کر باپ سے ایسی بات کرنا اسے عجیب لگ رہا تھا۔

''کیوں نہیں کر سکتی۔ تمہارا رشتہ طے کرتے ہوئے کیا تم دونوں میں ایک لمبی بحث نہیں ہوئی تھی۔ تمہاری امی اتنی پڑھی لکھی نہیں ہیں کہ وہ ایسے معاملات پہ اولاد سے گفتگو کر سکیں لیکن ابو تو ہیں نا۔۔۔ پھر وہ پہلے بھی تمہیں بٹھا کر تم سے تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ تو اس بار یہ کام تم کر لو۔'' فاطمہ نے گہرا سانس لیا۔ میڈم ٹھیک کہہ رہی تھیں۔

''اگر پڑھائی جیسے اہم معاملے کو تم اتنی سنجیدگی سے لیتی ہو کہ اس پہ کوئی دوسری بات کرنے کو تم تیار نہیں ہو تو یہ بھی تمہاری ساری زندگی کی بات ہو رہی ہے۔ یہ کوئی ایک دو دن کی کہانی نہیں ہے کہ چلو دو دن گزر گئے تو کہانی ختم۔۔۔ اس لئے اس بات کو بھی تمہیں اتنا ہی سنجیدگی سے لینا ہوگا کہ اس پہ کسی دوسرے کے کہنے کے باوجود تم اپنے موقف سے نہیں ہٹو گی۔'' اس نے سر ہلایا۔

''میں آج ہی کروں گی۔'' میڈم کے ساتھ ایک کپ چائے پی کر وہ پختہ ارادہ کر کے ہی اٹھی تھی۔

وہ ہمت کر کے رات میں جب ابا صحن میں ٹہل رہے تھے، کے پاس چلی گئی۔

''ابا آپ سے ایک بات کرنا تھی۔'' کالج جا کر، رزلٹ میں اس قدر شاندار کامیابی حاصل کرنے کے بعد سے اس کے ابا سے تعلقات بہت اچھے ہو گئے تھے۔ امی بھلے اسے اب بھی اس طرح اہمیت نہ دیتی ہوں لیکن ابا کے لئے وہ بہت معتبر ہو گئی تھی۔

''بولو بیٹا۔۔۔ پڑھائی میں کوئی مسئلہ ہے یا پیسے چاہیں تو بتاؤ۔'' انہیں لگا تھا کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔

''نہیں ابا۔۔۔میں بس ایک مسئلے پہ سوچ سوچ کر تھک گئی ہوں تو سوچا آپ سے کہہ دوں۔''

''ایسی کیا بات ہے۔۔؟'' ابا جانتے تھے کہ وہ اہم نوعیت کی باتوں پہ ہی اس طرح ان کے پاس آتی تھی۔

''کیا مجھے اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں بات کرنے کی اجازت ہے۔ مطلب ایک بیٹی اپنی آنے والی زندگی کے امکانات جو اسے خوفزدہ کرر ہے ہیں، کے بارے میں اپنے باپ سے بات کر سکتی ہے۔۔؟'' اگر پہلے وہ کسی جھجھک کا شکار تھی تو اب نہیں تھی۔ جب ہم باقی موضوعات پہ اپنے حق میں بول سکتے ہیں تو اس موضوع پہ کیوں نہیں جہاں معاملہ ساری زندگی کا ہو۔

''کیوں نہیں۔۔۔؟ تم جانتی ہو کہ میں بالکل روایتی باپ نہیں ہوں۔'' ابا کی بات نے اسے مزید حوصلہ دیا تھا۔

''ابا یقیناً آپ نے بہت سوچ سمجھ کر میرے لئے فیصلہ لیا تھا۔ ہر پہلو سے سوچا تھا اور تبھی شمشاد کے لئے ہاں کی تھی لیکن ایک ایسا پہلو تھا جس پہ شاید آپ سوچنا بھول گئے اور جواب مجھے پریشان کرر ہا ہے۔'' ابا نے الجھ کر اسے دیکھا۔ پھر سامنے صحن کی چار پائی کی طرف اشارہ کیا کہ چلو وہاں بیٹھتے ہیں۔ دونوں چار پائی کے ایک ایک کونے پہ ٹک گئے۔

''ابا میں ڈاکٹر بن جاؤں گی تو شمشاد اور میرے درمیان تعلیم کا ایک واضح فرق آجائے گا۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ تعلیم کا یہ فرق ذہنی مطابقت میں حائل ہو جاتا ہے۔۔۔؟'' ابا اس کی بات پہ چونکے تھے۔ وہ سچ کہہ رہی تھی انہوں نے واقعی اب تک اس پہلو پہ نہیں سوچا تھا۔ شاید اس لیے کہ رطابہ کے لئے ایک بڑے اور پڑھے لکھے گھر سے رشتہ آیا تھا اور اس بارے میں سوچنے کی کوئی نوبت آئی ہی نہیں تھی۔ رامین کی بھی ایک پڑھے لکھے معزز گھرانے میں شادی ہوگئی تھی اور فاطمہ کے لئے بھی جب بیٹھے بٹھائے شمشاد کا رشتہ آیا تو انہوں نے بس خاندان اور لڑکے کا کام دیکھا اور یہ سوچنا بھول گئے کہ ان کی بیٹی مستقبل کی ڈاکٹر ہے۔ ایک ایف پاس لڑکے سے وہ اس کی شادی کرنے جارہے ہیں تو کیا ذہنی ہم آہنگی ہو پائے گی۔۔۔؟ وہ واقعی اس پہلو سے سوچنا بھول گئے تھے۔ اور اب جب ان کی بیٹی ان سے

سوال کر رہی تھی تو اس کی تسلی کے لئے وہ اسے کیا تو جیہہ پیش کرتے۔

''میں ڈاکٹر بن گئی اور وہ سادہ سا ایف اے پاس رہ گیا تو آپ کو نہیں لگتا کہ وہ کم مائیگی کا شکار ہو جائے گا اور میں برتری کا۔۔۔ یہ تعلیمی فرق ہمارے درمیان ایک دیوار کی طرح آ کھڑا ہو گا جسے ہم چاہ کر بھی مٹا نہیں پائیں گے۔'' ابا نے گہرا سانس لیا۔

''ہو سکتا ہے۔۔۔'' فاطمہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''کیا ایسا ہوتا نہیں آیا۔۔۔؟''

''تم خود کو برتر مت سمجھنا تو ایسا نہیں ہو گا۔'' ابا کے پاس اس مسئلے کا کیا خوب حل تھا۔

''میں خود کو برتر نہ بھی سمجھوں ابا تو اس بات کی کیا گارنٹی کہ میرا شوہر خود کو کم تر نہیں سمجھے گا۔'' اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''مرد کو اللہ نے عورت پہ قوام بنایا ہے۔ وہ اس کا محافظ ہوتا ہے، اس میں یہ احساس پیدائشی ہوتا ہے کہ اس کا گھرانہ اس کی رعیت ہے جس کا اسے خیال رکھنا ہے۔ پھر وہی مرد اگر کسی بھی پہلو میں اپنے ہم سفر سے پیچھے رہ جائے، چاہے وہ کوئی بھی پہلو ہو، تو کم مائیگی کا شکار ہو جانا کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں ہے۔'' ابا نے اچنبھے سے فاطمہ کو دیکھا۔ اس وقت وہ پھر سے سوچ رہے تھے کہ ان کی تمام اولادوں میں سب سے معاملہ فہم اور زیرک نگاہ رکھنے والی ان کی یہی بیٹی تھی جو تھی تو سب سے چھوٹی لیکن اس نے زندگی کو، لوگوں کو جیسے دیکھا تھا وہ کسی بابے کی نگاہ تھی۔

''آپ کے سامنے باجی اور دانش بھائی کی مثال ہے۔'' ابا خاموش رہے۔

''کیا آپ کو نہیں لگتا کہ رطابہ باجی کے اندر اس قدر برتری کا احساس اسی ایک وجہ سے ہے کہ وہ ہمیشہ پوزیشن ہولڈر رہی، آپ لوگوں کی تعریف و توضیح نے اسے اتنا سر چڑھا دیا کہ وہ عام انسانوں میں جینا ہی بھول گئی۔ وہ خود کو اتنا خاص سمجھنے لگی کہ اس کے لئے اس کے کم پڑھے لکھے والدین بھی حقیر ہو گئے۔ اب وہ شوہر کی عام پڑھائی اور عام نوکری کو حد درجے معمولی سمجھتی ہے۔ وہ ان کا احساس برتری ہی ہے جو ان دونوں کو ساتھ خوش رہنے نہیں دیتا اور وہ کیوں ہے صرف اسی وجہ سے کہ وہ خود کو ایک کامیاب ڈاکٹر

سمجھتی ہے جس کے سامنے دانش بھائی ایک معمولی سی کمپنی میں مینیجر ہیں۔ اگر وہی دانش بھائی ایک بڑے سرجن، میڈیکل سپیشلسٹ ہوتے تو وہ ہنسی خوشی رہ رہی ہوتی لیکن اس کا یہی احساس کہ وہ ڈاکٹر ہے اور اب آگے ہارٹ سرجن بننے جارہی ہے اسے سکون سے اپنے گھر میں جینے نہیں دیتا۔"

"رطابہ کو خود سے مت جوڑو۔ تم دونوں میں بہت فرق ہے۔ رطابہ ہمیشہ سے اپنی ذات سے نکل کر کسی کی طرف دیکھ نہیں پائی۔ تم ایسی نہیں ہو فاطمہ۔" ابا کو یہ ماننے میں کوئی عار نہیں تھا کہ وہ میاں بیوی مل کر بھی رطابہ کی ٹھیک طرح سے تربیت نہیں کر پائے۔ ان سے بہت ساری غلطیاں ہوئی تھیں رطابہ کی پرورش میں۔ کچھ وہ خود بھی مزاجاً خود پسندی کا شکار تھی اور کچھ ماحول نے بنا دیا تھا۔ فاطمہ میں تو عجب طرز کی انکساری تھی۔ وہ ایسی نہیں ہو سکتی تھی۔

"چلیں مان لیا کہ میں ویسی نہیں ہوں لیکن شمشاد کے بارے میں تو نہ آپ کوئی گارنٹی دے سکتے ہیں اور نہ ہی میں۔۔۔"

"جو ہو چکا ہے فاطمہ اب اسے نہیں بدلا جا سکتا۔ اگر تمہارے پاس معاملے کا حل ہے تو بات کرو ورنہ اس موضوع کو چھوڑ دو۔"

فاطمہ نے بات کرنے سے پہلے ہی اس معاملے کے حل کے بارے میں سوچا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جو بات طے ہو چکی ہے وہ اب دونوں خاندانوں میں سے کوئی ختم نہیں ہونے دے گا۔ اب بات عزت بے عزتی کی تھی جو ہمارے معاشرے میں ایسی ہی باتوں سے منسوب سمجھی جاتی ہے۔

"حل ہے میرے پاس لیکن اس کے لئے آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔" ابا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"شمشاد سے کہیں کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرے۔" ابا چونکے۔

"مزید تعلیم۔۔۔؟"

"کیوں وہ مزید نہیں پڑھ سکتا کیا۔۔۔؟ اس دور میں ایف پاس ہونا کیا پہاڑ سر کرنا ہے۔"

"لیکن یہ تو اس کی مرضی ہے کہ وہ مزید پڑھنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ پڑھائی میں اتنی دلچسپی

رکھتا ہوتا تو پہلے سے ہی نا پڑھ لیتا۔ یوں بیچ میں چھوڑنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ پڑھنا نہیں چاہتا۔"

"پڑھنا نہیں چاہتا لیکن بیوی پڑھی لکھی چاہتا ہے۔" اس نے دل میں کڑھ کر سوچا۔

"جب اس نے تعلیم چھوڑی ہو گی اس وقت وہ کم عمر نوجوان تھا جسے اپنے اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ اب وہ ایک میچور انسان بن چکا ہے۔ دنیا دیکھ چکا ہے۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ کو سمجھتا ہے۔ اب اگر اس سے یہ کہا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس بارے میں سنجیدگی سے سوچے کہ تعلیم یافتہ ہونا کتنا ضروری ہے۔ آخر بات کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔۔۔؟" ابا کچھ دیر خاموش، گہری سوچ میں ڈوب گئے پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے میں بات کروں گا۔" ابا کی بات پہ وہ مسکرا دی۔ ابا بھی مسکرا دیے۔

"تھینک یو ابا۔ آپ ہمیشہ میری بات سمجھتے ہیں۔"

"دیر سے ہی سہی، اب سمجھ جاتا ہوں۔" انہوں نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ دھرا۔

دو دن بعد ہی ابا نے شمشاد کو گھر بلوایا تھا۔ وہ ابا کے ساتھ ان کے کمرے میں ہی بیٹھا تھا جبکہ فاطمہ دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی۔ ابا ساری بات، بہت ہی عمدہ طریقے سے کہہ چکے تھے۔۔۔ اس طرح کہ اسے محسوس تک نہ ہو کہ اس کی کم تعلیم پہ بات کی جا رہی ہے۔ فاطمہ اندر ہی اندر ابا کی معاملہ فہمی کو داد دینے لگی۔ شمشاد کی طرف سے ایک گھمبیر خاموشی باہر کھڑی فاطمہ کو کھل رہی تھی۔ آخر وہ کچھ بول کیوں نہیں رہا تھا۔

"یہ سب آپ سے فاطمہ نے کہا ہے۔۔۔؟" اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

ابا کو ایک پل کو چپ لگ گئی۔ اس سوال کا کیا جواب مناسب ہوتا کہ بات نہ بگڑتی۔

"یہ میری اپنی سوچ ہے۔۔۔ کیا غلط ہے۔۔۔؟"

"اگر یہ آپ کی اپنی سوچ ہوتی تو اس وقت ہوتی جب آپ یہ رشتہ طے کر رہے تھے۔" ابا اس کی شکل دیکھ کر رہ گئے۔ اس نے وہاں جا کر چوٹ کی تھی کہ ابا کو چپ ہونا ہی پڑا۔

"ویسے بھی اس رشتے میں کوئی شرط اگر کسی نے رکھی ہے تو وہی ہے۔ نہ ہماری طرف سے کوئی

شرط رکھی گئی، نہ آپ لوگوں کی طرف سے۔"

"کیا آگے پڑھنا غلط ہے۔۔۔؟"

"کیا کم پڑھے لکھے ہونا جرم ہے۔۔۔؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا بیٹا۔"

"کوئی مدعا سات پردوں میں لپیٹ کر بھی پیش کیا جائے تو وہ رہتا وہی ہے اور مدعا یہی ہے کہ آپ کی بیٹی کے مقابلے میں، میں کم پڑھا ہوا ہوں۔" فاطمہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ابا نے تو اتنے طریقے سے بات کی تھی کہ سننے والے کو برا لگ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ وہی تھا جو اسے اس انداز سے لے رہا تھا۔ شاید اس کے اندر کم مائیگی کا احساس پہلے سے موجود ہوگا جواب سامنے آ رہا تھا۔

"کیا یہ بہتر ہوگا کہ فاطمہ یہ سب مجھ سے خود کہے۔۔۔؟" ابا متذبذب سے اسے دیکھنے لگے۔

"میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو یہیں رہیں ہمارے سامنے۔۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" ابا نے سر ہلایا۔ فاطمہ خود ہی اندر چلی آئی۔

وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیا لیکن اس مسکراہٹ میں ہلکی سی طنز کی آمیزش تھی گویا وہ جانتا تھا کہ وہ باہر کھڑی سب سن رہی ہے۔ ابا اسی وقت کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔ بہتر تھا کہ وہ دونوں آمنے سامنے ان کی غیر موجودگی میں بات کر لیں۔

"یہ شرط نہیں ہے صرف درخواست ہے۔"

"جس رشتے میں محبت چلنا چاہی تھی وہاں شروع سے درخواستیں اور شرائط ہی چل رہی ہیں۔ محبت کو تو دور سے سلام ہے۔۔۔" فاطمہ اس بات پہ نادم ہوئی۔ وہ اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"میں یہ سب کچھ ہمارے بہتر مستقبل کے لئے کہہ رہی ہوں۔۔ پلیز ٹرسٹ می۔۔۔ زندگی اس سب سے آسان ہو جائے گی۔"

"تو بہتر مستقبل کے لئے مجھے کتنا پڑھنا ہوگا۔ بی اے، ایم اے، ایم فل یا پی ایچ ڈی۔۔۔ کہاں جا کر آپ کو لگے گا کہ اب اس سے زندگی بہتر ہو گئی ہے۔۔۔؟"

فاطمہ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"زندگی ڈگریوں سے بہتر نہیں ہوتی۔ ڈگریوں کے بغیر بھی انسان معتبر ہو سکتا ہے۔ اتنا تو سمجھ لیا ہوتا۔ اگر میرے پاس ڈگری نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ایک بہتر انسان نہیں ہوں۔۔۔ بہت سارے ڈگری یافتہ سے کہیں زیادہ انسانیت موجود ہے مجھ میں۔" یہ بات وہ بخوبی جانتی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی اختلاف نہیں تھا لیکن جو وہ کہہ رہی تھی وہ بھی غلط تو نہیں تھا۔ انسانی نفسیات کو سامنے رکھ کر ہی وہ یہ بات کہہ رہی تھی۔ بس افسوس اس بات کا تھا کہ وہ اپنا نقطہ نظر اسے نہیں سمجھا سکتی تھی۔

"اگر ہمارے بہتر مستقبل کی اتنی فکر ہے تو پلیز مجھے ویسا ہی رہنے دیں جیسا میں ہوں۔ انسان جب کسی کو زندگی میں شامل کرتا ہے تو اس کی خامیاں خوبیاں اپناتا ہے۔ اگر مجھ میں کچھ خامیاں ہوں گی تو میں خود انہیں دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ براہِ مہربانی ان پہ انگلی اٹھا کر مجھے شرمسار مت کریں۔" وہ بالکل گم صم کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا اس سے غلط ہو گیا تھا۔ اس نے سامنے بیٹھے اس انسان کی انا کو دھکا لگا دیا تھا۔۔۔ اور کسی مرد کی انا کو دھکا لگنا بہت بڑی خطا ہے۔ مگر اس نے تو بس بہتری کے لئے ایک ادنیٰ سی کوشش کرنی چاہی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے پڑی چائے بسکٹ کو اس نے ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔

"اور ہاں، کبھی بہتر مستقبل کے لئے ایک درخواست نما شرط میں بھی رکھوں گا سامنے۔۔۔ پھر دیکھتے ہیں کہ ہمارا بہتر مستقبل آپ کو کتنا عزیز ہے۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔

فاطمہ کانپتے دل کے ساتھ اس آخری جملے پہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ ایک بار پہلے بھی وہ اسی قسم کا جملہ کہہ کر گیا تھا اور اب پھر۔۔۔ ڈھیروں وسوسے تھے جو اس رشتے سے بندھ گئے تھے۔

☆......☆......☆

سموئیل کا پارٹ ٹو پہلی بار میں ہی کلیئر ہو گیا تھا جو کہ سب کے لئے قابلِ فخر بات تھی کہ ان کے خاندان میں اب تک کسی نے بھی یہ امتحان پہلی بار میں پاس نہیں کیا تھا۔ اس نسبت سے گھر میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ منہا اور علی بھی چند دنوں میں باہر جا رہے تھے سو اچھا تھا کہ ایک بار سارے

خاندان سے ملاقات ہو جاتی۔

سموئیل کے پرانے دوست بھی مدعو تھے۔ سب اپنی فیملیز کے ساتھ آئے تھے جنھیں دیکھ کر ممی کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جو سموئیل سمجھ سکتا تھا۔ اس کے سارے دوست اب شادی شدہ اور بچوں والے تھے سوائے اس کے۔ ممی اسی بات پہ پریشان رہتی تھیں۔

تمام مہمانوں سے مل کر وہ اس میز پہ بیٹھ گیا جہاں اس کے دوست بیٹھے تھے۔ ان کی بیویاں اور بچے دوسرے میز پہ تھے تاکہ وہ دوست آپس میں کھل کر ہنسی مذاق کر سکیں۔ کافی وقت بعد یوں اکھٹے ہونا نصیب ہوا تھا۔

کالج کے یادگار دن یاد کیئے جا رہے تھے جب رہبر نے اچانک ذکر چھیڑا۔

"ریچل ملی تھی دو دن پہلے مجھے ہسپتال میں۔" سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ سموئیل کے تاثرات میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا تھا۔

"وہ تو باہر نہیں چلی گئی تھی اسپیشلائزیشن کے لئے۔۔۔؟"

"اسپیشلائزیشن تو نہیں کر سکی البتہ شادی کر چکی ہے۔۔۔ وہ بھی دی ڈاکٹر عمر صالح سے۔۔" وہ ایک مشہور ہسپتال کے مالک کا نام لے رہا تھا جو میڈیکل اسپیشلسٹ تھے۔ عمر میں تو ریچل سے خاصے بڑے تھے لیکن ایک دنیا جانتی تھی کہ اب تک انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔

"مجھ سے عباد کا پوچھ رہی تھی اور جب میں نے بتایا کہ اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تو اس کی آنکھوں میں جو رنگ تھا نا۔۔۔" سموئیل نے ناگواری سے رہبر کو دیکھا۔ اسے یوں ریچل کا موضوع گفتگو بنائے جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جیسے بھی مزاج اور کردار کی لڑکی تھی، کم از کم اتنا حق تو رکھتی تھی کہ اس طرح اس کا دوستوں میں بیٹھ کر مذاق نہ بنایا جاتا۔

"مجھ سے اس کا نمبر بھی لیا ہے کہ کال کرے گی۔" اور سموئیل ٹھٹکا تھا کیونکہ پچھلے دو دن سے اسے ایک نمبر سے کئی بار کال آئی تھی جو وہ کبھی مصروفیت کی بنا پہ اٹھا نہیں سکا اور کبھی انجان نمبر دیکھ کر۔۔۔ یقیناً وہ ریچل ہی ہونا تھی۔

"لیواٹ یار۔۔ چھوڑ دو اب اس کا پیچھا۔ جیسی بھی تھی ہمارا اس سے کیا لینا دینا۔" وہ کالج کے چند لوگوں کا بالکل ذکر سننا نہیں چاہتا تھا جن میں سے ایک ریچل تھی۔ کئی تلخ یادیں تھیں جو اس تذکرے سے تازہ ہو جاتی تھیں۔

"اس کا تو اب بھی تجھ سے لینا دینا لگ رہا ہے۔" رہبر نے اس کا شانہ تھپکا۔

ریچل کا اس سے کیا لینا دینا تھا یا وہ اس سے کیا بات کرنا تھی وہ جانتا تھا۔ کم و بیش وہی جو سمیرا نے کی تھی۔ اب اس بات کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ جو تباہی اس کی زندگی میں وہ لا چکی تھیں، پلٹائی نہیں جا سکتی تھی۔

"یہ بتا کہ تو آئینور کا کانٹیکٹ نمبر ڈھونڈ رہا تھا۔۔۔ ملا۔۔؟" اس نے سر نفی میں ہلایا۔

"ہاں وہ کسی سے بھی رابطے میں نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔" رہبر کی اس بات پہ رؤف نے اس کا ہاتھ تھپکا جو سچ جانتا تھا۔ لیکن وہ اپنے دوست کو اس سے زیادہ تسلی نہیں دے سکتا تھا۔ بہت اندر درد اٹھا تھا جس کا طب کی زبان میں کوئی نام نہیں تھا نہ ہی کوئی علاج تھا۔

آئینور فاطمہ گل بھری دنیا کے اس مجمعے میں کھو گئی تھی۔ نہ وہ کہیں فیس بک پہ موجود تھی نہ اس کا کسی دوست سے رابطہ رہا تھا۔ کسی کو اس کا فون نمبر یا گھر کا پتا تک نہیں معلوم تھا۔ وہ کہاں گئی کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس نے خود ہی اپنے آپ کو سب سے چھپا لیا تھا تو کوئی اسے ڈھونڈنے کا تردد کیوں کرتا۔۔۔ لیکن اسے اس لڑکی کو ڈھونڈنا تھا۔۔۔

دعوت اچھی رہی تھی اور دعوت کے بعد جب سب رات گئے اپنے کمرے میں چلے گئے تو ممی دودھ کا گلاس لئے اس کے پاس آئی تھیں۔

"اب تو پارٹ ٹو بھی کلیئر ہو گیا۔ اب کیا سوچا ہے۔۔۔؟" ممی اس کے بیڈ پہ بیٹھ گئی تھیں۔ اس نے ممی کی گود میں سر رکھ دیا۔ ممی نے چونک کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا کیونکہ ایک طویل عرصے بعد وہ یوں بچوں کی طرح ماں کی آغوش میں لیٹا تھا۔

"ممی! دعا کریں وہ مجھے مل جائے۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"کون۔۔۔؟" ممی چونکیں۔

"جسے میں نے اپنی حماقت میں کھو دیا۔" کئی سال پرانا منظر ایک پل کو ذہن میں کوندا تھا جسے اس نے جھٹک دیا۔

"کس کی بات کر رہے ہو ممی۔۔؟" ممی کا چلتا ہاتھ تھم گیا تھا۔ کیا ان کا بیٹا کسی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ کسی کا روگ لئے جی رہا تھا۔ وہ ماں ہو کر کبھی سمجھ کیوں نہیں سکیں پھر۔ وہ کب سے اس سے اتنی انجان ہو گئی تھیں۔

"آئینور۔۔۔" ممی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"تم نے اب تک مجھے بتایا کیوں نہیں۔۔۔؟"

"کیا بتاتا۔۔ بتانے کو کچھ تھا ہی نہیں سوائے میری حماقت کے۔ میں اتنا بڑا اندھا تھا کہ سامنے بچھا ہوا جال دیکھ ہی نہیں پایا۔ کاش کہ میں وہ سب نہ کرتا تو شاید میں اسے کب کا اپنا چکا ہوتا۔"

"تو اب وہ کہاں ہے۔۔۔؟" اس نے سر نفی میں ہلایا کہ وہ نہیں جانتا۔ وہ تو ایک موہوم سی امید پہ جی رہا تھا کہ شاید وہ اسے مل جائے اور شاید کہ اس کی شادی نہ ہوئی ہو حالانکہ جو وہ سوچ رہا تھا قریب قریب ناممکن تھا کیونکہ اسے سمیرا نے جو بتایا تھا اس سب کے بعد اتنے سال گزر جانے پہ ایسی امید رکھنا اس سے بھی بڑی حماقت تھی جو کئی سال پہلے وہ کر چکا تھا۔

"اس کا اسی وقت نکاح ہو گیا تھا ممی۔۔۔" بہت تکلیف میں اس نے یہ جملہ ادا کیا تھا۔

ممی ہکا بکا اس کی صورت تکنے لگیں۔

❁ ❁

ناول سپاس گزار کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 9

عابدہ گم صم سی بیٹے کو دیکھتی رہ گئیں۔ وہ اتنے عرصے سے ایک ایسی لڑکی کے لئے رشتوں سے منع کر رہا تھا جس کا کئی سال پہلے نکاح ہو چکا تھا اور وہ اس بات سے باخبر تھا۔ تو پھر وہ کس امید پہ اس لڑکی کا منتظر تھا۔۔۔؟

ان کا بیٹا یہ کیا جوگ لگا کر بیٹھا ہوا تھا جس سے وہ بے خبر تھیں جبکہ وہ ہمیشہ باپ کی نسبت ان سے قریب رہا تھا۔ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات بچپن سے ہی ان سے کہتا آیا تھا تو پھر اس لڑکی کا کبھی ذکر کیوں نہیں آیا۔

''نکاح ہو چکا تھا۔۔۔'' وہ زیر لب بڑبڑائیں۔

''اب تو وہ کسی کی بیوی ہو گی سمی۔۔۔ پھر تم کیا سوچ کر اس کا انتظار کر رہے ہو، کیا سوچ کر مجھے دعا کے لئے کہہ رہے ہو۔۔۔؟''

''انتظار اس لئے نہیں کر رہا ممی۔۔۔'' یہ جملہ کہتے اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ کوئی اس کی بے بسی پہ رو دیا تھا۔ ساتھ ہی کوئی اندر زور سے ہنسا بھی تھا۔ وہ کسے بے وقوف بنا رہا تھا۔۔۔ صرف خود کو۔۔۔ وہ تو اس امید پہ بھی اسے ڈھونڈ رہا تھا کہ شاید۔۔ ہاں شاید کہ ابھی وہ کسی کی نہ ہوئی ہو۔۔۔ شاید کہ۔۔۔

لیکن انتظار کی ایک اور وجہ بھی تھی۔

''میں اس لئے اسے ڈھونڈ رہا ہوں ممی کہ میں اس سے اپنے ماضی کی ایک غلطی کی معافی مانگ سکوں۔ وہ لڑکی وہ سب ڈیزرو نہیں کرتی تھی جو میں نے اس کے ساتھ کیا۔۔۔ اور شاید اب میں اس کی معافی ڈیزرو نہیں کرتا۔''

''کیسی غلطی۔۔۔؟'' ممی کی اس بات پہ اس کا رنگ فق ہوا تھا۔ وہ سارا منظر وہ کبھی دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ وقت اس کی نظروں کے سامنے ایسے آ کھڑا ہوا جیسے حال ہی ہو۔

☆......☆......☆

رطابہ نے بچوں کو شام میں وقت دینا شروع کیا تھا اور ایسا اس نے خود سے کیا تھا۔ دانش نے اس کے بعد رطابہ سے کچھ نہیں کہا تھا۔

جس ہسپتال میں وہ شام کو جایا کرتی تھی، وہاں او پی ڈی کے لئے جانا ترک کر دیا۔ ایڈمنسٹریشن کو بتا دیا کہ وہ محض آپریشن کے لئے آ سکے گی۔ وہ تمام آپریشن جن کی تاریخیں عرصے پہلے دی جا چکی تھیں، اسے ہی کرنا تھے لیکن مزید آپریشن کی تاریخیں نہ دی جائیں۔ وہ کچھ وقت مریض نہیں دیکھے گی، سرجری نہیں کرے گی۔ اس وقت وہ ایک جانی مانی سرجن تھی جس کا نام ہی شفا سے منتھی سمجھا جاتا تھا اور یہ زعم کہ اس کی گئی اب تک کی ایک سرجری بھی ناکام نہیں ہوئی تھی، اس کی گردن میں سریا پیدا کر چکا تھا۔

بچوں کو پڑھانا اور ان کو ساتھ لگا کر شام کو کالونی میں واک کرتے ان سے بات چیت کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ذکی بہت خاموش ہو چکا ہے۔۔۔ وہ بس اس سے وہی بات کرتا تھا جو وہ پوچھتی تھی جبکہ اخبا اس کے ساتھ بہت چہک رہی ہوتی تھی۔ اس سے اپنے سکول کی بہت ساری وہ باتیں شیئر کر رہی ہوتی جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ رطابہ کو سچ میں نہیں پتا تھا کہ اس کی بیٹی سکول میں اتنی ذہین طالبہ ہے کہ تمام اساتذہ اسے اس طرح سراہتے ہیں کیونکہ سچ یہی تھا کہ وہ ان کی پی ٹی ایم پہ بھی نہیں جاتی تھی۔۔۔ یہ کام دانش کرتا تھا۔

وہ بار بار رطابہ کا ہاتھ تھام کر چومتی جیسے اس سے اپنی محبت کا اظہار کرنا چاہتی ہو، اسے بتانا چاہتی ہو کہ اس کا ساتھ اسے کتنا پیارا ہے۔ کبھی کبھار فرطِ جذبات میں مدھم سا بول بھی دیتی۔۔ ''ماما آئی لو یو''۔۔۔

یہ سب ذکی بھی دیکھ رہا ہوتا لیکن وہ نجانے کیوں بار بار اس منظر سے نظریں چرا لیتا۔ وہ کبھی اس سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ بس چپ چاپ ایک روبوٹ کی طرح اس کے احکامات سنتا اور مان

لیتا۔ رطابہ کو احساس ہو رہا تھا کہ اس کی سکول کی سائیکالوجسٹ نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ شدید منٹل سٹریس میں تھا جو جلد ہی شدید ڈپریشن میں تبدیل ہونے والا تھا۔

''زکی۔۔۔ کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھو۔'' اخبا کے کہنے پہ اس دن وہ انہیں واک کے دوران پارک لے آئی تھی۔ اخبا بھاگ کر جھولوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اس نے قریبی بنچ پہ بیٹھتے ہوئے اذکار کو جھولوں کی طرف جانے سے روک دیا۔ وہ کچھ جھجک کر بنچ کے دوسرے کونے پہ ٹک گیا۔ دونوں کے مابین تین قدموں کا فاصلہ تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ فاصلہ ان کے دلوں کے مابین تھا۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ وہ ماں بیٹا ہیں۔۔۔ کیا بیٹے ماؤں سے اس عمر میں اتنے دور ہو سکتے ہیں۔۔۔؟

''تم مجھ سے بولتے کیوں نہیں ہو ذکی۔۔۔؟''

''بولتا تو ہوں۔'' وہ سر جھکائے کہہ رہا تھا۔ رطابہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کا جواب میکانکی تھا۔۔۔ جذبات سے عاری۔

''خود سے نہیں بولتے جیسے اخبا بولتی ہے۔ نہ کچھ شیئر کرتے ہو۔'' وہ چپ رہا اور اپنے جاگرز سے زمین کریدتا رہا۔ اس کے اضطراب کو وہ بغور دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر جیسے کہنے کو ایک جہاں تھا لیکن نکلنے کا رستہ نہیں تھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اخبا کی طرح مجھ سے باتیں کیا کرو۔'' اس نے ماں کو دیکھا اور ان نظروں میں ایسا کچھ تھا کہ رطابہ کی زبان کو چپ لگ گئی۔ گو کہ وہ نظریں پھیر چکا تھا لیکن رطابہ سے مزید بولا نہیں گیا۔ اس کی نظروں نے اسے جتا دیا تھا کہ وہ اس سے قلبی طور پہ اتنا دور ہو گیا ہے کہ اب شاید ہی وہ کبھی اپنے رشتے کو ٹھیک کر سکے۔ اور جب ان کا رشتہ وہ رہا ہی نہیں تھا جو ہونا چاہئے تھا تو وہ کیسے اخبا کی طرح اس سے کچھ بھی کہتا۔

''ذکی۔۔۔ میں چاہتی ہوں ہم دوستی کر لیں۔ جو ہوا اسے بھول جائیں۔'' اذکار نے کچھ حیرت سے ماں کو دیکھا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ ماں اس کو دوستی کرنے کی پیشکش کرے۔ اس سے پہلے تو ماں کے پاس اس کے لئے وقت ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ گزار سکے اور اب وہ دوستی کی بات

کر رہی تھی۔

"کیا ہم دوست نہیں بن سکتے۔۔۔؟" رطابہ نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ خاموش رہا۔ اس کا چہرہ ایسا لال پڑ رہا تھا جیسے وہ رو دے گا۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم اخبا کی طرح مجھ سے دوستی کرلو۔" وہ چپ تھا اور ہاتھوں کو آپس میں رگڑ رہا تھا، تیز تیز پلکیں جھپک رہا تھا تاکہ اس کے آنسو نہ بہہ سکیں۔ وہ چھوٹا بچہ، اس کا اپنا بیٹا اس کے سامنے رونا نہیں چاہتا تھا۔

رطابہ نے اسے کچھ وقت دیا اور خاموش رہی۔

"کیا یہ ہو سکتا ہے ذکی۔۔۔؟" کافی دیر بعد اس نے پوچھا۔ اذکار نے سر اثبات میں ہلایا۔

"کیسے۔۔۔؟" اذکار خاموش رہا۔ بہت کچھ تھا کہنے کو کہ کیسے لیکن اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کہہ سکے۔ لیکن اسے کہنا تھا۔ اگر اس کی ماں اس کی طرف از خود قدم اٹھانا چاہتی تھی تو اسے اس رشتے کو ایک موقع دینا چاہئے تھا۔

"جیسے باقی بچوں کی ماما ہوتی ہیں۔" رطابہ نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

"جیسے وہ ان کے ساتھ ٹائم سپینڈ کرتی ہیں، کھیلتی ہیں۔" وہ سمجھا نہیں پا رہا تھا۔ بس اس نے ویڈیوز میں دیکھا تھا کہ مائیں ایسی ہوتی ہیں۔ دوستوں سے سنا تھا جن کی مائیں ایسی تھیں کہ وہ اپنی ماں کو اپنی ایک دنیا سمجھتے تھے۔ وہ دنیا جو باقی جہاں سے الگ ہی معنی رکھتی تھی۔

"جیسے وہ انہیں سمجھتی ہیں۔" شاید مسئلہ یہی تھا کہ وہ اپنی اولاد کو سمجھتی نہیں تھی کیونکہ اس نے انہیں ہمیشہ خود سے ایک فاصلے پہ رکھا تھا۔ اس کے بچوں سے زیادہ اس کی مصروفیات اہم تھیں۔

"جیسی فاطمہ خالہ ہیں میرے ساتھ۔۔۔ ویسے۔" رطابہ کے تاثرات بدلے۔ وہ اس کی بہن کو اس سے بہتر کہہ رہا تھا اور یہ چاہتا کہ وہ اس جیسی بن جائے۔ اندر بہت زور کا دھکا لگا تھا۔ وہ فاطمہ جو اسے ہر معاملے میں ہمیشہ خود سے بہت پیچھے لگی تھی کیسے کسی بھی معاملے میں اس سے آگے کھڑی تھی۔ یہ ناقابل برداشت تھا۔

''آپ پاپا سے لڑامت کریں۔'' اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسی ایک بات پہ پریشان رہتا ہے۔ لیکن اسے سر ہلانا پڑا۔ اذکار کو مزید ہمت ملی۔ اسے لگا کہ ماں بدل گئی ہے اسی لئے اس کی ہر بات پہ سر ہلا رہی ہے۔ وہ سب کچھ کرنے پہ آمادہ ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی ہر بات، ہر خواہش کو ماننے پر آمادہ ہے۔ وہ اس سے وہ سب کہہ سکتا ہے جو وہ اندر چھپاتا ہے۔ اس کی ماں باقی ماؤں جیسی بن چکی ہے۔ جو کچھ بھی کہنے پہ اسے کچھ نہیں کہے گی۔

''اور۔۔۔''

''اور۔۔؟'' مزید بھی کوئی اور تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ زیور بابا سے معافی مانگ کر انہیں واپس رکھ لیں۔'' اس کے جبڑے بھینچے۔ مٹھیاں بھینچی۔ ماتھے پہ شکنوں کا جال بنا۔۔۔ اس کے بیٹے کے نزدیک ساری دنیا اس کی ماں سے برتر تھی، بہتر تھی۔ اس کی ماں کو سب کی طرح ہونے کی ضرورت تھی، سب کے سامنے جھکنے کی ضرورت تھی۔ بھلے وہ ماں تھی لیکن بطور رطابہ اسے یہ سب کرنا نہیں آتا تھا۔۔۔ اپنے سے کمتر لوگوں کے سامنے جھک جانا اس نے کبھی نہیں سیکھا تھا۔ اسی وقت رطابہ کا پلڑا بھاری ہو کر جھکا اور ماں کا پلڑا اہلکا پڑ گیا۔ ایک انا پرست عورت کا یہ سب کرنا ناممکن تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔۔۔ ماں بیٹے کے مذاکرات ناکام ہو گئے تھے کیونکہ وہ جو مطالبات رکھ رہا تھا وہ پورے کرنا رطابہ کے بس میں نہیں تھا سو محفل برخاست۔۔۔

وہ بنا کچھ کہے تیزی سے اخبا کی طرف چل دی۔ اس سے پہلے کہ وہ غصے سے پھٹ پڑتی اسے جگہ بدلنا تھی۔

اذکار نے ماں کو خود سے دور جاتے دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اس کی خوش فہمی کا بلبلا پھٹ گیا تھا۔ اسے غلط لگا تھا کہ ماں بدل چکی ہے۔ وہ جانتا تھا ماں اس کے لئے خود کو اتنا نیچے نہیں کر سکتی اور یہی ہوا تھا۔ وہ بنا کسی ہوں ہاں کے وہاں سے چلی گئی تھی۔

اخبا سے کچھ فاصلے پہ کھڑی رطابہ غصے کی تمازت سے لال پڑ رہی تھی۔ اس کا بیٹا اس سے دوستی

کی شرائط میں اس بوڑھے نوکر تک کو لے آیا تھا جو اسے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

"زیور کا اس گھر سے جانا ہی اچھا ہے۔" غصے کا رستہ ہمیشہ سب سے کمزور کی طرف کھلتا ہے اور اسی پہ نکلتا ہے۔

☆......☆......☆

"فاطمہ۔۔۔" ان کے فائنل پراف دو ہفتے بعد شروع تھے اور وہ چاروں ہمیشہ کچھ موضوعات جو مشکل ہوتے، اکھٹے بیٹھ کر سمجھا کرتیں۔ اس وقت بھی جب وہ چاروں لان میں بیٹھی کمبائنڈ اسٹڈی کر رہی تھیں تو کتابوں پہ جھکی آئینور کو جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو شمشاد کھڑا تھا۔ آئینور کا رنگ فق ہوا۔ وہ یہاں کیا کر رہا تھا۔ اتنے بڑے کالج میں اس نے کیسے اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔

"آپ۔۔۔؟" وہ ششدر سی زیرلب بڑبڑائی۔

باقی تینوں اس بندے کو کچھ دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔

"یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ تمہیں پک کر لوں۔ گھر ہی جا رہا تھا۔ تمہاری بھی چھٹی کا ہی وقت ہے۔"

اب تینوں آئینور کو دیکھنے لگیں کہ یہ کیا ماجرا تھا۔۔ وقت تو چھٹی کا تھا لیکن ابھی وہ فارغ نہیں ہوئی تھی۔

"چلیں۔۔۔ میں فری ہوں۔" حالانکہ وہ تینوں جانتی تھیں کہ ابھی انہیں مزید پڑھنا تھا لیکن آئینور نے عجلت میں جلدی جلدی کتابیں سمیٹ کر بیگ میں ڈالیں جیسے وہ وہاں سے غائب ہو جانا چاہتی ہو۔

"لیکن ابھی تو ہمارا کافی سارا رہتا ہے آئینور۔" سمیرا نے جلدی سے ٹوکا۔

"تم لوگ آپس میں ڈسکس کر لو۔ میں خود پڑھ لوں گی۔" یہ سچ بھی تھا کہ وہ خود پڑھ لیتی تھی۔ یہ وہ تینوں تھیں جو اس سے پڑھا کرتی تھیں۔

سمیرا نے کچھ طنزیہ مسکرا کر ان دونوں کو دیکھا جو ہونقوں کی طرح آئینور کو دیکھ رہی تھیں۔ اسے

ایسی جلدی کیا پڑ گئی تھی جانے کی اور وہ اتنا گھبرائی ہوئی کیوں تھی۔

''ان کا تعارف نہیں کرواؤ گی۔۔۔؟''سمیرا چپ نہیں بیٹھ سکتی تھی یہ طے تھا۔

''یہ۔۔۔'' آئینور کی زبان ہکلائی۔

''میرے کزن ہی سمجھو۔'' باقی دونوں نے تو شاید یقین کر لیا لیکن سمیرا طنزاً مسکراتی رہی۔ وہ اسے ہرگز کزن نہیں سمجھ سکتی تھی۔

کچھ فاصلے پہ کھڑے شمشاد نے آئینور کا وہ جملہ سن لیا تھا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑا تھا۔ شاید وہ امید کر رہا تھا کہ وہ اس کا تعارف اپنی سہیلیوں سے کروائے گی لیکن 'کزن ہی سمجھو' سن کر اس کا دل کٹا تھا۔ وہ اسے اس قابل نہیں سمجھتی تھی کہ اس کو متعارف کروا سکے۔ کیا اب تک وہ اس سے نسبت پہ شرمندہ تھی۔ اس کا کم پڑھا لکھا ہونا اسے کھلتا تھا یا اس کی شخصیت ابھی بھی اسے دبوسی لگتی تھی۔ شاید یہ فرق تا عمر اسی طرح حائل رہنا تھا۔

آئینور اس کے ساتھ چل رہی تھی لیکن اس کا چہرہ برہمی کا غماز تھا۔ اسے شمشاد کا وہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔

وہ چپ چاپ جا کر اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ شمشاد بھی خاموش تھا۔

''آپ کو مجھے لینے نہیں آنا چاہیے تھا۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے سختی سے کہا تھا۔

''تمہارا خیال رکھنے کا حق ہے مجھے۔''

''حق کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ اس حق کو جگہ جگہ جتائیں۔ مجھے نہیں اچھا لگتا کہ آپ مجھے کالج سے لینے آتے ہیں۔ سب کیا سوچتے ہوں گے کہ یہ کیسی لڑکی ہے جسے کوئی لڑکا کالج سے پک کرنے آتا ہے۔'' سخت لہجے میں اس نے کہا تو شمشاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''صاف کیوں نہیں کہتی کہ تمہیں میں ہی اچھا نہیں لگتا۔''

آئینور نے گہری سانس لی۔

''آپ غلط بات کر رہے ہیں۔''

''ایسا ہی ہے۔۔۔ جب سے ہمارا رشتہ طے ہوا ہے تم اسی قسم کی پابندیاں لگاتی آ رہی ہو۔ تم نے کہا کہ میں یکسو ہو کر پڑھنا چاہتی ہوں اس لئے مجھ سے رابطہ نہ رکھو۔ میں نے مان لیا۔ کبھی مڑ کر تم سے رابطہ نہیں کیا۔ منگنی ہو کر بھی کبھی تم سے منگیتروں کی طرح برتاؤ نہیں کیا۔ نہ بات کی نہ ملنے کو کہا۔۔۔۔ تم نے کہا کہ میں دانی سے تمہاری کوئی بات تک نہ کیا کروں، میں نے وہ بھی مان لیا۔ اپنے لب سی لئے اور تمہارے ذکر سے بیگانہ ہو گیا۔۔۔ تم نے کہا کہ میں مزید آگے پڑھوں تا کہ تمہارے مقابلے میں کچھ تو تعلیم یافتہ ہو سکوں۔ مجھے برا لگا تھا، بہت برا لگا تھا لیکن تمہاری خوشی کے لئے میں نے یہ قدم بھی اٹھا لیا۔۔۔ اپنی کوئی خواہش نہ ہونے کے باوجود پرائیوٹ بی اے کر لیا۔ اب پرائیوٹ ایم اے کی تیاری بھی کر رہا ہوں تم جانتی ہو۔۔۔ لیکن کیا کبھی تم نے سوچا ہے کہ اس رشتے میں ہم کس طرح ساتھ چل رہے ہیں۔۔۔؟ تم ہمیشہ اپنی خواہشات کو ہی مجھ پہ مسلط کرتی آئی ہو۔ تم نے کبھی میرے جذبات کا خیال نہیں کیا۔ کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں بھی اس رشتے کو لے کر کوئی جذبات رکھتا ہوں، کیا کچھ سوچتا ہوں، کیا کچھ چاہتا ہوں۔ تم نے اپنی چلائی ہے ہمیشہ۔۔۔''

''اور آپ نے اپنی ایک چلائی نا۔۔۔ اور جب چلائی تو ایسی چلائی کہ میں اپنے رستے پہ چلنا بھول گئی۔'' اس نے دو بدو اس کی نظروں میں نظریں ڈال کر کہا۔

شمشاد نرم پڑا۔

''تم اب بھی اپنے رستے پہ ہو۔ میڈیکل کر رہی ہو۔ ڈاکٹر بن رہی ہو۔ میں نے تمہارے رستے کو گم تو نہیں کیا۔۔۔ اور اپنی چلانے کی جہاں تک بات ہے یہ میری نہیں ماما کی خواہش تھی۔''

''آپ کو کیا پتا آپ نے میرا کیا گم کر دیا ہے۔'' اس نے رخ پھیر کر سوچا تھا اور اس کی نگاہوں میں بہت کچھ گھوم گیا۔

''میں اگر تمہیں لینے آ جاتا ہوں تو کوئی تم پہ انگلی نہیں اٹھا سکتا کیونکہ میں وہ سب انگلیاں توڑ سکتا ہوں۔ تم سب کے منہ پہ ایک طمانچہ مار کر کہہ سکتی ہو کہ یہ غیر نہیں ہے۔ اس سے رشتہ ہے میرا وہ بھی اتنا مضبوط کہ جس کے سامنے کچھ ٹھہر نہیں سکتا۔''

آئینور نے کچھ نہیں کہا۔اس کی نظریں اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی پہ تھیں جہاں ایک نازک سی ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔اس نے خود سے ایک عہد کیا تھا اور اسے ہر حال میں نبھانا تھا۔ساتھ بیٹھا وہ شخص اس کی مخلصی پہ اعتبار کرتا تھا اور وہ کسی کا خود پہ کیا اعتبار نہیں توڑ سکتی تھی۔

شمشاد نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

آئینور کی نظروں کے سامنے وہ سب گھومنے لگا جو کچھ عرصے پہلے ہوا تھا۔

یہ تب کی بات ہے جب آئینور فاطمہ گل ابا سے ضد کر کے کالج کے ٹرپ پہ گئی تھی۔اس سے پہلے بھی کالج کے چار سالوں میں ٹرپ جاتے رہے تھے لیکن وہ اپنی ذات کی چادر سے واقف تھی جو اس کا تن ڈھانپتی تھی اسی لئے اس نے کبھی کہا ہی نہیں کہ اسے بھی کسی ٹرپ پہ جانا ہے۔ان چار سالوں میں اس نے سادہ زندگی گزار کر بس اپنی تعلیمی ضروریات کو پورا کیا تھا۔پہلے سال کے بعد سے ہی اس نے ہمیشہ سکالر شپ پہ پڑھا تھا کیونکہ وہ ہر سال یونیورسٹی میں ٹاپ کرتی تھی۔پہلے سال کی فیس اور کتابوں کے تمام اخراجات اس نے اپنی محنت سے جمع کی گئی رقم سے بآسانی پورے کر لئے تھے۔ابا کو کسی مشکل میں نہیں ڈالا تھا۔اگلے سالوں میں کچھ تو ٹیوشن کی فیس اور کچھ ابا کی دی گئی رقم سے وہ کتابوں، نوٹس اور سفر کے اخراجات نکال لیا کرتی۔فیس یوں بھی معاف ہو گئی تھی۔کسی قسم کی پارٹی، ٹرپ اور فیسٹول میں شمولیت پہ وہ یوں بھی معذرت کر لیا کرتی۔اپنا سادہ سا کھانا گھر سے لے جا کر ایک کونے میں بیٹھ کر کھا لیا کرتی۔کپڑے اس کے وہ تھے جو بڑی بہنوں کی اترن تھے۔ٹرانسپورٹ اس کی لوکل تھی جس کے لئے وہ کتنی دور پیدل چل کر جایا کرتی تھی تاکہ اپنے روٹ کی وین پکڑ سکے۔بس یہ آخری سال تھا اور اس کا یہ آخری ٹرپ۔۔۔جس پہ دوستوں کے بے حد اصرار پہ وہ دل کو سمجھا نہیں سکی کہ وہ انکار کر دیتا۔کیا اسے کوئی پل اپنے لئے جینے کا حق نہیں تھا۔ابا کو ٹرپ کے خرچے سے زیادہ اسے یوں چند دنوں کے لئے بھیجنے کا مسئلہ تھا۔۔۔وہ جتنے بھی بیٹی کے معاملے میں اعتبار کرتے، جتنے بھی آزاد خیال ہو جاتے سچ تو یہ تھا کہ دنیا ان کے اعتبار اور آزاد خیالی کی دھجیاں کسی وقت بھی اڑا سکتی تھی اور وہ دنیا سے بہت ڈرتے تھے اور پھر ہوا بھی یہی تھا۔

اس کے جانے سے پہلے ہی امی نے کافی ہنگامہ کیا تھا کہ وہ لڑکی ذات کو اتنی چھوٹ کیوں دے رہے ہیں۔ اس کے سسرال والوں کو پتا چلا تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ سسرال والوں کو کس نے بتانا تھا سوائے اُس پیٹ کے ہلکے کے جو کھانے پینے کی چیزوں کے سوا پیٹ میں کچھ رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے تو یوں بھی فاطمہ چھٹی دے چکی تھی۔ لیکن وہ پھر بھی بات تک پہنچ ہی جاتا تھا۔

''اگلے پورا ہفتہ چھٹی ہے دانی۔'' اس نے چھٹی کے وقت اسے کہا تھا۔

''کیوں آپ کہیں جا رہی ہیں۔۔۔؟'' فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ معصوم سا بچہ جو پیاری پیاری باتیں کیا کرتا تھا، دراز قد ہو چکا تھا، چہرے پہ ہلکا سا رواں آنے لگا تھا، آواز بھاری ہوتی کچھ عجیب سی ہو چلی تھی۔ وقت بہت گزر چکا تھا۔

''بس کچھ کام ہے کالج کا۔۔۔'' اس نے ٹالنے کے لئے کہہ دیا۔ وہ اکثر اپنے پیپروں میں اسے چھٹی دے دیا کرتی تھی یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ہمدان خاموش ہو گیا لیکن تجسس میں پڑ گیا۔

ابا نے امی کو تو خاموش کروا دیا۔ اس نے ہمدان سے بھی چھپا لیا لیکن اگلی صبح جب وہ کالج کے لئے نکل رہی تھی تو کالج بیگ کی بجائے ہاتھ میں ایک چھوٹا سفری بیگ تھا۔ اسے کالج پہنچنا تھا کہ بس وہیں سے تو چلنا تھی۔ وائے قسمت کہ گلی کے نکڑ پہ ہی ہمدان اپنے ابا سمیت ٹکرا گیا۔ وہ سکول جا رہا تھا اور اسے ابا ہی چھوڑتے تھے۔

اس نے ہونے والے جیٹھ کو سلام کیا۔ اتنا بڑا بیگ وہ اپنے ننھے منے سے وجود کے پیچھے کیسے چھپاتی۔

''آپ اکیلی کہیں کام سے جا رہی ہیں۔۔۔؟'' ہمدان کی زبان کے لئے پہلی بار اس نے سوچا تھا کہ کاش اسے چپ رہنا آتا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ جیٹھ نے بھی کھوجتی نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کی اڑتی رنگت کو دیکھ کر پوچھ ہی لیا۔

''اتنی صبح اکیلی کہاں جا رہی ہو بیٹا۔۔۔؟'' وہ اسے ہمیشہ بیٹا ہی کہتے تھے حالانکہ رشتے میں وہ ان کی ہونے والی دیورانی تھی۔ مگر جب جب وہ ان سے ملی وہ ہمیشہ ایک مشفق باپ جیسا برتاؤ کرتے۔

''وہ۔۔'' اس نے تھوک نگلا۔

''کالج ہی جا رہی ہوں۔'' وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

ہمدان کی زبان میں کھجلی ہوئی۔

''اتنا بڑا بیگ لے کر۔۔۔؟'' بیگ سفری تھا سو جھوٹ بولنا حماقت تھا۔

''ٹرپ جا رہا ہے کالج کا۔''

''واؤ۔۔۔ امیزنگ۔ کہاں جا رہا ہے۔۔؟'' ہمدان تو پرجوشی سے کھل اٹھا۔ اسے گھومنے پھرنے، کھانے پینے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ہمدان کو ذرا سا گھورا۔ اپنی استانی کی نظروں کو سمجھ کر وہ چپ ہو گیا۔ کاش وہ پہلے ہی اسے گھور دیتی تو وہ زبان بند رکھتا۔

جیٹھ جی بار بار بیگ کا حجم دیکھ رہے تھے۔ اتنے عقل مند تو تھے ہی کہ سمجھ سکتے کہ وہ ایک آدھ دن کے لئے نہیں جا رہی۔ کوئی ایک دن کے ٹرپ پہ یوں بیگ باندھ کر نہیں جاتا۔

ان کے تاثرات کچھ بدلے تھے کہ انہیں یوں لڑکی کا ٹرپ پہ جانا پسند نہیں آیا تھا۔ آتا بھی کیسے کہ جس خاندان کی لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی نہیں تھیں اس خاندان کی ہونے والی بہو اکیلی چند دن کے لئے لڑکوں کے ساتھ ٹرپ پہ جا رہی تھی۔

''خیر سے جاؤ۔ خیر سے لوٹو۔۔'' انہوں نے بدقت کہہ تو دیا لیکن فاطمہ جانتی تھی کہ آگے کیا ہونا ہے۔

کالج ٹرپ میں وہ سب بھول بھال کر بس اس ماحول میں گم ہو چکی تھی لیکن واپسی پہ گھر جاتے ہوئے ایک ایک قدم اٹھانا بھاری تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جاتے ہوئے وہ کس طوفان کا دہانہ کھول کر گئی تھی۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ واپسی پہ وہی طوفان تھم چکا ہوتا اور وہ اس سے بچ جاتی۔ اسے ہر صورت اس کا سامنا کرنا تھا جسے کچھ دن وہ موخر کر گئی تھی۔

ٹرپ سے واپسی پہ گھر کی دبیز خاموشی نے اس کا استقبال کیا تھا۔ امی کمرے سے نکلی ہی نہیں تھیں۔ بھائی شاید بھابھی کے ساتھ گھر پہ موجود نہیں تھا یوں بھی شادی کے بعد وہ کم ہی گھر پہ پایا جاتا تھا۔۔۔ البتہ ابا نے اس سے حال احوال دریافت کیا تھا لیکن ان کا لہجہ عجب شکستہ سا تھا۔ ان کی آنکھوں میں پہلے جیسی چمک نہیں تھی۔

"ٹرپ کا نہیں پوچھیں گے ابا کہ کہاں کہاں گئے۔۔۔؟" وہ ابا سے اپنے احساسات بانٹنے کے لئے پرجوش تھی۔ بیتے وقتوں میں ابا اس کے اچھے دوست بن گئے تھے۔ابا سے وہ کالج کی چھوٹی بڑی تمام باتیں کرلیا کرتی تھی۔ابا بہت دلچسپی سے اس کی ساری باتیں سنتے۔اس کی کامیابیوں پہ اسے داد دیتے۔اسے لگتا کہ ابا وہی ابا بن گئے ہیں جو ریٹائرمنٹ سے پہلے ہوا کرتے تھے۔اس کی کامیابیاں انہیں پھر سے جوان کرگئی ہیں اور ان میں جینے کی نئی امنگ پیدا کرگئی ہیں۔وہ ابا سے جتنی قریب ہوگئی تھی اتنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں رہی تھی۔

"ہاں بتاؤ۔۔۔؟" ابا کا انداز اسے چونکا رہا تھا۔جذبات سے مفقود لب ولہجہ۔۔۔

"میرے پیچھے کیا ہوا ہے ابا۔۔؟" یقیناً بہت کچھ ہوا تھا وہ اندازہ کرسکتی تھی۔

"تم آرام کرو۔لمبا رستہ طے کرکے آئی ہو۔تھک گئی ہوگی۔" وہ اپنے کمرے کی جانب پلٹ گئے۔

"ابا۔۔۔"

وہ ٹھہرے۔۔۔۔مڑکر اسے دیکھا۔اس وقت وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔وہ جانتے تھے کہ وہ پریشان ہوگی اور وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔

"میں خوش ہوں کہ تمہاری ایک خواہش پوری ہوئی۔تم تفریح کے نام پہ ایک علاقہ گھوم آئی۔دعا کرتا ہوں کہ تم مزید بھی زندگی میں باقی علاقے دیکھو۔۔۔پورا پاکستان گھومو۔" ان جملوں سے ابا کی سچائی عیاں تھی لیکن پھر بھی ایک دیوار تھی جو اس خوشی کے مابین حائل تھی۔

"مگر میں آپ کی بجھی آنکھیں دیکھ کر خوش نہیں ہوں۔۔۔میرے سسرال والوں کی طرف سے کچھ ہوا ہے یہ بات میں جانتی ہوں۔۔۔کیا ہوا ہے بس یہ نہیں جانتی۔۔۔" ابا نے اسے تعجب سے دیکھا تو اس نے ایک گہری سانس لی۔

"جب میں جارہی تھی تو ممتاز بھائی ملے تھے۔مجھ سے جھوٹ نہیں بولا گیا تو میں نے بتادیا کہ میں ٹرپ پہ جارہی ہوں۔"

ابا وہ سب دہرانا نہیں چاہتے تھے کہ ان کو بیٹی کو دی گئی آزادی پہ کیا کیا سننے کو ملا تھا۔

''ایسی ہوتی ہیں اچھے گھرانوں کی بچیاں جو اتنے دور اکیلے چل پڑتی ہیں وہ بھی لڑکوں کے ساتھ۔'' اس کی ساس اسی دن شام میں آ گئی تھیں اور اس کے گھر نہ ہونے کی تصدیق کر کے شروع ہو گئیں۔ شمشاد بھی ساتھ ہی آیا تھا۔ امی تو بس سر جھکائے کھڑی رہی تھیں کہ وہ تو اس حق میں تھی ہی نہیں کہ فاطمہ کالج ٹرپ پہ جائے لیکن ابا مناسب الفاظ میں بات سمجھانا چاہتے تھے۔

''سبھی بچیاں گئی ہیں۔ وہ اکیلی نہیں ہے۔ پھر کالجز میں تو یہ سب چلتا ہی ہے۔''

''کیا آپ جانتے ہیں ان بچیوں کو جن کے ساتھ وہ گئی ہے۔۔؟ ان لڑکوں کو جو ساتھ محافظ بن کر گئے ہیں۔۔۔؟ کیا آپ نہیں جانتے آئے دن یونیورسٹیوں کے کیسے کیسے کیس سامنے آتے ہیں۔ وہاں پڑھائی کے نام پہ کیا ہوتا ہے۔ کتنا گند بھرا ہوا ہے ان جگہوں پہ۔ بچیوں کی عصمت کیسے تار تار ہو جاتی ہے۔۔۔ پھر بھی آپ نے کئی دن کے لئے اسے بھیج دیا۔''

''پہلی اور آخری بار گئی ہے۔'' یہ سچ بھی تھا کہ بہت گھومنے پھرنے کے شوق کے باوجود وہ کبھی کسی سکول کالج کے ٹرپ پہ نہیں گئی تھی۔

''حادثات پہلی بار ہی ہوا کرتے ہیں اور اکثر آخری ثابت ہوتے ہیں۔'' ان کی بات پہ ابا تڑپ اٹھے۔ امی نے بھی شکوہ بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا جو ایسے سفاک جملے بول رہی تھیں۔ خدا نخواستہ کہ ان کی بچی کو کچھ ہوتا۔۔۔

''ایسی آزادی ہمارے خاندان میں کبھی کسی لڑکی کو نہیں ملی جیسی آپ نے اپنی بچی کو دے رکھی ہے۔ بیٹیوں کے والدین تو سکون سے سو تک نہیں سکتے اور آپ اسے اکیلے بھیج کر یہاں مزے سے بیٹھے چائے کا لطف اٹھا رہے ہیں۔'' سامنے تپائی پہ پڑی چائے کی پیالیوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا گیا۔

شمشماد خاموش رہا۔ ماں کی بات سے یقیناً وہ متفق ہی ہوگا تبھی انہیں خاموش نہیں کروا رہا تھا۔

''بہن دراصل۔۔۔''

انہوں نے ہاتھ ہوا میں دیوار کی مانند کھڑا کر کے انہیں بات کرنے سے روک دیا۔

''آپ نے جو کرنا تھا کر لیا، اب آپ میری بات سنیں۔۔۔'' اور اگلی بات جو انہوں نے کی تو ابا

بالکل گنگ رہ گئے۔

"لیکن بہن۔۔۔" ان کی بات کاٹ کر انہوں نے دوٹوک کہا۔

"بس۔۔۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔۔۔"

بات وہیں تمام ہوگئی۔۔۔ فیصلہ ہو گیا۔۔۔

ابا نے ایک سرد آہ بھر کر اسے دیکھا جو جاننا چاہتی تھی کہ ہوا کیا تھا۔ جو فیصلہ ہو چکا تھا، وہ زیادہ دیر چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔

"اس جمعے کو تمہارا اور شمشاد کا نکاح ہے۔" وہ ابا کی بات پہ بت بن گئی۔

"نکاح۔۔۔" الفاظ ادا ہو کر بھی بنا آواز ہی رہے۔

"ابا۔۔۔" اس کی آنکھیں بھر آگئیں۔ وہ بے یقینی سے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

"بیٹا جو کام کل ہونا ہے وہ اب ہو جائے تو اس میں کیا غلط ہے۔۔۔؟ کون سا رخصتی ہو رہی ہے۔"

"مگر ابا۔۔۔ یوں۔۔۔ ایک دم۔۔۔"

"ہم لڑکی والے ہیں فاطمہ۔ زیادہ بحث کرنا رشتے کو خراب کر سکتا ہے۔ اور سات سال کی اس منگنی کو میں اس موقع پہ جا کر خراب نہیں کرنا چاہتا۔" ابا سچ مچ بیٹی کے باپ لگ رہے تھے۔ بے بس اور مجبور۔۔۔ لڑکے والوں کے فیصلے سے نہ چاہ کر بھی متفق اور بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے۔

"میں شمشاد سے بات کروں گی۔ وہ میری بات سنے گا۔"

سامنے پڑا امی کا موبائل اس نے اٹھا لیا اور کمرے کی طرف چل دی اور ابا نے اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

موبائل میں اس انسان کا نمبر ہونے کے باوجود، جس سے اس کی منگنی کو سات ہو چکے تھے، اس نے کبھی رابطہ نہیں کیا تھا، اب وہ اسے پہلی مرتبہ خود سے کال ملا رہی تھی۔ دوسری طرف دوسری بیل پہ ہی فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"میں فاطمہ بات کر رہی ہوں۔۔۔" اس کے پاس ان دنوں موبائل نہیں تھا۔ امی کا نمبر ہی زیر

استعمال تھا۔

''سورج کو دیکھا تو نہیں تھا صبح نکلتے ہوئے لیکن نکلا تو مشرق سے ہی تھا۔''

''کچھ ضروری بات کرنا تھی۔''

''تو واپس آ چکی ہیں آپ۔۔۔؟'' وہ جانتا تھا کہ وہ واپس آ کر، نکاح کی خبر سننے کے بعد ہی اسے یہ کال ملا رہی تھی۔ اور وہ اس کی طرف سے کی جانے والی مزاحمت کے لئے تیار بھی تھا۔

''میں صرف آپ سے درخواست کرنا چاہتی ہوں شمشاد۔۔۔''

''ان سات سالوں میں یہ پہلی بار ہے جب آپ نے یہ کہا کہ میں درخواست کر رہی ہوں، شرط نہیں رکھ رہی۔۔۔ ان سات سالوں میں پہلی مرتبہ آپ نے مجھے میرے نام سے پکارا ہے۔۔۔ ان سات سالوں میں پہلی مرتبہ مجھے کال کی ہے۔ آج تو واقعی کوئی انوکھا ہی دن ہے میری زندگی کا۔ عجب طرح کی خوشی ہو رہی ہے۔'' اس کا لہجہ مخمور تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے کوئی رومانوی باتیں کرنے نہیں بیٹھی۔۔۔ پھر بھی وہ مسکرا رہا تھا۔

''پلیز اس نکاح کو فی الحال روک دیں۔'' اس کی بات پہ وہ سنجیدہ ہوا۔ مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''میرے بس میں نہیں ہے یہ۔۔۔ ہر بات میرے اختیار میں نہیں ہوتی فاطمہ ورنہ آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کی بات ٹالتا نہیں ہوں۔ آپ نے جب جب جو کہا تعمیل کی ہے لیکن یہ ماما کا فیصلہ ہے۔''

''آپ انہیں منا سکتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس رشتے کے لیے منایا تھا۔'' اس کی بات پہ وہ چونکا تھا۔

اس نے رشتے کے لئے کیسے منایا تھا یہ بات وہ کیسے جانتی تھی۔۔۔؟ خود فاطمہ کو کچھ عرصے پہلے ہی ہمدان نے بتایا تھا کہ چاچو نے دادی کو ان سے رشتے کے لیے بھوک ہڑتال کر کے منایا تھا۔۔۔ اور چاچو کے اس کبوتر کو خود یہ بات کچھ دن پہلے معلوم ہوئی تھی جب اس نے گھر کے کسی بڑے کے منہ سے برسبیل تذکرہ سن لیا تھا کہ شمشاد تو دو وقت کے کھانے کی بھوک ہڑتال پہ بیٹھ جائے تو اماں تو اس کی ہر بات مان جاتی ہیں۔۔۔ اب بڑوں کو کیا پتا تھا کہ اس گھر میں 'لمحہ بہ لمحہ خبر' دینے والا رپورٹر موجود ہے۔

''فاطمہ۔۔۔ایسا ممکن نہیں ہے۔'' اس کا دوٹوک لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا تو وہ کیوں اس بات سے اپنے بڑوں کو منع کرتا۔

''میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک مضبوط رشتے میں بندھ جائیں تاکہ پھر کوئی پابندی حائل نہ ہو۔'' فاطمہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کے پیر پڑ جائے کہ کسی طرح یہ نکاح موخر ہو جائے۔

''شمشاد پلیز۔۔۔''

''اتنا اچھا لگتا ہے تمہارے منہ سے میرا اولڈ فیشن نام۔۔۔'' وہ شرارت سے مسکرا دیا تو فاطمہ نے کال کاٹ دی۔

موبائل ایک طرف ڈال دیا۔ وہ نہیں مانے گا وہ جان گئی تھی کیونکہ وہ تو خود بھی یہی چاہتا تھا۔

''تو یہ وہ شرط تھی شمشاد جس کا تم نے ذکر کیا تھا کہ تم بھی کبھی نا کبھی اپنی شرط منواؤ گے۔۔۔'' بیتی باتوں کو یاد کرتے اس نے کرب سے سوچا۔ اور وہ جانتی نہیں تھی کہ یہ وہ شرط نہیں تھی جو شمشاد نے منوانا تھی۔۔۔

اور چند دن جو ایک سکون، ایک خوشی، ایک انجانا سا احساس وہ پہاڑوں کے دامن میں محسوس کر کے لوٹی تھی اب وہ بے پایاں درد میں بدل گیا تھا۔ اس رات وہ روتی رہی، سو نہیں سکی۔۔۔ اللہ کے آگے گڑگڑاتی رہی کہ کوئی معجزہ ہو جائے اور یہ نکاح رک جائے۔ اس سے اگلے دن وہ کالج نہیں گئی اور کمرے میں ہی بند رہی۔

امی کو زیادہ پرواہ نہیں تھی لیکن ابا کئی چکر کمرے کے لگا گئے تھے۔ اسے بہت طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ بس بت بنی رہی۔

''بیٹا جب کل بھی ایک کام ہونا تھا تو اس پہ کیوں اتنی پریشانی ہے۔۔؟'' اسے ابا سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

''تمہاری پڑھائی پہ کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تم کیوں فکرمند ہوتی ہو۔ اس نے تمہاری پڑھائی کے لئے ہمیشہ قربانی دی ہے۔ تمہاری تعلیم کے رستے میں کبھی نہیں آیا۔ تمہیں سپورٹ کیا ہے جتنا کر سکتا تھا

۔۔۔حتیٰ کہ۔۔۔'' ابا کی زبان یک دم خاموش ہوگئی۔

''حتیٰ کہ۔۔۔؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔ابا مشکل میں پھنس گئے تھے۔

''وہ ماہانہ تمہارے لئے مجھے تعلیم کے لئے رقم دیتا تھا تاکہ تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔'' ابا کی اس بات نے اس کے جسم سے جان نکال دی تھی۔

''ابا۔۔۔'' وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

''اف۔۔۔ابا۔۔۔'' اس نے اپنی سلگتی ہوئی کن پٹیوں کو مسلا۔

''میں نہیں لیتا تھا بیٹا۔وہ یونہی میز پہ چھوڑ جاتا تھا۔اسے بہت کہتے کہ ایسا مت کرے مگر۔۔ہونے والا داماد تھا، نامناسب طریقے سے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔۔۔کیا کرتے پھر۔۔؟ تمہاری امی رکھ لیتی تھیں کہ اپنی ہونے والی بیوی کو ہی تو دے رہا ہے۔''

''یہ آپ نے کیا کیا ابا۔۔۔؟'' اس کا دل کیا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔

''یہ کیا کر دیا آپ نے میرے ساتھ۔۔۔'' اس کی انا، خودداری جس کے لئے وہ کتنے سالوں سے جتی ہوئی تھی، دو کوڑی کی ہوگئی تھیں۔

''فاطمہ! وہ تمہارا ہونے والا شوہر ہے۔''

''مجھے اس کا احسان نہیں چاہیئے تھا آپ کو بتایا تھا میں نے۔پھر کیوں کیا ایسا۔۔۔؟ اف۔۔۔ کاش کہ مجھے پتا ہوتا تو میں مر جاتی مگر اس کی مالی مدد نہ لیتی۔'' وہ اٹھ کر کمرے میں ادھر سے ادھر بے چینی سے ٹہلنے لگی۔دل تو دیواروں سے ٹکریں مارنے کا تھا لیکن خود کو روک لیا۔

''اس نے منع کیا تھا کہ تمہیں نہ پتا چلے۔اسے تمہاری خودداری کی پرواہ تھی فاطمہ تو ہی اس نے ایسا کیا۔نہ ہوتی تو جتا نہ دیتا تمہیں۔۔۔لیکن اسے ہماری مجبوریوں کا بھی پتا تھا۔''

''میں دو تین ٹیوشنز مزید لے لیتی لیکن اس کی مدد نہ لیتی۔۔۔کاش کہ مجھے پتا ہوتا۔'' وہ رونے لگ گئی۔ہتھیلیوں سے ماتھا رگڑنے لگ گئی۔ابا نادم تھے۔انہیں اسے بتانا نہیں چاہیئے تھا لیکن اس لئے بتایا کہ شاید اس کی پریشانی کم ہو جائے اور وہ سمجھ سکے کہ جو شخص اس کی تعلیم کی اتنی پرواہ کرتا ہے وہ بھلا

اس کو ادھورا کیسے رہنے دے گا لیکن وہ مزید پریشان ہو گئی تھی۔

''اب میں کبھی اس کے سامنے سر اٹھا کر نہیں جی سکتی۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھے۔

''میاں بیوی میں کیا سر اٹھانا اور کیا جھکانا۔''

''عزتِ نفس میاں بیوی کی بھی ہوتی ہے۔''

''وہ تمہیں کبھی نہیں جتائے گا۔ وہ ایسا نہیں ہے کہ تمہاری عزتِ نفس کو پامال کرے۔''

''میں خود تو جانتی ہوں نا ابا۔ میں خود کیسے اس بات کو بھول کر جی سکتی ہوں۔''

''فاطمہ تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہی ہو۔'' اس نے ابا کو تاسف سے دیکھا اور تاسف سے سر ہلایا۔ وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ یہ بات کہ وہ اپنے بل بوتے پہ، اپنے دم پہ دنیا فتح کر رہی ہے کا زعم مٹی مٹی ہو گیا تھا۔

ابا اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اس کے دکھ میں مزید کئی ٹن کا اضافہ ہو گیا۔

شام کو مسز ممتاز ہمدان کے ساتھ آئی تھیں اس کے نکاح کا جوڑا اور دیگر چیزیں لے کر لیکن اس نے ملنے سے منع کر دیا۔ اس وقت وہ ہمدان کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے وضع وضع کے سوال کرے گا اور وہ کسی سوال جواب کا سامنا نہیں چاہتی تھی۔

امی نے نجانے انہیں کیسے ٹالا لیکن ان کے جانے کے بعد وہ چیزیں اس کے کمرے میں چھوڑ گئیں کہ وہ دیکھ لے۔ اس نے انہیں دور سے دیکھا لیکن چھوا تک نہیں۔۔۔ سات سال ایک شخص کے نام سے جڑی رہی لیکن کیوں کبھی اس شخص کے لئے اس نے دل میں وہ سب محسوس نہیں کیا جو اس رشتے کے حوالے سے اسے کرنا چاہئے تھا۔ سات سال کسی کا نام صبح شام ساتھ جڑا رہے تو محبت ہو ہی جاتی ہے، جانور سے بھی انسیت ہو جاتی ہے پھر اس انسان سے کیوں نہیں جو ہونے والا جیون ساتھی ہو۔۔۔ شاید انسیت ہو ہی گئی تھی لیکن اب جو سات دن میں ہوا تھا تو اس نے اس شخص کی انسیت کو دل سے زائل کر دیا تھا۔ محبت تو پہلے بھی نہیں تھی اور اب تو۔۔۔ تبھی اس پہ یہ عقدہ کھلا کہ اچانک نکاح کا دکھ نہیں تھا یہ، یہ تو ایک لاحاصل کا دکھ تھا جو اسے رلا رہا تھا۔ اس جذبے کی موت کا دکھ جو چوری سے دل

میں گھر کر گیا تھا لیکن بے فائدہ تھا۔

کاش کہ وہ ٹرپ پہ نہ گئی ہوتی۔۔۔ نہ یہ سب ہوتا اور نہ وہ سب ہوتا جس کا ادراک اب ہو رہا تھا۔

جمعے کا دن تھا اور جمعے کی نماز کے بعد نکاح تھا۔۔۔ گلی کے پارلر سے ہی بیوٹیشن امی نے بلوالی تھی۔

وہ اپنا جوڑا لے کر تبدیل کرنے اندر گئی۔

''لگتا ہے آپ نے زندگی میں بہت محنت کی ہے۔۔۔؟'' وہ آبشار پہ ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ اس کے ہاتھوں پہ نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ آئینور نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو کام کر کر کے پتھریلے اور سخت ہو چکے تھے۔ وہ کتنی ہی کریمیں اور ٹوٹکے استعمال کر چکی تھی لیکن یہ وہ محنت کی نشانیاں تھیں جو اللہ نے اس کے ہاتھوں پہ ثبت کر دی تھیں۔

''لڑکیوں کے ہاتھ تو بہت نرم و نازک ہوتے ہیں۔۔ ایسے ہاتھ تو کسی محنت کش کے ہی ہو سکتے ہیں۔'' اس کی حیرت پہ اس نے تجزیہ پیش کیا۔ وہ بالکل گم صم رہ گئی۔

''محنتی ہونا دنیا کی عظیم ترین خوبیوں میں سے ہے۔''

اور وہ پہلا شخص تھا جو بنا دیکھے، بنا بتائے اس کی محنت کو جان گیا تھا۔۔۔ کیسے۔۔؟ وہ کیسے اس کے بارے میں اتنی ٹھیک قیاس آرائی کر لیتا تھا۔ وہ کیسے سب سے خود کو چھپاتی اس لڑکی کو جان لیتا تھا۔ وہ کیسے پیاز کی پرت در پرت چھپی اس آئینور کی تمام پرتوں کو اتار لیتا تھا۔ وہ ساحر تھا، جادوگر تھا یا کوئی نجومی تھا۔

لباس بدلتے دل کی حالت بھی بدل گئی۔ دو آنسو ٹوٹ کر سفید فراک کی کڑھائی میں جذب ہو گئے۔

''بالکل نہیں۔ آپ ذمہ داری ہیں میری۔۔ آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

''ساتھ تو چھوٹ گیا عباد۔۔۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

دو آنسو اور تیزی سے بہہ نکلے جسے اس نے رگڑ کر صاف کیا۔ وہ اتنی کمزور نہیں تھی کہ کسی کے سامنے روتی۔ اسے اب تیار ہونے بیوٹیشن کے سامنے جانا تھا اور وہ ہرگز اپنے آنسو کسی کے سامنے نہیں بہا سکتی تھی۔

وہ متورم ناک کے ساتھ باہر آئی۔ اپنے کمرے کے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

بیوٹیشن نے اس کا میک اپ شروع کیا۔

''اگر آپ بد دماغ اور مغرور ہوتی نا آئینور تو اس ہوٹل والے چھوٹو کی عزت نفس کی اتنی پرواہ نہ کرتی کہ کاغذ میں لپیٹ کر اسے پیسے دیتیں۔ مغرور لوگ صرف اپنی پرواہ کرتے ہیں۔ دوسروں کے لئے کبھی اتنا نہیں سوچتے۔'' اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔

''آپ کی آنکھوں میں پانی آرہا ہے۔'' بیوٹیشن نے ہاتھ روک لیا۔

''چبھن ہورہی ہے۔۔۔'' چبھن تھی مگر دل کی جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔

''آپ کو میک اپ سے الرجی تو نہیں ہے۔۔۔؟''

''پتا نہیں۔ میں نے کبھی میک اپ نہیں کیا۔۔۔'' بیوٹیشن نے حیرت سے اسے دیکھا کہ وہ لڑکی اس زمین سے ہی تعلق رکھتی ہے۔۔۔؟ مگر یہی سچ تھا۔ اس نے کبھی میک اپ استعمال نہیں کیا تھا۔ اس نے زندگی کو بالکل سادہ بنا کر جیا تھا۔ سادہ لباس، سادہ خوراک، سادہ طرزِ زندگی۔۔۔

''آپ دوبارہ ٹرائی کریں۔'' اس نے خود کو ایک گہری سانس لے کر نارمل کرتے کہا۔

''آئینور فاطمہ گل! تم اپنی اوقات یاد رکھو کہ تم صرف دسویں پاس ایک معمولی لڑکی تھی جس کے آگے تمام رستے بند تھے۔ تمہارے سارے رستے اللہ نے کھولے اور تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ تم یہ سب کیا اپنا کمال سمجھتی ہو۔۔۔؟ یہ تمہارا کمال نہیں ہے۔ یہ سب خدا کی دین ہے۔ اس کی توفیق ہے۔ اسے کبھی اپنی کامیابی مت سمجھنا۔ اور وہ شخص جو تمہارا ہونے والا شوہر ہے وہ تمہارا محسن ہے جس نے تم پہ اتنا خرچ کیا کہ تم یہاں تک پہنچ سکو۔ اسے کبھی کمتر مت سمجھنا۔ تم آئینور فاطمہ گل ہو اور ابا کہتے ہیں تم رطابہ سے الگ ہو۔۔۔ تمہیں رطابہ نہیں بننا۔ شمشاد کو کبھی کمتر نہیں سمجھنا۔ کسی انسان کی قدر اس کی اوصاف اور اس کا دل ہوتا ہے، اس کی تعلیمی قابلیت نہیں۔ بھلے وہ کم پڑھا لکھا ہے اور تم ڈاکٹر مگر وہ ایک اچھا انسان ہے۔ اس اچھے انسان کے لئے دل میں کبھی کوئی حقیر خیال مت لانا۔'' انسان خود اپنا ناصح بنے تو سب سے بہترین طور پہ سمجھا سکتا ہے۔

''ہر بار لڑ کر تم تقدیر نہیں بدل سکتی آئینور۔۔۔ ہر بار جو چاہتی ہو وہ پا نہیں سکتی۔۔۔ ہر شے پہ

تمہارا نام نہیں لکھا جو تمہیں تمہارے چاہنے سے مل سکے۔ اس لئے یہ لڑائی بند کرو اور دل کو پر سکون ہو جانے دو۔ خود پہ مزید ظلم مت کرو۔ جو شخص تمہارا ہونے جا رہا ہے وہ کسی معاملے میں بھی برا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بھی برامت کرو۔"

اپنی سوچوں کے آگے ایک باڑھ لگا لی تھی۔ اب اس باڑھ کو کوئی نہیں پھلانگ سکتا تھا۔

سادہ سے میک اپ میں ہلکا پھلکا سا زیور پہنے وہ تیار تھی اور اتنی منفرد لگ رہی تھی کہ نظریں نہیں ٹھہر رہی تھیں۔

اس کی بہنیں نہیں آئی تھیں۔ رامین ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ کراچی میں تھی اور رطابہ کا کوئی امتحان تھا جس کی تیاری میں وہ بے حد مصروف تھی۔ اس نے ابا کو صاف سنا دی تھی کہ اتنے ہنگامی بنیادوں پہ نکاح رکھیں گے تو کوئی آ پائے گا کوئی نہیں۔۔۔ ابا نے اس سے بحث نہیں کی تھی۔ وہ یوں بھی فاطمہ سے شدید خار کھاتی تھی۔ جب سے اس کا میڈیکل میں ایڈمیشن ہوا تھا رطابہ کا مارے حسد کے برا حال تھا ابا جانتے تھے۔ اس لئے بہتر تھا کہ وہ نہ آئے۔ دانش اذکار کو لے کر آیا تھا۔ اذکار محبت سے خالہ کے ساتھ چپکا بیٹھا تھا۔ وہ کم کم ہی نانکے آیا کرتا تھا۔ اس کی ماں کا اپنے گھر کی آسائش چھوڑ کر مائکے آ کر رہنے کا دل جو نہیں کرتا تھا۔

"ہائے میرے چاچو کی دلہن اتنی حسین ہے۔" ہمدان سب سے پہلے اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ اسے بھلا کون روک سکتا تھا۔

فاطمہ اس کی بات پہ مدہم سا مسکرا دی۔

"کبھی سادہ سی لپ اسٹک بھی نہیں لگائی اور اب اچانک اتنا میک اپ۔۔۔ جنت کی حور لگ رہی ہیں قسم سے۔" وہ اس کی کرسی کے گرد گھوم گھوم کر طواف کر رہا تھا۔ خود شیروانی میں وہ کسی دولہا سے کم نہیں لگ رہا تھا۔

"چاچو ہیں بڑے لکی ویسے۔۔" فاطمہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

نکاح نامہ لئے ابا اور دانش ہی اس کے کمرے میں آئے تھے۔ تب اذکار اور ہمدان کو باہر بھیج دیا گیا۔

ابا کیا پوچھ رہے تھے، کیا کہا جا رہا تھا اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ حق مہر کے نام پہ کافی ساری رقم اور زیورات کی بات ہو رہی تھی جو سن کر بھی اسے سنائی نہیں دیا۔۔ وہ بس میکانیکی انداز میں سامنے پڑے کاغذات پہ دستخط کرنے لگی۔

ابا امی دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیکن وہ بت بنی بیٹھی رہی۔

کچھ کہانیاں ایسے شروع ہوتی ہیں کہ ان کے آغاز کی خبر تک نہیں ہوتی اور جب خبر ہوتی ہے تو کہانی تمام ہو چکی ہوتی ہے۔۔۔ آئینور فاطمہ گل اور سموئیل عباد کی کہانی بھی ایسی ہی کہانی تھی۔

نکاح کے بعد ایک ہجوم تھا جو اسے دیکھنے، سراہنے اندر آیا تھا۔ سب خواب سا تھا۔ حقیقت لگ ہی نہیں رہا تھا۔

''شمشاد تم سے ملنا چاہتا ہے فاطمہ۔'' مسز ممتاز اس کی انگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے کان میں کہہ رہی تھیں۔ اس نے دل کو ٹٹولا۔ نکاح کے بول کے بعد بھی دل خالی ہی تھا۔

سب لوگوں سے کمرہ خالی کروا لیا گیا کہ دلہا اپنی دلہن سے ملنا چاہتا ہے۔

وہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب وہ عین اس کے سر پہ پہنچ کر کھنکارا۔

''نکاح مبارک ہو۔'' اس نے سر کو ہولے سے جنبش دی۔

وہ مسکرا دیا۔

''یقین نہیں آ رہا کہ تم میری ہو چکی ہو ورنہ ان سات سالوں میں دل ڈرتا رہتا تھا کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔'' وہ چپ رہی۔ وہ عین اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ دونوں مدِ مقابل تھے۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا جبکہ اس نے نظر اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھا۔

''دانی ٹھیک کہہ رہا تھا۔۔۔ مس حور لگ رہی ہیں۔'' اس تعریف پہ اس کے گال لال پڑے۔

''میں زیادہ وعدے شعدے نہیں کرتا تم سے لیکن بس اتنا کہوں گا کہ ہمیشہ تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔'' وہ ہنوز چپ تھی۔ اس نے صوفے کا کشن اٹھا کر اس کے سامنے زمین پہ رکھا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔۔۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ فاطمہ نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا جسے تھام کر اس

نے ایک ہیرے کی نازک سی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔

''سج گئی ہے تمہارے ہاتھ میں جا کر۔۔۔'' اس کا ہاتھ تھامے ہی رکھا اور وہیں بیٹھ گیا۔ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''تم کچھ نہیں کہو گی۔۔۔؟'' اکیلے بولے چلے جانا اسے شاید عجیب لگا تھا۔

''میں کم بولتی ہوں۔'' یہ سچ بھی تھا۔

اس نے سر ہلایا۔

''جانتا ہوں۔ دانی بتاتا ہے مجھے۔۔۔ مجھے کم گو لڑکیاں پسند ہیں۔ لڑکیوں کو اتنا ہی باوقار ہونا چاہئے جتنا کہ تم ہو۔''

وہ اپنے دوپٹے پہ لگی گوٹے کناری کو کھرچنے لگی۔ بوکھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ یہ سب کتنا نیا اور جدا تھا اس کا احساس اب ہو رہا تھا۔

''ایک بات پوچھوں۔۔۔؟'' وہ چونکی۔ اس کی طرف دیکھا تو وہ بغور اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''نکاح پہ کیا اعتراض تھا تمہیں۔۔۔؟'' اس نے سر جھکا لیا۔ وہ کیا بتاتی کہ کیا اعتراض تھا۔ یہ بات تو خود اسے کل رات معلوم ہوئی تھی کہ اعتراض نکاح پہ نہیں کچھ اور تھا۔

''مطلب ہم سات سال سے منگیتر ہیں۔ اب اگر نکاح ہو رہا تھا تو تم کیوں چاہتی تھی کہ نہ ہو۔۔۔؟''

''میں سکون سے پڑھنا چاہتی تھی۔ آخری سال میں ایسا کچھ نہیں چاہتی جس سے میری پڑھائی متاثر ہو۔''

''میں تمہارے سکون میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔ اگر میں نے ایسا کرنا ہی ہوتا تو پہلے ہی کر چکا ہوتا۔'' وہ خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے کچھ نہیں جتا رہا لیکن وہ کیا کرتی کہ اس کا دل چور بن گیا تھا کہ وہ اس کی مالی مدد سے اپنے تعلیمی سفر پہ خرچ کرتی رہی ہے۔

''تم کچھ پوچھنا چاہتی ہو۔۔۔؟'' وہ چاہتا تھا کہ وہ بھی اس سے کوئی بات کرے۔ سات سال میں کیا کبھی کوئی بات اس کے دل میں نہیں آئی تھی جو وہ اس سے کہنا چاہتی ہو۔

''آپ نے مجھ سے شادی کا فیصلہ کیوں کیا۔۔۔؟'' ہاں یہ سوال تھا جو اسے چبھتا تھا۔ جب سے اس کی ہونے والی ساس نے یہ بات کی تھی کہ شمشاد کی خواہش تھی کہ اس کی بیوی پڑھی لکھی ہو، ڈاکٹر ہو۔۔کئی وسوسے سر اٹھاتے رہے تھے۔

''جانتی ہو جس دن تم سے شرٹ پہ لڑنے آیا تھا اور تم نے اتنی مضبوطی سے اپنی طرف کے دلائل دیے اور یہ بتایا کہ تم کیوں اتنی محنت کر رہی ہو صرف اور صرف اپنے مشن کو پانے کے لئے، اسی دن دل جھک گیا تھا تمہارے آگے۔ تمہاری مخلصی اور محنت نے مجھے متاثر کیا تھا۔'' اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جیسا اس کی ماں نے کہا تھا

''میں نے ہمدان کے لئے تمہاری محنت دیکھی تھی۔۔۔تم کتنا مخلص ہو کر اسے پڑھاتی تھی ہم سب جانتے تھے۔۔ٹیوشن ہر کوئی پڑھا لیتا ہے لیکن مخلص کوئی کوئی ہوتا ہے اپنے بچوں سے۔۔۔تبھی سوچ لیا تھا کہ مجھے بس تم ہی چاہیئے ہو۔ جو اپنے شاگرد سے اتنی مخلص ہے، وہ اپنے رشتوں میں کتنی مخلص ہو گی۔''۔ آئینور فاطمہ گل کے اندر کچھ چبھا تھا۔ کاش کہ وہ سچ میں اس سے مخلص ہو کر محبت کر پاتی ۔۔۔کاش کہ یہ سب اس کے بس میں ہوتا تو۔

''بس۔۔۔؟'' اس کے منہ سے پھسلا۔ کیا وہ اس کی مخلصی کی وجہ سے اس سے شادی کر رہا تھا۔

''تو اور کیا۔۔۔؟'' وہ ہنس دیا۔

''تمہیں کیا لگا تھا۔۔۔؟'' اس نے سر نفی میں ہلایا۔

اس کے کمرے کا دروازہ بجا۔

''بھابھی ہوں گی۔۔۔''

تبھی دروازہ کھول کر مسز ممتاز اندر داخل ہوئیں۔

''ملاقات کا وقت ختم ہوتا ہے۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ویسے ہمارے خاندان میں شمشاد نے نئے ریکارڈ قائم کئے ہیں۔ وہ وہ کیا ہے جو پہلے کسی نے نہیں کیا۔'' وہ چھیڑنے والے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''اب ہم میاں بیوی ہیں۔۔۔ کسی کی مجال کہ کوئی ایسی دلیل لا کر دکھادے۔ جو ہم پہ پابندی لگا سکے۔''

''اچھا مولانا۔۔۔ چلیں اب۔'' وہ اسے دھکیل رہی تھیں۔ وہ بھی ہنستا ہوا ان کے ساتھ جاتے ہوئے بھی فاطمہ کو ہی دیکھ رہا تھا۔ دروازے تک پہنچ کر اس نے پھر سے مڑ کر اسے دیکھا اور باہر نکل گیا۔

اپنی انگلی میں پہنی انگوٹھی پہ اس کی نظریں ٹک سی گئیں۔۔۔ یہ انگوٹھی اس شخص نے پہنائی تھی جو اب اس کا شوہر تھا، جو کچھ دیر پہلے اس سے اپنی محبت کا اظہار کر کے گیا تھا اور اس سے بھی محبت کا اظہار چاہتا تھا۔ پہلے وہ اس سب کو ذہن سے جھٹک سکتی تھی کہ بات منگیتر کی تھی اور منگنی اس کے نزدیک کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اب وہ اس تصور کو ذہن سے بالکل محو نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اب وہ اس کا شوہر تھا۔۔۔ تمام حقوق اپنے کروا چکا تھا۔

وہ اس کی مخلصی کی وجہ سے اس سے رشتہ جوڑنا چاہتا تھا اور وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کسی کے نکاح میں ہو کر، کسی اور کو سوچنا رشتے کے اخلاص کو میلا کرنا تھا۔۔۔ اور اسے ایسا نہیں کرنا تھا۔

وہ کبھی اللہ کے فیصلوں کی منکر نہیں ہوئی تھی، اب بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔۔۔ جہاں جس کا مقام ہو، اسے وہیں رکھنا چاہئے۔ یہ نجوگ قدرت میں لکھا تھا وہ اسے رد نہیں کر سکتی تھی۔ دل پہ زور نہیں تھا لیکن سوچیں اس کے قابو میں تھیں۔ وہ کسی ایسے انسان کے بارے میں نہیں سوچے گی جو کبھی اس کا نہیں ہو سکتا تھا اور اسے اسی انسان کو سوچنا تھا جو اب صرف اور صرف اسی کا تھا۔

انگوٹھی والا ہاتھ اس نے بھینچ کر لبوں سے لگا لیا۔ کچھ آنسو بھی ٹوٹ کر گرے۔

''پیپرز کب سے ہیں۔۔۔؟'' اس کے سوال پہ وہ حال میں لوٹی۔

''دو ہفتے بعد۔۔۔''

گاڑی گیٹ کے سامنے روک دی تھی۔ اب اسے کسی محلے والے کا ڈر نہیں تھا کہ کوئی ان پہ بات کرے گا کیونکہ سب جانتے تھے کہ وہ میاں بیوی ہیں۔

''ایک ریکویسٹ کرنا تھی کہ میرے پراف میں پلیز مجھے ڈسٹرب مت کریئے گا۔ آپ جانتے ہیں میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔'' شمشاد نے سر کو خم دیا۔

''بے فکر رہو۔ ہماری طرف سے کوئی ڈسٹربنس نہیں آئے گی۔'' اس کے چہرے اور آنکھوں میں چمک جاگی تھی۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ جولڑکی پہلے بس شرائط رکھتی تھی اب درخواست کرنے لگ گئی تھی۔

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔

''کچھ بتانا تھا۔ ذہن سے نکل گیا۔'' وہ اس کی طرف ہی متوجہ تھی۔

''میں اگلے مہینے دوبئی جارہا ہوں اپنے بزنس کے لئے۔'' وہ چونکی۔

''یوں اچانک۔۔۔؟''

''اچانک تو نہیں ہے۔ بہت پہلے کا سوچا ہوا تھا بس کبھی بتایا اس لیے نہیں کہ ایسا کوئی تعلق کبھی بن نہیں پایا ہمارے درمیان۔ سوچا اب بتا دوں۔''

''آپ دوبئی شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔۔۔؟'' اس کا دل کانپ اٹھا۔ وہ یہاں سے کہیں نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے ہمیشہ ملک سے محبت رہی تھی اور وہ اسی مٹی کی خدمت کرنا چاہتی تھی۔ اپنے دیگر کلاس فیلوز کی طرح اسے کوئی دوسرے ملک جانے کا خبط نہیں تھا۔ اس میں وفا تھی، اخلاص تھا تو رشتوں کے علاوہ مٹی سے بھی تھا اور وہ اسے بھی ایمانداری سے نبھانا چاہتی تھی۔

''یہاں بھائی جان ابا کا بزنس دیکھ رہے ہیں۔ میں کسی دوسرے ملک میں اپنا بزنس شروع کرنا چاہتا ہوں۔ بزنس وہاں شروع کروں گا تو شفٹ تو ہونا ہی پڑے گا۔''

''مگر وہ تو آپ یہاں بھی سیٹ کر سکتے ہیں۔''

''یہاں کیا رکھا ہے۔۔۔؟'' اور آئینور فاطمہ گل ایک ایسے انسان کی شکل دیکھتی رہ گئی جو اس سے کہہ رہا تھا کہ یہاں کیا رکھا ہے۔۔۔؟ وہ ایسے ہر انسان کا منہ توڑ دینے کی خواہش رکھتی تھی جو کہتا تھا کہ پاکستان میں کیا رکھا ہے۔ سامنے بیٹھا وہ شخص اس کا شوہر تھا جو یہ بات کہہ رہا تھا اور اسے بے حد دکھ ہوا تھا۔ ان دونوں کی سوچ کتنی الگ سمتوں میں چلتی تھی۔

''میں چاہتا ہوں کہ شادی سے پہلے اپنا بزنس اسٹیبلش کرلوں۔ اگر تم دوبئی کی بجائے کسی اور ملک میں رہنا چاہتی ہو تو بتاؤ۔''

"صرف پاکستان میں۔۔۔" دوسرا، تیسرا کوئی نام نہیں تھا سوائے اس ایک نام کے۔

اس نے تیزی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور گھر کے کھلے گیٹ سے اندر چلی گئی۔ شمشاد اسے دیکھ کر رہ گیا۔

پراف کے دنوں میں کہیں سے کوئی ڈسٹربنس نہیں تھی لیکن وہ دو نگاہوں سے مسلسل زچ ہو رہی تھی جو اسے خود پہ محسوس ہوتی تھیں۔ اور وہ تھیں سموئیل عباد کی۔۔۔ جب وہ سر اٹھا کر دیکھتی تو وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوتا لیکن اسے لگتا کہ وہ کچھ دیر پہلے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کبھی آئینور کو مخاطب کرنے کی کوشش بھی نہیں کی اور کبھی جو وہ اس کے گروپ سے بات کرنے آتا بھی تو اسے یوں نظر انداز کر دیتا جیسے وہ وہاں ہو ہی نہیں۔ اسے وجہ نہیں معلوم تھی لیکن آئینور کا وجود عباد کے سامنے سے مٹ چکا تھا۔۔۔ اسے اب کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا کہ وہ دونوں کون سا ایک رستے کے مسافر تھے۔ اس کے رستے شمشاد سے نکاح کے بعد سے ہی الگ ہو چکے تھے۔ لیکن وہ چھپ کر اسے پھر کیوں دیکھتا تھا کہ وہ اس کی نظروں کی حدت اپنے وجود پہ صاف محسوس کر سکتی تھی۔ بس کبھی پکڑ نہیں سکی۔ اسے اس احساس سے الجھن ہوتی تھی۔

اس دن اس کا آخری وائیوا تھا۔ وہ پیپر دے کر نکل کر اپنے گروپ کو ڈھونڈنے نکلی ہی تھی کہ ریچل سامنے سے ٹکرا گئی۔

"تم نے تحریم وغیرہ کو دیکھا ہے۔۔۔؟" آئینور نے اس سے پوچھا۔

"تمہارے گروپ کو تو نہیں دیکھا البتہ گیٹ پہ کسی کو دیکھا ہے جو تمہارا منتظر ہے۔۔"

اپنا بیگ کاندھے پہ ڈالتی آئینور چونکی۔

"میرا منتظر۔۔؟ کون۔۔۔؟"

"وہی تمہارا بوائے فرینڈ جو اکثر تمہیں لینے آتا ہے۔" ریچل کی بات پہ اس کا رنگ سیاہ پڑا۔

"مائنڈ یور لینگویج ریچل۔ وہ میرا بوائے فرینڈ نہیں ہے۔" اس نے سختی سے اسے ڈپٹا۔

"کیا ہوا۔۔؟ سب ٹھیک ہے۔۔۔؟" سمیرا تبھی اس کے برابر آ کر کھڑی ہوئی۔ باقی دونوں غائب تھیں۔

"میں نے اسے بتایا کہ اس کا بوائے فرینڈ اسے لینے آیا ہے تو یہ غصے میں آ گئی۔ اب اس میں

غصہ کرنے والی بات کیا ہے۔ وہ بھائی تو ہے نہیں اس کا تو بوائے فرینڈ ہی ہوا نا۔'' ریچل یک دم معصوم دکھائی دینے لگی۔

''میں نے کہا نا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اپنا منہ بند کرو۔'' آئینور کا مارے ہتک کے چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''تو پھر کیسا ہے آئینور۔۔۔ تم بتا کیوں نہیں دیتی کہ تمہارے اور اس کے بیچ کیا چل رہا ہے۔ کیوں وہ ہر دوسرے دن تمہیں لینے آتا ہے۔۔۔؟'' سمیرا نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں میٹھا میٹھا طنز کیا۔

آئینور اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ اس کی دوست ہو کر کس طرف تھی، آج اس پہ کھل گیا تھا۔

''وہ میرا۔۔۔ کزن ہے۔'' شوہر کہتے کہتے لبوں میں ہی رہ گیا۔

ریچل عجب طریقے سے ہنس دی۔

''کزن کے ساتھ گھومو پھرو تو عزت پہ کوئی حرف نہیں آتا کیا۔۔۔؟ ویسے وعدے کزن سے کر رکھے تھے تو کسی اور کو کیوں امیدیں دلاتی رہی ہو۔'' ریچل کی بات پہ وہ چونکی۔

''میں نے کبھی کسی کو کوئی امید نہیں دلائی۔''

''اچھااااا۔۔۔ واقعی۔۔۔؟'' آئینور نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''عباد اور تمہارا سین نہیں سیٹ تھا۔۔۔؟'' آئینور کا رنگ اڑا۔

''ایسا کچھ نہیں تھا۔''

''مگر عباد تو کچھ اور کہتا ہے۔۔۔؟'' آئینور کو یقین نہیں آیا کہ عباد اس کے اور اپنے بارے میں کچھ ایسا بھی کہہ سکتا ہے۔

''اب اسے ہری جھنڈی دکھا کر کسی اور کے ساتھ چل پڑی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔۔۔؟''

''مائنڈ یور لینگویج ریچل۔۔۔ وہ کوئی اور نہیں، میرا شوہر ہے۔ میرا نکاح ہو چکا ہے اس سے۔'' اس سے زیادہ وہ اپنے کردار پہ نہیں سن سکتی تھی۔ سمیرا اور ریچل ہکا بکا سی اس کی صورت دیکھنے لگیں۔

غصے کا ایک ابال آئینور کے وجود میں اٹھا اور اس نے تیزی سے گراؤنڈ میں کھڑے عباد کی طرف رخ کیا جو موبائل پہ کسی سے بات کرتا ہوا ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

''کیا میں نے کبھی آپ سے کچھ ایسا کہا جس پہ آپ کو لگا ہو کہ ہمارے درمیان کوئی تعلق ہے

۔۔۔؟" بنا کسی تمہید کے وہ اس پہ پھٹ پڑی۔ اس نے کال کاٹ کر حیرت سے اسے دیکھا۔ ایسی کسی چڑھائی کے لئے وہ ہرگز تیار نہ تھا۔

"اگر میں نے کہا ہے تو بتائیں ورنہ یہ جھوٹے ڈرامے کرنا بند کریں۔" اندر بہت کچھ کافی عرصے کا پک رہا ہو تو ہلکی سی رگڑ درکار ہوتی ہے زمین کے پھٹنے میں۔ وہ رگڑ لگ چکی تھی۔

"میں نے کون سا ڈرامہ کیا ہے۔۔۔؟" اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"یہ آپ ان سے جا کر پوچھیں جنھیں آپ ہماری سیٹنگ کے قصے سناتے رہے ہیں۔" وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا ہوا تھا لیکن اس کا یوں چلانا عباد کو ناگوار گزرا تھا۔

"آئینور فاطمہ گل! میں اتنا گرا ہوا نہیں ہوں کہ کسی لڑکی کو مفت میں بدنام کروں۔ دو دن ٹھیک سے بات کرنے اور خیال رکھنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہماری سیٹنگ ہو گئی۔ اور جب کچھ ایسا تھا ہی نہیں تو میں کیوں کسی کے سامنے ایسی کوئی بات کروں گا۔ آپ کو حق ہے جس مرضی کے ساتھ گھومیں پھریں، یہ آپ کی لائف ہے جیسے مرضی جئیں۔۔۔ آپ نے اپنے معیار بدل دیے ہوں گے، میں کبھی اپنا معیار نہیں بدلتا اور نہ اس سے نیچے آتا ہوں۔ آپ میرے لئے بس ایک کلاس فیلو ہیں، صرف اور صرف ایک عام سی کلاس فیلو۔ جیسے باقی سب ہیں، بالکل ویسے ہی۔۔۔ اس سے زیادہ نہ کبھی تھیں اور نہ ہی ہیں۔۔۔ سمجھیں آپ۔۔۔؟" اس کی نظروں سے نظریں ملائے، کچھ برہمی سے، کچھ شکستہ خوردہ ہو کر، کچھ چوٹ کھائے ہوئے، کچھ ٹوٹے اعتبار اور ٹوٹے دل سے اس نے وہ سب کہا اور ایسے الفاظ میں کہا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ لیکن ان الفاظ میں، اس لہجے میں اتنی ہتک تھی کہ آئینور فاطمہ گل کے گال دہکنے لگے۔ دل کیا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ کاش کہ زمین پھٹ ہی جاتی اور وہ کسی کو نظر نہ آتی۔

وہ اس سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہاری کوئی حیثیت ہے ہی نہیں اور تم یہاں کیا حیثیت جتانے آئی ہو۔ وہ اسے یہ کہنا چاہتا تھا کہ اپنی شکل آئینے میں جا کر دیکھو اور سوچو کہ تم میں ایسا کیا ہے کہ میں تمہیں اہمیت دوں گا جب میں نے کلاس کی کسی دوسری لڑکی کو کبھی اہمیت نہیں دی تو۔۔۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ کس خوش فہمی میں مبتلا ہو رہی ہے، وہ تو کبھی اس کے بارے میں سوچتا بھی نہیں ہے۔ وہ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ معیار سے گر چکی ہے اسی لئے نجانے کس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے اور ایسی

گری ہوئی لڑکی سے محبت اس کا معیار نہیں ہے۔۔۔نہیں وہ اس سے یہ سب کہنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔وہ اس سے یہ سب کہہ چکا تھا۔

آئینور نے تھوک نگلا۔دل میں بہت درد اٹھا۔آنکھوں میں شدید جلن ہوئی لیکن اس نے آنکھوں کی نمی کو روکا۔منہ سے بلند ہونے والی سسکی کو روکا۔سامنے کھڑا وہ شخص اس کو دو کوڑی کا کر چکا تھا۔اس نے خود کو دو کوڑی کا ثابت نہیں کرنا تھا۔اس کے پاس اپنا نسوانی پندار ہی تو سب کچھ تھا جس پہ آنچ تو آ ہی چکی تھی لیکن وہ اسے پاش پاش نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔اسے اپنی ذات کا غرور سنبھالنا تھا۔اپنے وقار کو قائم رکھنا تھا۔

''سمجھ گئی۔۔۔''اس نے تیزی سے پلکوں کو جھپکا۔

''سوری۔۔۔''بہ مشکل اس نے کہا اور وہیں سے تیزی سے پلٹی۔

کتنوں نے یہ سب سنا ہوگا، کتنوں نے دیکھا ہوگا وہ نہیں جانتی تھی۔اسے بس یہ لگا کہ سارا زمانہ اس پہ ہنس رہا ہے کیونکہ وہ ایک شخص کے ہاتھوں ہتک اٹھا چکی تھی۔اس شخص کے ہاتھوں جس پہ کبھی دل بے اختیار ہوا تھا۔کیوں ہوا تھا،اسے افسوس ہوا۔

تیزی سے گیٹ کی طرف جاتی آئینور فاطمہ گل کی آنکھ سے قطرہ ٹپکا اور گھاس میں جذب ہوگیا۔دوسرا ٹپکا اور اس آستین میں جذب ہوا،جس سے اس نے گال کو رگڑا تھا۔۔۔تیسرا قطرہ نہیں ٹپکا تھا۔وہ اس کے دل پہ وہاں گرا تھا جہاں کبھی وہ شخص بسا تھا اور اب اس قطرے نے جا کر اس دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر کے سیل کر دیا تھا تاکہ وہاں سے کسی جذبے کا گزر نہ ہو۔

محبت کا وہ باب جو کبھی کھلا تھا،کبھی نیم وا ہوا تھا،وہ باب اب بند ہوگیا تھا۔

زمین نہیں پھٹی تھی،وہ اس میں نہیں دھنسی تھی لیکن دنیا کی نظروں سے آئینور فاطمہ گل پھر ایسی اوجھل ہوئی کہ پھر کبھی کسی کو دکھائی نہیں دی۔

❁ ❁

ناول **سپاس گزار** کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **5** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 10

ٹھیک اس واقعے کے پانچ سال بعد وہ ہسپتال میں تھا جب اس کے موبائل پہ کال آ رہی تھی۔ مصروف ہونے کی وجہ سے اس نے وہ کال کاٹ دی اور ایسا متعدد بار ہوا۔ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد جب اس نے موبائل دیکھا تو اس پہ میسج آیا ہوا تھا۔

''عباد آئی وانٹ ٹو ٹاک ٹو یو۔'' نیچے نام لکھا تھا۔۔۔سمیرا حیات۔

کچھ تعجب سے اس نے دوبارہ میسج دیکھا اور متذبذب سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

سمیرا کو اتنے سالوں بعد اس سے کیا بات کرنا تھی۔میڈیکل کے پانچ سال وہ ہمیشہ اس سے اکھڑی اکھڑی ہی رہی۔ان دونوں کے درمیان گفتگو کی نوبت کبھی نہیں آئی۔وہ اس کے گروپ سے مخاطب بھی ہوتا تھا تو بھی سمیرا یوں بن جاتی جیسے وہ اسے نہ دیکھ رہی ہے نہ سن رہی ہے۔وہ اس کے لئے جیسے کلاس کا حصہ نہیں تھا۔اس کی اپنے لئے نفرت وہ سمجھتا تھا، پانچ سال تک دیکھتا آیا تھا۔پھر اتنے سالوں بعد اس نے خود اس سے کیسے رابطہ کر لیا۔

اس نے کچھ سوچ کر خود ہی کال ملا دی۔

''کیسے ہو عباد۔۔۔؟''

''ٹھیک ہوں۔آپ بتائیں۔۔۔؟'' وہ بھلے اس کی ہم جماعت رہی تھی لیکن وہ اسے تم کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔

''ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوں پچھلے دو ہفتوں سے۔ٹیسٹ پہ ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔'' اس کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"خیریت۔۔۔کیا ہوا آپ کو۔۔۔؟"

"شاید آئینور کی بددعا لگی ہے۔۔۔ یا پھر تمہاری۔" اس نے ناسمجھی سے ناک سکوڑی۔ ان دونوں کا وہاں کیا ذکر تھا بھلا۔

"میں نے کبھی بھی آپ کو بددعا نہیں دی۔ ان فیکٹ۔۔۔" وہ رکا اور پھر کچھ توقف سے بولا۔

"آئی ایم سوری سمیرا۔۔۔ کالج کی ویلکم میں جو کچھ ہوا اس سب کے لئے آئی ایم ریلی سوری ۔۔۔ مجھے یہ معذرت اسی وقت کر لینی چاہیے تھی لیکن شاید معذرت کرنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اسی لئے میں کبھی یہ مشکل کام نہیں کر پایا۔ مگر یقین کریں پانچ سالوں میں جب جب آپ کو دیکھا میں نادم ہی رہا۔ اپنی ندامت کو میں دکھا تو نہیں سکتا لیکن میں از حد شرمندہ تھا اور رہا ہوں۔"

"تمہیں نادم ہونے کی ضرورت نہیں ہے عباد۔ تمہاری کی گئی بے عزتی کا میں نے اسی وقت بدلا پورا کر دیا تھا لیکن بدلا لے لینے کے بعد بھی مجھے سکون نہیں آیا۔۔۔ شاید میں سخت کینہ پرور ہوں۔۔۔ آسانی سے معاف کرنا میری فطرت میں نہیں ہے۔۔۔ جو ایک بار برا لگ جائے وہ ہمیشہ ہی مجھے برا لگتا ہے چاہے وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔"

سموئیل خاموش رہا۔

پھر جیسے وہ طنزیہ ہنس دی۔

"کینسر ڈائیگناز ہوا ہے مجھے۔" سموئیل کو کرنٹ لگا۔

"کینسر۔۔۔؟"

"بریسٹ کینسر۔ سٹیج تو۔۔۔ ڈاکٹرز کہہ تو رہے ہیں کہ خطرے کی زیادہ بات نہیں ہے لیکن کینسر کا نام ہی خطرہ ہے اور میں خود ڈاکٹر ہوں تو جانتی ہوں کہ ڈاکٹرز کو تسلیاں دینے کی عادت ہے۔"

"سو سیڈ ٹو ہیئر دس۔۔۔" اسے سمجھ نہیں آئی وہ کیا کہتا۔ اسے سچ میں افسوس ہوا تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں وہ اتنی بڑی بیماری کا شکار ہو گئی تھی۔

"دو ہفتوں سے سوچ رہی ہوں کہ بیٹھے بیٹھے یہ سب کیا ہو گیا۔ چھ مہینے پہلے ہی تو میری شادی

ہوئی ہے۔ابھی تو زندگی شروع ہوئی تھی اور یک دم ختم ہوگئی۔''اس کی آواز بھرا گئی۔

''زندگی ختم نہیں ہوئی سمیرا۔۔وقت سے پتا چل گیا بیماری کا اور ٹریٹمنٹ شروع ہوگیا ہے تو یقیناً اللہ شفا بھی عطا کریں گے۔یقیناً اس آزمائش میں کوئی بہتری ہوگی۔''

وہ طنزیہ ہنسی۔

''بہتری یہی ہے کہ مجھے شدت سے پچھتاوا ہونے لگا ہے کہ میں نے تمہاری اور آئینور کی زندگی تباہ کردی۔اسی لیے تو شاید اپنی زندگی کی تباہی دیکھ رہی ہوں۔''سموئیل پھر سے چونکا۔

''ایسے کیوں کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔؟''

''کیونکہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے اور آئینور کے درمیان تمام فساد میری وجہ سے پیدا ہوا تھا عباد۔''سموئیل دم سادھ کر رہ گیا۔وہ کیا کہنے جارہی تھی۔

''یہ میں تھی جس نے ریچل سے وہ سب کروایا۔یہ میں تھی جس سے تمہاری اور آئینور کی خوشی برداشت نہیں ہوسکی کیونکہ میں تمہیں سکون میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔میں تمہارے اور آئینور کے درمیان اتنی بدگمانی پیدا کرنا چاہتی تھی کہ تم دونوں کبھی ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھو۔''اور اس دن کے بعد سے ان دونوں نے کہاں ایک دوسرے کی شکل دیکھی تھی۔

''ریچل تو یوں بھی تمہارے لئے پاگل تھی تو میرا اسے یہ کہہ دینا کہ عباد آئینور سے محبت کرتا ہے اسے مزید پاگل کرگیا تھا۔اور اس نے آئینور کو تمہاری نظروں میں گرانے کے لئے ہی کبھی تم سے اس کے بارے میں غلط بیانی کی اور کبھی آئینور سے تمہارے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کیں تاکہ وہ تم سے بدگمان ہوجائے۔۔۔لیکن سچ یہ ہے کہ اس سارے فساد کے پیچھے کا ماسٹر مائنڈ میں تھی۔ساری چال میری تھی،ریچل تو بس مہرہ تھی۔''سموئیل کو لگا اسے سانس آنا بند ہوگئی تھی۔

''آخری دفعہ جب وہ تم سے الجھی تھی تو اس وقت بھی ہم دونوں نے اس کا دماغ تمہارے خلاف بھرا تھا۔ہم نے اس کے کردار پہ انگلی اٹھاتے تمہیں بھی گھسیٹ لیا تھا۔اسی لئے وہ تم پر جاکر پھٹ پڑی۔''سموئیل نے تکلیف سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"یہ کیا کر دیا تم دونوں نے۔۔۔؟" وہ مدھم سا بولا۔

"یہ سب میں نے کیا عباد۔۔۔ میں یہ بھول گئی کہ وہ میری دوست تھی۔ بس یاد اتنا رہا کہ وہ تمہاری پسند تھی۔ حسد اور کینے نے مجھے کچھ دیکھنے ہی نہیں دیا۔"

"عداوت مجھ سے تھی اس بھلی لڑکی کے ساتھ کیوں یہ ظلم کیا سمیرا۔۔۔؟ ایک مضبوط کردار کے انسان کے لئے اس کا کردار ہی سب سے قیمتی متاع ہوتا ہے اور ہم نے مل کر اس کی وہ قیمتی متاع اس سے چھین لی۔"

"اسی لئے سزا کاٹ رہی ہوں۔ یونہی اس حال میں نہیں پہنچی۔ ہاتھوں کی کمائی ہے جو سامنے آ رہی ہے۔" وہ یہ تک نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹھیک ہو رہا ہے جو سزا کاٹ رہی ہو۔ کسی کی تکلیف پہ ایسا سوچنا بھی اس کے لئے گناہ کے مترادف تھا۔

"وہ لڑکا جو آئینور کو لینے آتا تھا جسے ریحل اس کا بوائے فرینڈ کہتی تھی وہ دراصل اس کا شوہر تھا۔" سموئیل کو پہلے سے بھی زیادہ شدید دھچکا لگا۔

"شوہر۔۔۔؟"

"ہمیں بھی اسی دن پتا چلا جب ہمارا لاسٹ وائیوا تھا۔ اس کا نکاح ہو چکا تھا اس لڑکے سے ۔۔۔ اسی لئے وہ اسے پک اپ کرتا تھا۔ آئینور ایسی نہیں تھی کہ کسی بھی لڑکے کے ساتھ چلی جاتی یہ بات میں جانتی تھی لیکن اس کا ادراک نہیں تھا کہ وہ اس کا شوہر ہوگا۔" سموئیل سے مزید نہیں سنا گیا اور اس نے کال کاٹ دی۔

فون اس کی گود میں گرا تھا اور وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے اپنے جذبات کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ تو جانتا تھا کہ آئینور ایسی نہیں ہے پھر وہ کیوں ریحل کی الٹی سیدھی کسی بھی بات پہ یقین کر بیٹھا تھا۔ کیا وہ ریحل کو جانتا نہیں تھا۔ شاید سمیرا اگر فون پہ اس بات کی تصدیق نہ کرتی کہ آئینور کا کوئی بوائے فرینڈ ہے تو وہ بھی اتنا بدگمان نہ ہوتا۔ اسے لگا تھا کہ سمیرا آئینور کی دوست ہے اور پانچ سالہ دوستی میں

مخلصی خود بخود آ جاتی ہے لیکن وہ غلط تھا۔

''اور میں نے اسے کیا کیا کہہ دیا۔۔۔میں نے بڑے مہذب انداز میں اسے بدکردار کہا۔ گری ہوئی۔ معیار سے کم تر لڑکی۔۔۔اوہ اللہ۔'' اس نے غصے سے اپنے بال نوچے۔

''سموئیل عباد صاحب۔۔۔تبھی تو آپ کی سزا ہے کہ آپ پانچ سال بعد بھی اسے نہیں بھولے جس کا پانچ سال پہلے نکاح ہو چکا تھا۔ اب تک تو وہ کسی کی بیوی، کسی کی ماں بن چکی ہوگی۔۔اپنے گھر میں اپنے رشتوں سمیت سکون سے جی رہی ہوگی۔ اور آپ۔۔۔یہی آپ کی سزا ہے کہ آپ اس کی یاد لے کر جیئیں۔'' اندر سے کوئی اس پہ ہنس رہا تھا۔

ایک دو تھپڑ اس نے اپنے ہی منہ پہ جڑے اور چہرہ ہاتھوں میں گرا کر رو دیا۔

''ڈھونڈو اس لڑکی کو چاہے وہ پاتال میں ہی کیوں نہ چلی گئی ہو۔ اسے ڈھونڈو اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر معافی مانگو ورنہ یہ بوجھ لے کر ہی ساری زندگی پھرنا پڑے گا۔'' یہ اس کا ضمیر تھا جو اسے سزا سنا رہا تھا اور تب سے اب تک آٹھ مہینے ہونے کو آئے تھے وہ سزا کاٹ رہا تھا۔

☆......☆......☆

فاطمہ نے ہاؤس جاب کے لئے اپنے کالج سے ملحقہ کسی ٹیچنگ ہسپتال کو نہیں چنا تھا۔ وہ اپنے کسی ہم جماعت کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس دن پورے کالج کے سامنے وہ بے لباس ہو گئی تھی۔ اب وہ کسی کا سامنا کبھی بھی نہیں کر سکتی۔ اس دن گھر لوٹ کر وہ دو دن کمرے میں بند بس روتی رہی تھی۔ عباد کی نظروں میں اس کے لئے ہمیشہ اتنا احترام رہا تھا جتنا وہ دیکھنا چاہتی تھی۔ مرد کم ہی کسی لڑکی کا احترام کرتا ہے اور جس کا کرتا ہے وہ واقعی اس کی حق دار ہوتی ہے۔ اسے لگتا تھا کہ وہ عزت اور احترام اس کا حق ہے جو اسے مل رہا ہے۔ اس نے ساری زندگی اپنے نسوانی پندار کو کسی آبگینے کی طرح سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ بہت محتاط ہو کر رہتی تھی۔ فالتو کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ اپنی ذات کے گرد ایک احاطہ قائم کر رکھا تھا جسے کوئی پار نہیں کر سکتا تھا لیکن اب ایک جھٹکے میں سب تباہ ہو گیا وہ بھی اسی مرد کے ہاتھوں جس نے اسے خود اپنی نظروں میں محترم بنایا تھا۔ ابا اس سے کئی بار پوچھ چکے تھے کہ

کیا ہوا ہے، اس کی متورم آنکھیں اور ناک یہ بتانے کے لئے کافی تھے کہ کچھ ہوا ہے لیکن کیا ہوا تھا وہ کبھی مر کر بھی ابا کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اس نے لب سی لئے تھے۔ اب ان لبوں سے کبھی سموئیل عباد کا نام نہیں نکلنا تھا یہ طے تھا۔

''میں خالہ کے پاس جا رہی ہوں۔ وہیں رہ کر ہاؤس جاب کروں گی۔'' نجانے کب اس نے بالا ہی بالا سب طے بھی کر لیا۔ خالہ سے بھی بات کر لی اور اب ابا کو بتا رہی تھی۔ ابا کو بتا دینا کافی ہوتا تھا کہ امی کو تو ابا ہی منا لیتے تھے۔

''یہاں رہ کر ہاؤس جاب کرنے میں کیا مسئلہ ہے بیٹا۔۔؟ تم اپنی کلاس کی ٹاپرز میں سے ہو۔ تمہیں تو پیڈ ہاؤس جاب بڑے آرام سے مل جائے گی اور وہ بھی تمہارے مرضی کے کسی بھی ڈیپارٹمنٹ میں۔'' ابا کو اس کے فیصلے کی وجہ سمجھ نہ آسکی۔

''میں یہاں کے کسی ہسپتال میں ہاؤس جاب نہیں کرنا چاہتی۔''

''مگر کیوں۔۔۔؟ ایسا کیا ہوا ہے فاطمہ۔ مجھے بتاؤ۔ میری پریشانی مت بڑھاؤ۔۔'' انہیں اب سچ مچ تشویش ہونے لگی تھی۔

''بس کسی دوست سے جھگڑا ہوا ہے۔ مجھے اب اس کی شکل نہیں دیکھنا۔'' وہ اتنا ہی بتا سکتی تھی جو کافی حد تک سچ بھی تھا۔

''تو تم اس ہسپتال میں مت جاؤ جہاں وہ ہے۔ یہاں اور بھی بہت سے ہسپتال ہیں۔'' یہ بھلا اتنا آسان کہاں تھا۔

''اس لڑائی کو ایک دنیا نے دیکھا ہے ابا۔ میں ان میں سے کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔'' یہ کہنا بھی تکلیف دہ تھا۔

''سوچ لو اچھی طرح سے۔ دوسرے شہر میں رہنا بہت سے مسائل پیدا کر دے گا۔''

''میں سب طے کر چکی ہوں۔ اگلے ہفتے میں جا رہی ہوں خالہ کے پاس۔'' ابا بس اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"تمہیں ایک بار شمشاد سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ اب ہم سے زیادہ وہ تمہارا گارجین ہے۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس حوالے سے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اب وہ اپنے ہر عمل کے لئے اس کے سامنے جواب دہ ہے۔

"اسے بتادوں گی۔"

اس نے شمشاد کو فون پہ بتادیا تھا۔ وہ بھی اگلے ہفتے دوبئی جارہا تھا۔ اس کی بات سن کر کچھ الجھ گیا۔

"دوسرے شہر جا کر رہنے کی کیا تک ہے یار۔ یہاں بھی تو ہوتی ہوگی نا جو تم نے کرنی ہے۔ جب کالج یہاں ہے، ہسپتال یہاں ہیں تو دوسرے شہر جانے کی کیا سوجھی ہے تمہیں۔۔؟"

فاطمہ کے لئے جھوٹ بولنا مشکل امر تھا مگر وہ اسے سچ بتا کر اپنی شامت نہیں بلوا سکتی تھی۔ وہ اسے یہ بتادیتی کہ وہ کسی سے فرار چاہتی ہے اسی لئے جارہی ہے تو وہ اس بندے کی نسلیں کھنگال ڈالتا جو وہ نہیں چاہتی تھی۔

"ہوتی ہے یہاں بھی ہاؤس جاب مگر مجھے جس شعبے میں کرنی ہے وہ یہاں نہیں ہے۔" جھوٹ بولنا مشکل تھا لیکن اس نے بول ہی لیا۔ شمشاد کا منہ بن گیا۔

"یہاں اتنے بڑے ہسپتالوں میں شعبہ نہیں ہے اور وہاں جہلم کے چھوٹے سے ہسپتالوں میں شعبہ ہوگا۔"

کچھ متامل سے اسے کہنا پڑا۔

"شعبہ تو یہاں ہے مگر جگہ نہیں ہے۔" شمشاد کو ان باتوں کا زیادہ علم نہیں تھا۔ اس کے خاندان اور واقف کاروں میں دور دور تک کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔

"تو جو ڈھیر شعبے ہیں یہاں، ان میں سے کسی ایک میں کرلو۔ جاب ہی ہے کوئی زندگی موت کا مسئلہ تھوڑا ہی ہے۔" مطلب کھاتا ہی پورا کرنا ہے تو کسی میں بھی کر ڈالو۔ جان چھڑاؤ۔

"میں اپنی مرضی سے جگہ کا انتخاب چاہتی ہوں جہاں میں سکون سے کام کرسکوں۔"

"مجھے تو یہ بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہا۔"

''لیکن میں مطمئن ہوں اسی لئے جا رہی ہوں۔''

''جب فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ جاؤ۔۔۔ یوں بھی تم مجھے سمجھتی ہی کیا ہو۔۔۔؟ میری اہمیت تمہاری نظر میں دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔'' شمشاد نے غصے سے کال بند کر دی۔

فاطمہ کو اپنا رشتہ کہیں سے بھی رطابہ اور دانش سے مختلف نہیں لگا تھا۔ وہ دونوں بھی ایسے ہی تھے۔ رطابہ فیصلے کر کے دانش پہ مسلط کرنے کی کوشش کرتی جس پہ وہ چڑتا تھا۔ وہ بھی یہی کر رہی تھی۔ کیا واقعی انسان کی تعلیم اس میں احساس برتری انڈیل دیتی ہے۔ اسے خود پہ افسوس ہوا۔

''ابھی مجھے مت روکیں۔ اگلی دفعہ جو کہیں گے بنا چوں چراں کے مان لوں گی۔'' اس نے بس اسے پیغام بھیجا تھا۔

''سوچ لو۔ اگلی بار جو کہوں گا پھر وہ ماننا ہی پڑے گا۔ تم زبان دے رہی ہو۔'' کچھ دیر بعد اس کا میسج آیا تھا۔

''سوچ لیا۔'' اس نے جلدی سے جواب بھیجا لیکن اس وقت وہ بالکل بھی یہ تصور نہیں کر سکتی تھی کہ اگلی بار جو وہ کہنے والا ہے وہ ایک طوفان لانے والا ہے۔

وہ خالہ کے پاس جہلم چلی گئی تھی اور شمشاد دوبئی لیکن اپنی فیملی کی جانب سے اسے بہت کچھ سننے کو ملا تھا کہ اس کو بیوی کو حد میں رکھنا نہیں آتا، لگام ڈالنا نہیں آتا۔ جیسے تیسے اس نے فاطمہ کی وجہ سے وہ سب باتیں برداشت کر لیں۔ یہ کون سا پہلی مرتبہ تھا۔

ہاؤس جاب میں وہ بے حد مصروف ہو گئی۔ گھر پہ بات بھی کم ہی ہوتی اور شمشاد سے تو بالکل ہی کم۔ لیکن جب بھی وقت ہوتا وہ اسے کال کر لیتی۔ جب تہیہ کر ہی لیا تھا کہ اس رشتے کو وفا سے نبھانا ہے تو وہ اپنی پوری کوشش کرنا چاہتی تھی۔ تبھی تو وہ جو اندر ایک نسوانی انا تھی اسے ایک طرف رکھ ڈالا اور بیوی کا چولا پہن کر شوہر کو کال کرنے میں ہمیشہ پہل کرنے لگی۔ بیویوں کو شوہروں کے لئے اپنی انا اور حیا کو ایک طرف رکھ دینے میں کوئی ایسی قباحت نہیں ہے۔ اس نے بھی یہی کیا۔

اس نے دوبئی جاتے ہی اسے وہاں سے موبائل بھیجا تھا۔ فاطمہ نے شکریہ کرنے کے لئے اسے

کال کی تھی۔

"تم گھر جاتی ہو تو کم از کم میرے گھر والوں سے مل ہی لیا کرو۔ وہ اب تمہارے بھی گھر والے ہیں۔" وہ ویک اینڈ پہ گھر گئی تھی اور اس کے گھر والوں سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس پہ شمشاد کی ماما نے کافی شور وغل مچایا تھا۔ شمشاد بھی اس بات پہ اس سے خفا تھا۔

"رخصتی سے پہلے ہی منہ اٹھا کر مجھے سسرال جانا بالکل بھی مناسب نہیں لگتا۔ انہیں ملنا تھا تو خود آ سکتے تھے۔" اسے شمشاد کے گھر والوں کا شکوہ برا لگا تھا۔

"تم کون سا کسی کو بتا کر کہیں آتی جاتی ہو۔ اپنی مرضی کی مالک ہو۔" وہ اسے طعنے دینے پہ آ گیا تھا۔ نیا رشتہ جو بننے جا رہا تھا اس میں بھی اسے ہمیشہ طعنے ہی سننا تھا۔ کیا کوئی ایسا رشتہ بھی بن پائے گا اس کا جو طعنوں تشنوں سے پاک ہو۔

"ٹھیک ہے۔ اگلی بار بتا کر جاؤں گی۔" اس نے بات ہی ختم کر ڈالی۔

اگلی بار وہ بتا کر ہی گئی تھی لیکن شمشاد کی ماما نے پچھلی بار کا بدلا نکالا کہ نہ خود اس سے ملنے گئیں اور نہ کسی کو جانے دیا۔ ہمدان تھا جو چھپ کر دادی سے اس سے ملنے آ گیا تھا۔

"اتنا مس کرتا ہوں نا آپ کو۔ پتا نہیں کہاں جا کر بیٹھ گئی ہیں دنیا کے دوسرے کونے میں۔"

"تم تو یوں بھی اتنی بڑی کلاس میں آ گئے ہو کہ میں اب تمہیں نہیں پڑھا سکتی۔" وہ اب بھی اس کے بچوں کی طرح روٹھنے پہ مسکرا دی۔

"پڑھائی لکھائی کے علاوہ بھی کوئی تعلق ہے ہمارا۔ کبھی تو اس پڑھائی لکھائی سے نکل کر بھی سوچا کریں۔ جب تک آپ سے بات نہ کر لوں۔ سکون نہیں آتا۔ میسج کرو تو جواب نہیں، کال کرو تو اٹھاتی نہیں۔"

"بہت زیادہ بزی ہو گئی ہوں۔" وہ سچ میں بعض اوقات چھتیس اور بعض اوقات اڑتالیس گھنٹے کی ڈیوٹی کرتی تھی۔ اس کے بعد تو بس وہ لمبی تان کر سوتی کہ موبائل کا کسے ہوش ہوتا۔ بجتا رہتا کسی کونے میں پڑا اس کی بلا سے۔ کبھی سائیلنٹ پہ ہی لگا ہوتا۔ اٹھ کر دیکھ بھی لیتی تو اتنی آوازار ہوتی کہ

واپس کال کرنے کا دل ہی نہ چاہتا۔

''بزی کا تو پتا نہیں بدل ضرور گئی ہیں۔ پہلے جیسی بات نہیں رہی اب۔'' وہ ہمدان کو بس دیکھ کر رہ گئی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا اب پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی۔ اپنا غرور، وقار کھو کر پہلے سی بات کہاں رہتی ہے۔

''تمہارے لئے ہمیشہ پہلے جیسی ہی رہوں گی میرے طوطے۔'' وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اب اس کے گال پہ چٹکی کاٹتے اسے عجیب سا لگتا تھا۔

''بس پرندے ہی ہمدان سے ملانے کو۔ چاچو کا کبوتر، چاچی کا طوطا۔۔۔ دادی کا کوا، مامی کا عقاب۔۔۔ بس کسی کا گدھا نہ بن جاؤں۔'' برے برے منہ بناتا وہ فاطمہ کو ہنسانے لگ گیا۔

شروع کے چھ مہینے اس نے میڈیسن میں لگائے اور اگلے چھ مہینے پیڈز میں۔ اس کا ارادہ پیڈز میں ہی اسپیشلائزیشن کا تھا جس کا اظہار اس نے ایک بار شمشاد سے کر ڈالا۔

''اسپیشلسٹ۔۔۔؟'' وہ کچھ الجھا۔

''وہ بننے کے لئے تم مزید پڑھو گی۔۔۔؟''

''پڑھنا تو پڑتا ہی ہے۔ پڑھے بنا کیسے آگے بڑھے جا سکتا ہے۔''

''رہنے دو پھر۔'' اس نے بے زاری سے منع کر دیا۔

''جتنا پڑھ لیا ہے، بہت ہے۔ پڑھ پڑھ کر تم میرے اور اپنے درمیان تعلیمی فرق کو بڑھاتی جا رہی ہو۔ کل کو یہ مت کہنا کہ اب ماسٹرز کے بعد پی ایچ ڈی بھی کرو کیونکہ میں بڑی ڈاکٹر بن چکی ہوں۔ میں ماسٹرز ہی کر لوں تو سمجھو پی ایچ ڈی ہو گئی۔ مزید نہیں پڑھنا میں نے۔''

''آپ کو نہیں کہوں گی پڑھنے کے لئے لیکن مجھے پڑھنے سے مت روکیں۔''

''تم نے ڈاکٹر بننا تھا وہ تم بن گئی۔ اب بس کرو یہ پڑھائیاں وڑائیاں اور شادی کی تیاریاں کرو۔ ہاؤس جاب تمہاری بس ختم ہے۔ اگلے مہینے میں بھی پاکستان آ رہا ہوں۔ میرا بزنس یہاں پاؤں جما چکا ہے۔ اچھا بھی چل جائے گا۔ اس بار میں اکیلے آنے کی بجائے تمہارے ساتھ واپس دوبئی آنا چاہتا ہوں۔'' فاطمہ بالکل گنگ رہ گئی۔ اب ان دونوں میں مزید بحث ہونا تھی۔ وہ کیا کرتی کہ ان دونوں کی

ذہنیت اتنی مختلف تھی کہ بنا بحث کے کوئی معاملہ حل ہوتا ہی نہیں تھا۔

''ہم اس بارے میں پھر بات کریں گے۔'' اسے لگا تھا کہ اس بات کو فی الحال یہیں تمام کردیا جائے اور بعد میں چھیڑا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ بعد میں وہ اسے منا لے گی لیکن شمشاد اس موڈ میں نہیں تھا۔

''پھر شر کوئی بات نہیں۔۔۔ جو بات ہو رہی ہے وہ ابھی ہو رہی ہے اور میں کہہ رہا ہوں کہ تم نے ڈاکٹر بننا تھا تمہاری وہ خواہش پوری ہو چکی ہے۔ اب تم نہ کوئی نوکری کرو گی نہ مزید پڑھو گی۔'' فاطمہ کا ماتھا ٹھنکا۔

''کیا مطلب نوکری نہیں کروں گی۔۔۔؟ یہ نوکری کا یہاں کیا ذکر۔۔۔؟''

''جو بھی اسے بولتے ہیں پریکٹس۔۔۔ وہ تم نہیں کرو گی۔ کسی کلینک یا ہسپتال نہیں جاؤ گی۔ نہ کوئی اپنا سیٹ اپ بناؤ گی۔ مجھے اپنے گھر میں گھر کا سکون اور ماحول چاہئے، ہسپتال کا نہیں۔''

''شمشاد۔۔۔'' اس کی بات پہ وہ بالکل شاکڈ رہ گئی تھی۔ اب جبکہ پرواز کا وقت تھا وہ اس کے پر کاٹنے کی بات کر رہا تھا۔

''تمہیں کہتا تھا نا کہ جتنی شرائط لگانی ہے لگا لو۔ میں ایک ہی بار منواؤں گا اپنی شرط۔۔۔ تو میری شرط یہی تھی کہ تم نوکری نہیں کرو گی آئیندہ فاطمہ کیونکہ مجھے کوئی ورکنگ لیڈی نہیں چاہیے۔'' فاطمہ نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ اس شخص نے اسے کہاں لا کر پٹخا تھا۔

''میں ڈاکٹر بن رہی تھی تو آپ جانتے تھے نا کہ میں ورکنگ لیڈی ہی ہوں گی۔''

''ضروری تو نہیں ہے کہ ہر ڈاکٹر نوکری بھی کرے۔ لاکھوں لڑکیاں ہیں جو ڈاکٹر ہو کر بھی گھر سنبھال رہی ہیں۔''

''ایک لڑکی کو ڈاکٹر بنا کر گھر بٹھا دینا۔ اس میں ملک و قوم کا بھی نقصان ہے اور اس لڑکی کا بھی حق مارنا ہے۔'' وہ اسے نرمی سے سمجھانے لگی۔ قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''بات سنو۔۔۔ ملک و قوم کی مجھے رتی بھر پرواہ نہیں ہے۔ میں نے نہ اس ملک میں رہنا ہے نہ قوم میری سگی ہے جس کی فکر میں گھلا جاؤں۔ مجھے کیا لگے ملک و قوم سے۔ جہاں تک تمہاری بات ہے

تمہیں ہمیشہ تمہارا حق دیا ہے۔اب تم مجھے میرا حق دو اور اس سب کو ختم کرو۔ڈگری تمہیں ملنا تھی ،مل گئی
۔بات ختم۔۔اب مزید مشکلات مت کھڑی کرو۔"

اف۔۔۔وہ کیسے اس شخص کو قائل کرتی جس کی سوچ محدود تھی۔

"شمشاد بات کو سمجھیں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں جہلم جانے دوں۔اگلی بار تم میری ہر بات بنا چوں چراں کے مان لوگی
۔۔۔زبان دے کر پھر رہی ہو۔"

اس نے یاد دلایا۔

"پھر نہیں رہی میں لیکن۔۔۔"

"یار تم بحث بہت کرتی ہو۔ٹھیک کہتی تھیں ماما کہ پڑھی لکھی لڑکیاں بس اپنی ہی کہنا جانتی ہیں۔"

وہ چپ ہو گئی اور کال کاٹ دی۔

دو دن بعد پھر سے اس نے کال کی تھی لیکن وہ اس موضوع پہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہلنے
کے لئے تیار نہیں تھا۔

اس کی ہاؤس جاب ختم ہو گئی تو وہ واپس گھر آ گئی۔گھر لوٹ کر اس نے دو ہفتے کا وقفہ لیا اور قریبی
ایک ہسپتال میں نوکری شروع کر دی۔

دو دن بعد ہی شمشاد کی کال آ گئی۔

"تم نوکری کر رہی ہو۔۔۔؟"

اف کبوتر اف۔۔۔اس نے ہمدان پہ دانت پیسے۔

"گھر نہیں بیٹھ سکتی میں کیونکہ مجھے پریکٹس کرنا ہے۔"

"میں نے منع جو کیا ہے۔" اس بار وہ چلایا تھا۔یہ پہلی بار تھا کہ وہ اس پہ چلایا تھا اور فاطمہ بالکل
برف کی بن گئی تھی۔۔۔بالکل فریز۔۔۔

"تم پہ کون سی بات کا اثر ہوتا ہے آئینور فاطمہ۔۔۔؟تم جیسی خود سر اور ہٹ دھرم لڑکی میں نے

نہیں دیکھی۔'' فاطمہ کی آنکھوں میں پانی آنے لگا۔ یہ اس کی ذات پہ حملہ تھا۔

''مطلب تم نے سوچ رکھا ہے کہ میں جو بکواس کروں گا وہ تم کبھی نہیں سنو گی۔'' وہ ساکت و سامت سی کھڑی سن رہی تھی جو اس پہ چلا رہا تھا۔ یہ پہلی بار تھا۔

''تم نے شروع سے ہی تہیہ کر لیا تھا کہ تم مجھے دبا کر رکھو گی۔ ہمیشہ اپنی انا کو اوپر رکھو گی۔''

اس کو جیسے ہوش آیا۔ اسے اپنے لئے کچھ بولنا تھا۔ خاموشی سے اسے چلاتے ہوئے نہیں سننا تھا۔

''میں اپنا رائٹ مانگ رہی ہوں جس کو آپ دبا رہے ہیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ تم نے ڈاکٹری پڑھنا تھی، پڑھ لی۔۔۔ اب بس۔۔۔ اور نہیں۔۔۔ اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' فاطمہ نے آنسو صاف کیے۔

''کیا یہ سچ تھا کہ آپ نے میرا انتخاب صرف اس لئے کیا کہ آپ کو ایک ڈاکٹر بیوی چاہئے تھی۔۔۔؟'' اس کے سوال پہ شمشاد بالکل چپ ہو گیا اور فاطمہ کو اپنا جواب مل گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کی ماں سالوں پہلے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ ہی تھی جو بے وقوف بنتی رہی۔

''اور چونکہ اب میں ڈاکٹر بن گئی ہوں تو آپ کی خواہش پوری ہو گئی۔ آپ کی سب میں واہ واہ ہو گئی کہ اس کی بیگم ڈاکٹر ہے۔ یہ ڈاکٹر بیگم کا تمغہ آپ کو سینے پہ سجانا تھا جس کے لئے آپ نے مجھے استعمال کیا۔ اس سے زیادہ آپ کچھ چاہتے نہیں تھے اس لئے اب میں کیا چاہتی ہوں اس سے آپ کو سروکار نہیں رہا۔'' وہ ہنوز خاموش تھا۔

''بہت شکریہ۔۔۔ جس پسند کو محبت اور نجانے کیا کیا بتایا گیا تھا وہ بالآخر ایک خواہش تھی۔ آج آپ نے یہ ثابت کر دیا۔'' کال اس نے بنا کسی جواب کے کاٹ دی تھی۔ شمشاد پھر کال ملاتا رہا لیکن اس نے اٹینڈ نہیں کی۔ اس نے میسج بھیجا۔

''ڈرو اس وقت سے جب تم کال کرتے کرتے پاگل ہو جاؤ اور میں بھی ایسے اٹینڈ نہ کروں۔''

وہ واقعی ڈر گئی۔ اگلی بار اس کے کال کرنے پہ اس نے کال اٹھا لی۔

''میں اگلے ہفتے کی فلائٹ سے پاکستان آ رہا ہوں۔ ماما آئیں گی ڈیٹ فکس کرنے۔ میں چاہتا

ہوں تم ذہنی طور پہ تیار رہو۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''مجھے رخصتی پہ اعتراض نہیں ہے۔''

''شکر ہے کسی بات پہ تمہیں بھی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ طنزیہ ہنسا لیکن فاطمہ کو اس کا طنز چبھا تھا ۔وہ پہلے ایسے بات نہیں کرتا تھا۔

''پلیز مجھے جاب اور اسپیشلائزیشن سے مت روکیں۔'' اگر وہ اس کے سامنے ہوتا تو شاید وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی۔

''اس بار میں تمہاری بات نہیں مان سکتا فاطمہ۔ کیوں کہ ہر بات ماننے والی نہیں ہوتی۔''

اس نے لب بھینچ لئے۔

''میں ہفتے کی رات کو پہنچوں گا۔تب تک تم یہ نوکری والا معاملہ ختم کرو۔ بھابھیاں تمہیں ڈیٹ فکس ہوتے ہی مائیوں بٹھا دیں گی۔۔وہ ابٹن وغیرہ جو بھی ہوتا ہے، وہ لگانے کا ہمارے خاندان میں بڑا رواج ہے دلہن کو۔ ہماری دادی کہتی تھیں کہ دلہن پہ روپ اچھا آتا ہے۔'' وہ بات کے اختتام پہ ہنس دیا اور فاطمہ رو دی۔

پھر وہ اسے اپنی کی گئی شاپنگ کے متعلق بتانے لگا جو فاطمہ نے سنی ان سنی کر دیں۔اسے مردوں کی خریداری میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''شمشاد۔۔۔'' اس سے پہلے کہ وہ کال کاٹ دیتا اسے اپنا موقف پیش کرنا تھا۔

''میں جاب نہیں چھوڑوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

وہ یک دم خاموش ہو گیا۔تھوڑی دیر پہلے کا جوش مفقود ہو چکا تھا۔

''چاہے مجھے ہی چھوڑنا پڑے۔۔۔؟'' فاطمہ کا دل لرزا تھا۔اسے چھوڑنے کا مطلب وہ جانتی تھی۔چھوڑنا اتنا آسان نہیں رہا تھا اب۔

''تم جیسی لڑکی شوہر تو چھوڑ سکتی ہے لیکن ضد نہیں۔'' کال کٹ گئی اور ساتھ فاطمہ کا دل بھی۔

''مجھ جیسی لڑکی۔۔۔'' وہ زیرلب بڑبڑائی۔ ہتک سے گال تمتمانے لگے۔

موبائل ایک طرف ڈال دیا۔ آنکھیں بھل بھل آنسو بہانے لگیں۔

"میں کیسی لڑکی ہوں۔۔۔؟" اسے بری طرح عباد یاد آیا۔ اس نے بھی ایسے ہی اسے 'تم جیسی لڑکی' کہا تھا۔

"میں کیسی لڑکی ہوں اللہ کہ ہر مرد مجھے یہ طعنہ مارتا ہے۔۔۔ کیا میں سچ میں ایک بری لڑکی ہوں۔ بدکردار ہوں۔ گھر توڑنے والی ہوں۔۔۔۔؟ ؟ کیا اتنی محنتوں اور سنبھل سنبھل کر زندگی گزارنے کے بعد مجھے دوسروں سے حقارت سے یہی سننا تھا۔" اس نے آنکھوں سے آنسو بار بار صاف کیے لیکن وہ پھر سے بہنے لگ جاتے۔

ابھی کتنے امتحان اور تھے۔ وہ تھک گئی تھی اتنے سالوں کے مسلسل امتحانات سے۔ محنت نے اسے نہیں تھکایا تھا۔ تھکایا تو اسے اردگرد کے رویوں نے تھا۔ ہمارے گرد اتنی منفی کردار ہیں، اتنے منفی رشتے ہیں جو ہماری مثبت سوچ، مثبت توانائی کو تباہ کرنے میں ہی جتے رہتے ہیں۔

شمشاد نے کہا کہ وہ ضد لگا کر بیٹھی ہے۔۔۔؟ کیا یہ ضد تھی۔۔۔ اس نے طعنہ دیا کہ اس جیسی لڑکی شوہر چھوڑ سکتی ہے۔ کیا وہ واقعی ایسی لڑکی تھی جس کے لئے شوہر چھوڑ دینا بہت آسان تھا۔ وہ تو کہتا تھا کہ اس کی مخلصی سے متاثر ہوا تھا، اسی مخلصی سے متاثر ہو کر اس نے رشتہ جوڑا تھا پھر کیسے اتنی آسانی سے اس نے اسے گھر توڑنے والی لڑکیوں میں شامل کر ڈالا تھا۔۔۔ کہاں گئی وہ مخلصی، رشتوں کے لئے سچائی جیسے خیالات جو وہ اس کے بارے میں رکھتا تھا۔

اس نے روتے ہوئے آستین سے آنسو پونچھے۔

"میں نے کبھی کسی کی باتوں پہ، زندگی کے حالات پہ ہار نہیں مانی۔۔۔ اب بھی میں لڑوں گی جب تک لڑ سکی۔ میں نے ہارنا نہیں سیکھا شمشاد۔" منفیت انسان کو کمزور کر دیتی ہے اور ایسے ہر منفی خیال کو رد کر کے اس نے مثبت سوچتے ہوئے زندگی کا یہ محاذ لڑنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔

ہفتے کی رات گزر گئی اور وہ پاکستان نہیں آیا۔۔۔ یہ بات اسے ہمدان سے پتا چلی تھی کہ وہ پاکستان نہیں آیا۔

گھر والے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ کسی سے رابطے میں نہیں تھا۔ نہ کسی کی کال اٹھاتا تھا نہ ہی میسیج کا جواب دیتا تھا۔ گھر والے الگ پریشان تھے اور وہ الگ پریشان تھی۔ اس کی ساس اسے کوسنے دیتی تھیں کہ ان کا بیٹا اس کی وجہ سے پاکستان نہیں آیا۔ یہ اسے گھر کے بھیدی نے بتایا تھا۔ انہیں لگتا تھا کہ اس سب کے پیچھے فاطمہ ہی وجہ ہے۔

کچھ دن بعد ابا اس کے کمرے میں آئے تھے۔ ابا جب کبھی بھی اس کے کمرے میں آتے کوئی خاص بات ہی کرنا ہوتی تھی۔

وہ اسی وقت ہسپتال سے لوٹی تھی۔ تھکی ہوئی تھی اور سونے کی تیاری کر رہی تھی۔

''ابا۔۔۔ آئیں بیٹھیں۔'' ابا کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر وہ چونکی۔ وہ بستر پہ لیٹی ہوئی تھی، اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جلدی سے پاس پڑا دوپٹہ اوڑھ لیا۔

''سو رہی ہو تو میں بعد میں آتا ہوں۔'' وہ واپس پلٹنے لگے۔

''نہیں ابا۔ پلیز آجائیں۔ میں بس یونہی آرام کرنے کے لئے لیٹی تھی کہ ذرا کمر سیدھی کر لوں۔''

ابا سامنے صوفے پہ بیٹھ گئے۔

''لمبی ڈیوٹی تھی۔ کل کی گئی ہوئی آج لوٹی ہو۔'' وہ مسکرا دی۔

''سب ڈاکٹرز کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے شروع میں۔۔''

ابا بغور اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔

''جو کہنا چاہتے ہیں پلیز کہیں۔'' اسے ابا کی نظروں سے الجھن ہونے لگی۔

''شمشاد کا فون آیا ہے تمہیں۔۔۔؟'' وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔ فاطمہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''کب سے نہیں آیا۔۔۔؟'' اس نے تو غور ہی نہیں کیا تھا کہ کب سے فون نہیں آیا۔ ابا پوچھ رہے تھے تو وہ سوچ رہی تھی کہ دو ہفتے پہلے اس کا آخری بار فون آیا تھا۔ اب وہ کسی سے رابطے میں نہیں تھا جو تشویش کی بات تھی۔

''کیوں پوچھ رہے ہیں۔ خیریت۔۔۔؟''

"کوئی بات ہوئی ہے تم دونوں کے درمیان۔۔۔؟" فاطمہ نے اس ضد کا ذکر نہیں کیا جو شمشاد کے نزدیک فاطمہ لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

"مجھے اس کا فون آیا تھا فاطمہ۔" وہ چونکی۔

"آپ کو۔۔۔؟" وہ کسی سے بھی رابطے میں نہیں تھا اور اس نے ابا کو کال کی۔

"تم جانتی ہو نا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔۔۔؟" تو گویا وہ ابا کو بتا چکا تھا۔

"جو وہ چاہتا ہے وہ نہیں ہو سکتا آپ جانتے ہیں۔ میں کبھی اس کی یہ بات نہیں مان سکتی۔ پچھلے دس سال کی جدو جہد اس لئے نہیں کی کہ آخر میں بس گھر بیٹھ جاؤں اور کھانے بنا بنا کر میاں کا پیٹ بھروں۔ وہ مجھ سے جیسی بیوی بننے کا کہے گا میں بن جاؤں گی، اس کے سانچے میں ڈھل جاؤں گی لیکن اپنا پروفیشن نہیں چھوڑوں گی۔ اور اس بار آپ اس کی طرفداری نہیں کریں گے کیونکہ اس کا مطالبہ غلط ہے۔" ابا بس اسے دیکھ کر رہ گئے۔

وہ جانتے تھے کہ شمشاد نے ایک غلط مطالبہ کیا ہے۔ کسی عام بی اے پاس لڑکی کو گھر بٹھا دینا اور ایک پروفیشنل ڈگری ہولڈر وہ بھی ڈاکٹر کو گھر بٹھا دینا الگ بات تھی۔ لیکن وہ اسے اس مدعے پہ نہیں سمجھا سکتے تھے کیونکہ وہ اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جسے پڑھائی لکھائی میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی نہ ان کے نزدیک اعلیٰ تعلیم کی کوئی اہمیت تھی۔ ان کا دماغ بس حساب کتاب کرنا جانتا تھا کیونکہ وہ سب کاروباری لوگ تھے۔ انہیں اس وقت بس افسوس ہو رہا تھا کہ اپنی ہونہار بیٹی کا رشتہ کرتے ہوئے انہوں نے جلدی کر دی۔ وہ شخص اس سے ذہنی مطابقت نہیں رکھتا تھا اور جتنا بھی پڑھ لکھ جاتا، اس کی ڈگریاں اسے یہ سمجھ نہیں دے سکتی تھیں کہ وہ ایک لڑکی کا حق مار رہا ہے۔

"وہ چاہتا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں۔۔۔"

"تو آپ مجھے یہاں سمجھانے آئے ہیں۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن یوں اپنی اپنی ضد لگا کر اڑ جانے سے مسائل مزید بڑھ جائیں گے۔ ہمیں مسئلے کو حل کرنا ہے، مزید الجھانا نہیں ہے۔"

"وہ کہتا ہے تو اس کی انا کی تسکین کے لئے میں ہاتھ جوڑ لیتی ہوں، پاؤں پڑ جاتی ہوں مگر اس کی بات نہیں مان سکتی۔ اسے کہیں کہ ایسی شرط رکھے جو ماننا میرے لئے ممکن ہو۔ میری جان تو نہ مانگے۔ میں نے کبھی اس سے اس کی جان نہیں مانگی تھی۔" اپنا وقار وہ ایک بار کھو چکی تھی۔ اب اسے کھونے سے ڈر نہیں لگتا تھا لیکن زندگی کا خواب وہ آخری منزل پہ پہنچ کر توڑ نہیں سکتی تھی۔

"افسوس تو یہی ہے کہ وہ یہ نہیں کہتا۔"

"ابا!" وہ بستر سے اتر کر ان کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے وقت دیں۔ میں اسے منا لوں گی۔ مجھ پہ یقین رکھیں کہ میں اسے منا لوں گی۔۔۔ بس اماں کو کچھ مت بتائیے گا۔ وہ میری مشکلات کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔" اس وقت یہ بات کہتے ہوئے اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ شمشاد کی اس ضد کا کیا توڑ کرے گی۔ اسے کیسے سمجھائے گی، کیسے منائے گی۔ بس ابا نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔ اس کے سر پہ ہاتھ دھرا اور اٹھ کر چلے گئے۔ ابا کو تو اس نے کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا لیکن خود بے آرام ہو گئی تھی۔

اس دن کے بعد سے وہ شمشاد کو کال ملاتی رہی لیکن اس نے نہیں اٹھائی۔ وہ جب جب موبائل ہاتھ میں تھامتی اسے کال ملانے لگتی، متواتر ملاتی لیکن وہ نہ ریجکٹ کرتا نہ ہی اٹھاتا۔

اس نے کہا تھا اس وقت سے ڈرو جب تم کال کرو گی اور میں نہیں اٹھاؤں گا۔ وہ سچ میں ڈر گئی تھی اور بہت ڈر گئی تھی۔

اس نے کئی پیغامات بھیجے۔

"پلیز شمشاد۔ میری کال اٹینڈ کریں۔ مجھ سے بات کریں۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" لیکن وہ اس کے پیغامات تک نہیں دیکھ رہا تھا۔

اتنی محبت کے دعوے کرنے والا ایک دم کیسے اتنا بدل گیا تھا۔ کیا لوگ اتنی آسانی سے بدل جایا کرتے ہیں۔

وہ اسی وقت اسے پھر سے کال ملانے لگی۔ خلافِ توقع اس نے کال اٹھالی۔

''شمشاد۔۔'' اسے یقین نہیں آیا کہ دوسری طرف وہ لائن پہ تھا۔

''بولو۔۔۔'' اکھڑا سا لہجہ۔

''شمشاد سب آپ کے لئے بہت پریشان ہیں۔''

''میں بالکل بھی دوسروں کی پریشانی کا سننے میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ وہ بات کرو جس کے لئے کال کی ہے۔'' اتنا روکھا اور اجنبی انداز۔۔۔ وہ بالکل بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

''شمشاد۔۔۔ آپ پاکستان آجائیں پلیز۔۔۔ میں آپ کے سامنے آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' اس کی بات پہ کچھ دیر بالکل خاموشی ہوگئی اور پھر ایک قہقہہ گونجا۔ فاطمہ نے بے یقینی سے اسپیکر سے ابھرنے والے قہقہے کو سنا۔ اس میں کیا اتنا ہنسنے والی بات تھی اسے سمجھ نہیں آئی۔ وہ تو بالکل سنجیدہ تھی۔

''آئینور۔۔۔ آئینور۔۔۔ آئینور۔۔۔ تم کبھی وہ نہیں بن سکتی جو میں چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، شاید تمہارے لئے ہی کہتے ہیں۔'' فاطمہ نے لب بھینچ لئے۔ اس کا انداز اور لہجہ دونوں برے تھے۔

''تم ابھی بھی اپنی اسی بات پہ قائم ہو اور چاہتی ہو کہ میں پاکستان آؤں تا کہ تم منتیں ترلے کر کے مجھے منالو۔۔۔ ہے نا۔۔؟'' لہجہ طنزیہ تھا لیکن وہ اپنی جگہ ٹھیک تھا اسی لئے فاطمہ نے کچھ نہیں کہا۔

''اب بھی تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہاری بات ہی مانوں، تمہیں میری کوئی بات ماننا گوارا نہیں ہے۔'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ ایسا نہیں ہے لیکن اس سے نہیں کہا گیا۔

''مجھے لگا تھا کہ شاید تم ایک بہترین بیوی ثابت ہوگی لیکن میں غلط تھا۔'' اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

''ماما ٹھیک کہتی تھیں پڑھی لکھی لڑکی اتنی بددماغ ہوتی ہے کہ وہ کبھی گھرداری کر ہی نہیں سکتی۔ اسے بس نوکری کرنے کا خبط ہوتا ہے۔''

''میں گھر سنبھال سکتی ہوں مگر۔۔۔''

''مگر تم نوکری بھی کروگی۔۔۔'' اس کی بات اس نے جھٹ اچک لی۔

''اور تمہیں لگتا ہے کہ ڈاکٹری جیسی مشکل نوکری کے ساتھ تم گھر سنبھال لو گی۔۔۔ مجھے وقت دے دو گی۔۔۔ تم اتنی ہی پرفیکٹ ہو۔۔۔ ہے نا۔۔۔؟'' طنز پہ طنز۔۔۔

''مجھے محنت کی عادت ہے۔ میں کر لوں گی سب۔ بس آپ مان جائیں۔'' مزید ایک بلند قہقہہ سنائی دیا تو اس نے موبائل کو کان سے تھوڑا دور کیا۔

''کبھی کبھار مجھے تم پہ ترس آتا ہے۔ جانتی ہو کیوں۔۔۔؟''

وہ خاموش رہی۔

''جیسے گدھے کو بوجھ اٹھانے کی عادت ہوتی ہے نا۔ اس کے بنا اس کی زندگی بے کار ہوتی ہے ویسے ہی تمہیں بھی بوجھ اٹھانے کا خبط ہے۔ ایک شخص تمہیں آسودہ زندگی دینا چاہتا ہے لیکن تمہیں اپنی جان کو سختی میں ڈالنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ تم اس کے بنا بے کار ہو۔'' فاطمہ کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر گرا۔ محنت کرنے میں کیا برائی تھی۔ وہ کبھی بھی دنیا کی اس قوم کی ذہنیت کو نہیں سمجھ سکی جو محنت کو گالی اور محنتی کو گدھا سمجھتی تھی۔

''تم اب تک اسی فیصلے پہ بضد ہو تو سن لو آئینور فاطمہ کہ میں بھی اپنے فیصلے پہ بضد ہوں اور تب تک پاکستان نہیں آؤں گا جب تک تم اپنی ضد نہیں چھوڑو گی۔ بھلے میری طرف سے ساری زندگی بیٹھی رہو۔''

''اگر میں ضد نہ چھوڑوں تو۔۔۔؟'' ڈرتے کانپتے دل سے اس نے ہمت کر ڈالی پوچھنے کی۔

''تو مجھے چھوڑ دینا۔'' وہ اتنا سنجیدہ تھا کہ اس کی سانس رک گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے کال بند ہو گئی لیکن وہ اسی طرح بالکل گم صم سی موبائل کان سے لگائے کھڑی رہی۔

☆......☆......☆

زیور بابا اپنے کمرے کے باہر ہی دھوپ میں بیٹھے قرآن پڑھ رہے تھے جب ذکی ان کے پاس منہ بسورے پہنچا۔

''بابا! میرے ساتھ پارک چلیں گے۔۔۔؟'' اس کے ان دنوں امتحانات ہو رہے تھے اور

رطابہ نے ہسپتال جانے سے پہلے اسے تاکید کی تھی کہ وہ بیٹھ کر اردو کی تیاری کرے۔ واپس آ کر وہ اس کا ٹیسٹ لے گی۔ ذکی کی اردو اس کے ہم عمر دیگر بچوں کی طرح کمزور ہی تھی اسی لیے رطابہ چاہتی تھی کہ وہ خاص طور پہ اردو پہ دھیان دے۔ برے نمبروں کی وہ اپنی اولاد سے بالکل توقع نہیں کرتی تھی چاہے وہ کسی بھی مضمون میں ہوں۔ پڑھ پڑھ کر وہ اکتا گیا تھا اسی لئے کہیں باہر جا کر کچھ سکون چاہتا تھا۔

''چلتے ہیں۔ کیوں نہیں۔۔۔؟'' گو پارک گھر سے بالکل سامنے ہی تھا لیکن اس وقت سنسان ہی ہوتا تھا۔ سیکیورٹی کا یوں بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اذکار کم ہی اکیلا باہر نکلتا تھا۔

انہوں نے جلدی سے قرآن اندر جا کر رکھ دیا۔ جب سے زیور بابا کو کاموں سے ایک طرف کیا تھا وہ سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھے بس عبادت ہی کرتے رہتے تھے۔ کبھی قرآن پڑھ رہے ہوتے تو کبھی تسبیحات یا نوافل۔

''آپ سارا دن کمرے میں بیٹھ بیٹھ کر بور نہیں ہوتے۔۔؟'' وہ ساتھ فٹ بال بھی لے آیا تھا کہ کھیل سکے۔ اسے ہی اچھال رہا تھا۔

''بڑھاپے میں اب کیا کر سکتا ہے انسان سوائے رب کی یاد کو زیادہ کرنے کے۔۔؟'' وہ مسکرا دیے۔ وہ آہستہ چلنے لگے تھے۔ جسم کی توانائی خود بخود کم ہو گئی تھی۔

''میں آپ کو موبائل دیتا ہوں آپ وہ دیکھا کریں۔۔۔''

بابا ہنس کر ٹھہر گئے۔

''مجھے استعمال نہیں آتا موبائل کا۔ یوں بھی شوق نہیں ہے۔ اس پہ بھلا میرا کیا کام کہ میں اسے استعمال کروں۔'' ان کے پاس سادہ بٹنوں والا موبائل تک نہیں تھا۔ کرنل صاحب نے خود خرید کر بھی دیا تھا لیکن انہوں نے منع کر دیا کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

''یوز کرنا میں سکھا دوں گا اور اس پہ آپ اچھے اچھے اسلامی لیکچر سن سکتے ہیں۔ قرآت سن سکتے ہیں۔ میں بھی سنتا ہوں۔ بہت اچھا لگتا ہے۔'' زیور بابا نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپ اسلامی لیکچر سنتے ہیں بابا۔۔۔؟'' ایک دس سال کے بچے کے منہ سے ایسی بات سننا

بہت حیران کن تھا۔

"جی۔۔اکثر سنتا ہوں۔"

"کیا سنتے ہو لیکچرز میں۔۔۔؟" انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔ بابا کا پر اشتیاق لہجہ اس کے لئے حوصلہ افزائی کا سبب بنا تو وہ بھی پر جوش سا ہو کر بتانے لگا۔

"جب دل پریشان ہو تو لیکچر سنتا ہوں تاکہ سکون ملے۔ بابا مجھے بہت سکون ملتا ہے ایسی باتیں سن کر۔ جس میں بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں سب لوگ امتحان کے لیے آئے ہیں۔ بس سب کا امتحان مختلف ہے۔ جس میں صبر کی باتیں کی جاتی ہیں۔ جس میں امید دلائی جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے میرا امتحان میرے والدین ہیں اور مجھے صبر سے اس امتحان کو حل کرنا ہے۔" زیور بابا اسے دیکھتے رہ گئے۔ انہیں افسوس ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کے اندر بے سکونی ہے۔ اسی بے سکونی کو دور کرنے کے لئے وہ لیکچرز سنتا تھا۔ اس کی عمر کے بچوں کو موبائل پہ گیمز کھیلنے، کارٹون دیکھنے سے فرصت نہیں ملتی تھی اور وہ۔۔۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس نے کوئی غلط راہ سکون کی تلاش میں نہیں اپنائی۔

"اللہ کی یاد سے سکون ملتا ہے بیٹا۔" انہوں نے دل میں اس کے لئے دکھ محسوس کیا۔ وہ اپنے تمام پیارے رشتوں کے درمیان رہ کر بھی ایسا بے سکون تھا۔

"لیکن اگلے دن پھر سے دل ویسا ہی بے سکون ہو جاتا ہے۔ کیا کیا کروں پھر۔۔۔؟"

"جب ہم بیمار ہوں اور کم دوائی سے آرام نہ آرہا ہو تو کیا کرتے ہیں۔۔۔؟"

"دوائی زیادہ لیتے ہیں۔" بابا نے سر ہلایا۔

"تم بھی سکون کے لیے مقدار بڑھا دو۔ اگر سکون ملتا ہی ہے تو پھر زیادہ سن لیا کرو۔" اذکار نے سر ہلایا۔

"مجھے یہ سب سننے سے عجیب طرح کی طاقت ملتی ہے اور پھر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے بابا۔ ذرا سی بات پہ پریشان ہو جاتا ہے۔ رونا آجاتا ہے مجھے اور میرے دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ لڑکے رویا نہیں کرتے۔ میں کیا کروں کہ مجھ سے اپنا رونا کنٹرول نہیں ہوتا۔"

بابا نے اسے ساتھ لگا لیا۔

"رونا بری بات تو نہیں ہے۔ ہر بشر کو رونا آتا ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔۔۔لیکن ذرا ذرا سی بات پہ رونا کمزوری کی علامت ہے اور ہمیں بہادر بننا ہے، کمزور نہیں۔۔۔ بہادری اسی میں ہے کہ دل کو سمجھایا جائے کہ ذرا ذرا سی بات پہ پریشان مت ہو۔ مشکل وقت میں مضبوط رہنا سیکھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ روتے رہو گے تو کیسے بڑی باتوں کا مقابلہ کرو گے۔"

"بڑی باتیں کیا ہوتی ہیں۔۔؟ مجھے تو یہی باتیں بڑی لگتی ہیں جو مجھے رلاتی ہیں۔" بابا اسے کیا بتاتے کہ زندگی میں بہت بڑے دکھ بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔

"کچھ باتیں اس سے بھی بڑی ہوتی ہیں جن پہ تم روتے ہو۔۔۔ جیسے دیکھو میں جب چھوٹا تھا تو میری اماں فوت ہو گئیں۔ یہ ایک بڑا دکھ تھا۔ میں رویا تھا لیکن پھر میں نے خود کو بہادر کر لیا۔۔۔ پھر ابا مجھے یہاں اکیلا چھوڑ گئے۔۔ میں پھر بھی رویا تھا لیکن پھر میں نے حالات کو قبول کر لیا۔ پھر ابا بھی مجھے دنیا میں لاوارث چھوڑ گئے۔۔۔ یہ دکھ بھی بڑا تھا اور میں رویا لیکن میں نے صبر کرنا سیکھ لیا۔۔۔ یہ بڑے دکھ تھے لیکن میں نے ان کا مقابلہ کیا۔ ایسے دکھ سب کی زندگی میں آتے ہیں اور ہمیں ان کا مقابلہ بہادر بن کر کرنا ہوتا ہے۔ ہر وقت رونے سے انسان کمزور ہو جاتا ہے اور اللہ کو مضبوط بہادر انسان پسند ہے۔۔۔ کیا تم ایسے نہیں بننا چاہتے کہ اللہ تمہیں پسند کریں۔۔۔؟" اذکار نے جھٹ سے سر اثبات میں ہلایا۔

"تو بات بات پہ مت رویا کرو۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔؟"

"کوشش کروں گا۔ جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔" بابا مسکرا دیے اور اس کے ہاتھ پہ بوسہ دیا۔

"ذکی بابا! آپ دنیا میں اللہ کی طرف سے بھیجے ایک پیارے سے فرشتے ہیں۔ معصوم اور سادہ سے۔ آپ کے اندر ایک حساس اور پاکیزہ روح ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کی ہمیشہ مدد فرمائے اور آپ کو ایسا ہی رکھے۔" دوسرا بوسہ انہوں نے اس کی آنکھوں کا لیا۔

"میرا کوئی اپنا نہیں ہے لیکن آپ مجھے ایسے ہی پیارے ہیں جیسے سگی اولاد کی اولاد ہو۔" اس کے بالوں پہ ایک بوسہ دیا۔

"ہے بڈھے۔۔۔" رطابہ اس بری طرح چلائی کہ وہ دونوں کانپ اٹھے۔ مڑ کر دیکھا تو وہ

دانت پیس کر، بھینچی بھینچی مٹھیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

اپنا بیگ اور سامان اس نے وہیں گھاس پہ گرا دیا اور بھاگتی ہوئی ان کی طرف آئی۔ ذکی اور بابا بس حیران کھڑے تھے۔

''گھٹیا انسان میرے بچے کو کیوں چوم چاٹ رہا ہے۔۔۔؟'' اس نے قریب آ کر ذکی کو پرے کیا اور بابا کو دھکا دیا۔

''چھوٹی بی بی میں تو۔۔۔'' بابا کے لئے یہ سب کسی صدمے سے کم نہ تھا۔

''ہمت کیسے ہوئی میرے بچے کو ہاتھ لگانے کی، چومنے کی۔۔۔ میرا بیٹا معصوم ہے، نا سمجھ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم اس کا ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔''

بابا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اتنا گندا الزام۔۔۔ ان کی سات نسلیں ایسا سوچ نہیں سکتی تھیں جو وہ کہہ رہی تھی۔

رطابہ نے مڑ کر اذکار کو دیکھا جو ماں کے یوں چلانے سے سہما کھڑا تھا۔ متوحش ساماں کو دیکھ رہا تھا جو ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ اذکار کو یوں سراسیمہ کھڑا دیکھ کر اسے مزید غصہ آیا۔

''تمہاری ہمت ہوئی بھی کیسے۔۔۔؟'' وہ آگے بڑھی اور بابا کو پھر سے دھکا دیا تو وہ گر گئے۔

''ماما۔۔۔'' اذکار کی چیخ بلند ہوئی جس کی رطابہ نے کوئی پرواہ نہیں کی۔

اندر سے عابدہ بھاگی ہوئی آئی۔

''کیا ہوا بی بی۔۔۔؟'' سامنے کا منظر اسے پریشان کر گیا تھا۔

''غلطی ہوئی جو تمہیں بس کام سے نکلوایا۔ اسی دن تمہیں گھر سے نکلوا دیتی تو اچھا ہوتا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تم جیسا بڈھا ایسی گھٹیا حرکت بھی کر سکتا ہے میرے معصوم بچے کو اکیلا دیکھ کر۔'' بابا بالکل شاکڈ زمین پہ پڑے سن رہے تھے۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں لیکن زمین نہیں پھٹی کہ وہ اس میں دھنس جاتے۔

عابدہ کا ہاتھ بے اختیار منہ پہ گیا۔

''اور اس گھر کے مکین تمہیں اپنا کہتے ہیں، اس گھر کا فرد مانتے ہیں۔۔۔ تم جیسے بڈھے کو جو

ساری زندگی اکیلا رہا اور اپنی تنہائی میں نجانے کیسے گھناؤنے کام کرتا رہا ہوگا۔" زیور بابا پھٹی نگاہوں سے رطابہ کے منہ سے نکلتے مغلظات کو سن رہے تھے۔

"ماما بس کریں۔۔۔" اذکار نے رطابہ کا بازو سختی سے تھام کر اسے جھنجھوڑنا چاہا تو اس نے اذکار کو پرے کیا جس پہ وہ لڑکھڑا گیا۔

عابدہ بے چاری حیرت سے گنگ کھڑی تھی۔

"نکلو یہاں سے۔۔۔ تم جیسے دو ٹکے کا نوکر اپنی اصلیت پہ اتر ہی آیا ہے آخر۔" سامنے پڑے بوڑھے سے اسے کچھ حساب کتاب چکتا کرنے تھے اور وہ یہ موقع جانے نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے پرکا کو ابنایا تھا کیونکہ بالآخر اسے یہی کرنا تھا۔ وہ تو اسی موقع کی تاک میں تھی کہ جسے گھر کے کاموں سے بے دخل کیا اسے گھر سے بھی نکال دے تاکہ اذکار اس کے اثر سے باہر نکل سکے۔

"اٹھو نکلو یہاں سے میں کہہ رہی ہوں۔۔۔ سمجھ نہیں آتی کیا۔۔۔؟ یا دھکے مار کر نکالوں گی تو نکلو گے۔۔۔"

"ماما شاپ اٹ۔۔۔" ذکی ماں کے سامنے آیا اور پوری قوت سے چلایا تو رطابہ نے ایک تھپڑ اس کے گال پہ جڑ دیا۔

"خبردار۔۔۔ خبردار جو اس بڈھے کے لئے میرے سامنے اپنی آواز بلند کی تم نے۔ میں زبان کھینچ لوں گی تمہاری۔۔" اذکار مار کھا کر بھی رکا نہیں تھا۔ اس نے زمین پہ پڑے بابا کو اٹھایا۔

"بابا۔۔۔ بابا اٹھیں بابا۔" زیور بابا یوں تھے جیسے مومی پتلا ہوتا ہے۔ نہ جان ہوتی ہے نہ سانس لیتا ہے۔ بس جو جس طرف موڑ دے مڑ جاتا ہے۔ دس سال کے اذکار نے جب انہیں سہارا دے کر اٹھایا تو اسے ان کا وجود ایسے ہی لگا۔

"چھوڑ دو اسے ذکی۔۔۔" رطابہ نے اذکار کو پرے کیا۔

"اور تم اسی وقت یہاں سے نکلو۔۔۔ ورنہ میں سچ میں تمہیں ابھی کے ابھی دھکے دے کر نکال دوں گی۔" زیور بابا بالکل شاکڈ کھڑے تھے جیسے ان میں جان نہ باقی ہو۔ رطابہ نے ان کا بازو ر

تھاما اور انہیں کھینچنے لگی۔

''ماما۔۔۔ سٹاپ دس آل۔۔۔'' اذکار نے رطابہ کو پرے کرنا چاہا جو زیور بابا کو بازو سے تھامے گھسیٹ رہی تھی۔ ان کی پتھرائی نظریں اور ڈھلکتا سر یہ بتانے کو کافی تھا کہ ان کا جسم تو شاید پھر بھی بے عزتی کا بار اٹھانے کے لئے زندہ ہو لیکن اندر سے ان کی موت ہو چکی تھی۔ رطابہ انہیں گھسیٹ رہی تھی اور وہ کوئی مزاحمت نہیں کر رہے تھے۔ بس اس کے ساتھ گھسٹتے چلے جا رہے تھے۔

''نکلو یہاں سے فوراً۔۔۔'' ایک دھکا دے کر ان کا ہاتھ جھٹکا۔

''ماما۔۔۔'' ذکی پوری قوت سے چلایا اور یک دم زمین پہ گرتا چلا گیا۔ رطابہ اس کی طرف مڑی تو وہ زمین پہ گر چکا تھا۔

''ذکی۔۔۔'' وہ اس کی طرف بھاگی تھی۔

اسے سیدھا کرتے رطابہ نے اس کا گال تھپکا۔

''ذکی۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔؟ ذکی۔۔۔؟'' وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

مڑ کر دیکھا تو زیور بابا گیٹ سے نکل چکے تھے۔

رطابہ جلدی سے اپنے بیگ کی طرف بھاگی اور موبائل نکالا۔ وہ ایمبولینس کو کال ملانے لگی لیکن اس نے دانش کو کال ملا کر بس اتنا بتایا کہ ذکی بے ہوش ہو چکا ہے اور وہ اسے اپنے ہسپتال لے کر جا رہی ہے۔ ایمبولینس پہنچنے میں وقت لگ جاتا اور وہ یہاں بیٹھ کر وقت برباد نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اذکار کو عابدہ کی مدد سے گاڑی میں ڈالا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''میں ذکی کو ہسپتال لے کر جا رہی ہوں۔ پاپا آئیں تو بتا دینا۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے گھر کے کونے پہ فٹ پاتھ پہ بیٹھے زیور بابا کو دیکھا جن کا سر گھٹنوں پہ ٹکا تھا۔

''منحوس بڈھا۔'' وہ نفرت سے بڑبڑائی اور گاڑی بھگا لے گئی۔

ہسپتال کی ایمرجنسی میں اذکار کو لے جایا گیا تھا اور وہ پاگلوں کی طرح اپنے سینئرز ڈاکٹرز کو کالز ملا رہی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اذکار کو کیا ہوا ہے۔ وہ کیوں یک دم بے ہوش ہو گیا تھا۔

دانش جلد ہی ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ڈاکٹرز اور عملے سے سب معلومات لینے کے بعد وہ رطابہ کے پاس آیا تھا۔وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ اذکار کو کیا ہوا ہے لیکن وہ لاعلمی سے سر ہلاتی رہی۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن وہ انہیں بہنے سے روک رہی تھی۔

اذکار کو بنیادی طبی علاج مہیا کر دیا گیا تھا۔اب اس کے کچھ ضروری ٹیسٹ ہو رہے تھے۔رطابہ کی وجہ سے اسے خاص طور سے بڑی توجہ مل رہی تھی۔دانش بے چینی سے بس ادھر سے ادھر چکر لگا رہا تھا۔

دوپہر سے شام ہو چکی تھی اور جب شام رات میں ڈھلنے لگی تو ڈاکٹر منصور نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔دانش بھی اس کے ساتھ تھا۔

ڈاکٹر منصور رطابہ سے کچھ علامات پوچھ رہے تھے کہ اذکار کو کبھی سانس کا مسئلہ تو نہیں رہا، وہ تھکا ہوا تو نہیں رہتا، اسے بلیڈ پریشر کا مسئلہ تو درپیش نہیں ہے۔رطابہ کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔

ڈاکٹر منصور نے گہری سانس لے کر کوئی جملہ بولا جو مکمل میڈیکل کی زبان میں تھا۔دانش نے رطابہ کو ساکت ہوتے دیکھا اور پھر وہ سر نفی میں ہلاتے کہنے لگی۔

”ناٹ پاسیبل۔“ دانش نے دونوں کو باری باری ناسمجھی سے دیکھا۔

”اگر ایسا کچھ ہوتا تو مجھے پتا نہ چل جاتا۔میں اس کی ماں ہوں، ہارٹ سرجن ہوں۔۔۔ میں ایک پل میں جان لیتی اگر ایسا کچھ بھی ہوتا ڈاکٹر منصور۔۔۔“

”ہوتا ہے کبھی۔۔۔symptoms نہیں بھی ظاہر ہوتے ابرلی اسٹیج میں۔۔۔“ رطابہ مسلسل سر نفی میں ہلاتے اس بات سے انکاری تھی۔

”اٹس ناٹ پاسیبل۔“ وہ سر نفی میں ہلا رہی تھی۔دانش بے بسی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا جسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا بات کر رہے ہیں۔

”پلیز مجھے بھی کچھ بتائیں کہ اذکار کو کیا ہوا ہے۔۔؟“

”وہ ٹھیک ہے فی الحال لیکن ہمیں اس کے کچھ ٹیسٹ مزید کرنے ہیں تا کہ ہمیں کنفرم ہو سکے۔“

”آپ کو کیا لگتا ہے اسے کیا ہوا ہے۔۔؟“ دانش کو ڈاکٹر منصور نے کچھ دیر بالکل خاموشی سے دیکھا۔

"I think he has ventricular septal defect ..."

دانش نے ہنوز نا سمجھی سے ان دونوں کو دیکھا کہ کیا وہ آسان زبان میں اسے سمجھا سکتے ہیں۔

"اذکار کے دل میں بائے برتھ سوراخ ہے۔۔۔" دانش ان کی بات پہ ساکت رہ گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس دن وہ او پی ڈی میں تھا جب کوئی مانوس سی آواز سنائی دی۔

"ہیلو عباد۔۔۔" وہ جو تیزی سے کچھ ادویات کے نام لکھ رہا تھا، اس نے چونک کر سر اٹھایا تو وہ ریچل تھی۔ اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ حیران ہوا لیکن جلد اس نے اپنی حیرت پہ قابو پالیا۔

"کیسے ہو۔۔۔؟" اپنے ناخوشگوار تاثرات پہ اس نے قابو پانے کی کوشش کی۔

"ویٹ کرو میں بزی ہوں۔" اسے پتا تھا کہ وہ اب اس سے ملے بنا، بات کیے بنا نہیں ٹلے گی اسی لئے اسے کہنا پڑا۔ وہ سر ہلاتی باہر جا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ باہر آیا تھا۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔" بنا اس سے حال احوال پوچھے سیدھا اس نے کہا تھا۔

"پانچ سال بعد ملے ہو وہ بھی ایسے۔۔۔" گو وہ کسی کی بیوی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں اب بھی عباد کو دیکھ کر جو رنگ اترا تھا وہ سموئیل عباد کو بوکھلا گیا تھا۔

"میں ملنا نہیں چاہتا تھا تم سے ریچل نہ بات کرنا چاہتا تھا یہ بات تمہیں سمجھ جانا چاہئے تھی جب میں کال اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا البتہ اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ میری آخری دفعہ کی حرکت کے بعد سے تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتے تھے لیکن میں ملنا چاہتی تھی۔ کچھ امانت ہے تم تک پہنچانا تھی۔ اسی لئے رہبر سے تمہارے ہاسپٹل کا پوچھ کر یہاں آئی ہوں۔ پلیز سکون سے بیٹھ کر میری بات سن لو۔"

پانچ سال پہلے جب ان کے فائنل پراف ختم ہوا تھا تو ریچل نے اسے پارکنگ میں پرپوز کیا تھا۔ عباد نے پہلے حیرت پھر غصے سے اسے دیکھا۔ وہ اس لڑکی سے اس بات کی امید رکھتا تھا جس قسم کے وہ اشارے دیتی تھی لیکن پھر بھی اسے ریچل کا یوں پرپوز کرنا برا لگا تھا۔ اس نے بڑی سختی سے "سوری ناٹ

انٹرسٹڈ'' کہا اور تیزی سے وہاں سے نکل گیا تھا۔ ریحل بعد میں اس کے پیچھے بھی گئی تھی لیکن وہ بائیک بھگا کر لے گیا تھا۔ اس نے اپنا نمبر بھی بند کر دیا تھا۔ بعد میں وہ اسے کال کرتی رہتی لیکن وہ اس کی کال بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ اس کے میسیجز کا جواب نہیں دیتا تھا اور بالآخر اس نے اس کا نمبر بلاک کر دیا تھا۔

''میں تم سے سوری کرنا چاہتی تھی۔''

''سوری کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت گزر چکا ہے۔ میں اس بات کو بھول چکا ہوں جو تم نے کہا تھا۔ امید کرتا ہوں تم اپنی نئی زندگی میں خوش ہوگی۔'' وہ بالکل ٹھیک طرح سے بات کر رہا تھا۔ کینہ رکھنے کی اسے عادت نہیں تھی۔

''ہاں میں خوش ہوں لیکن اس بات نے مجھے پریشان کیا کہ تم نے اب تک شادی نہیں کی۔۔۔''

اس نے ہاتھ یوں جھلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔

''آئینور کی وجہ سے۔۔؟'' وہ امید نہیں کر رہا تھا کہ وہ ایسے کھل کر آئینور کا نام لے گی اسی لئے کچھ چونکا پھر سر جھٹکا۔

''نہیں۔۔۔بس مناسب وقت نہیں مل سکا۔ پڑھائی اور بزنس میں مصروف رہا۔ اب کرلوں گا۔''

وہ اسے بغور دیکھتی رہی جیسے کچھ جاننا چاہتی ہو۔

''میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ سمیرا کی کال آگئی تھی مجھے۔ وہ مجھے سب بتا چکی ہے۔''

''کیا بتا چکی ہے۔۔۔؟'' وہ یک دم چونکی۔ اس کی سمیرا سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی جب سے سمیرا کی شادی ہوئی تھی اس لئے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ عباد کو کیا بتا چکی ہے۔ اسے تو سمیرا کے کینسر کا بھی نہیں پتا تھا۔

''جو بھی تم دونوں نے پانچ سال پہلے کیا وہ سب۔۔۔سب کچھ۔۔'' ریحل کے منہ سے اوہ نکلا۔ وہ شرمندہ دکھائی دینے لگی۔

''میں۔۔۔میں۔۔۔'' وہ نظریں جھکائے لب کچل رہی تھی۔ نادم تھی اور یہ بات اس کے چہرے کے تاثرات سے عیاں تھی۔ لیکن اس کے شرمندہ ہونے سے اب نہ وقت لوٹنا تھا نہ ہی سب پہلے جیسا ہو سکتا تھا۔

"تم دونوں یہ نہ بھی کرتیں تو بھی ہماری تقدیر نہیں ملتی تھی کیونکہ اس کا نکاح ہو چکا تھا۔"

یہ بات کہتے اسے تکلیف ہوئی تھی۔ لیکن یہی بات سب سے بڑی حقیقت تھی۔ اس نے قبول کر لی تھی۔

"ہاں اس کا نکاح ہو چکا تھا لیکن رخصتی نہیں۔" ریچل نے جھٹ سے کہا۔ ایک تمسخرانہ مسکراہٹ نے سموئیل کے لبوں کو چھوا۔

"یہ پانچ سال پرانی بات ہے ریچل۔ شاید تم بھول رہی ہو۔۔ اب تک تو۔۔۔" اس سے آگے اس سے کہا نہ گیا۔ اس نے لب بھینچ لئے۔

"اس کی اب تک رخصتی نہیں ہوئی عباد۔" اس کی بات پہ سموئیل کو جھٹکا لگا۔

"اب تک۔۔۔ مطلب تم جانتی ہو وہ کہاں ہے۔۔۔؟ تم اس سے رابطے میں ہو۔۔۔؟"

وہ بے چینی سے اس کی طرف دیکھتے پوچھ رہا تھا۔

ریچل نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جو نقصان اس نے عباد اور آئینور کا کیا تھا وہ اس کا ازالہ کرے گی تبھی وہ وہاں آئی تھی۔

"اس کا بھانجا ہمارے ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھا۔ اس کی بڑی بہن ہمارے ہی ہاسپٹل میں سرجن ہے۔ وہ مجھے وہیں ملی تھی پچھلے دنوں۔۔۔" سموئیل نے بے چینی سے ریچل کو دیکھا۔

"اس کی رخصتی نہیں ہوئی عباد۔۔۔ بلکہ۔۔۔" ریچل نے ایک پل کو توقف کیا۔ ایک گہری سانس خارج کی۔

"اس کی رخصتی اب کبھی نہیں ہوگی۔" سموئیل نے ناسمجھی سے ریچل کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

ناول سپاس گزار کی اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 11

مزید ایک ہفتے کسی کا بھی شمشاد سے رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ اس نے مڑ کر دوبارہ ابا کو کوئی کال نہیں کی۔ فاطمہ نے کئی بار اسے کال ملا کر کاٹی تھی۔ ایک بیوی کی وفا کہتی تھی کہ اسے اپنے شوہر کو کچھ بھی کر کے منا لینا چاہئے لیکن ایک عورت کی انا کہتی تھی کہ جو کچھ بھی وہ کرنے کو کہہ رہا ہے سراسر غلط ہے۔ وہ اس سے اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب چھیننا چاہتا ہے اور اسے اس خواب کو کسی صورت بھی توڑنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ آخر شمشاد کی بیوی سے ہٹ کر بھی تو وہ کچھ تھی...... اپنے خوابوں کو تکمیل تک پہنچانے والی ایک محنتی اور مستقل مزاج لڑکی...... ایک بہادر اور خوددار لڑکی...... ڈاکٹر آئینور فاطمہ گل۔ یہی اس کی اصل پہچان تھی...... اور اپنی یہ پہچان اسے عزیز تھی۔

''فاطمہ کیا شمشاد کو منا لیا تم نے......؟'' اس دن ابا باہر صحن میں واک کر رہے تھے جب وہ ڈیوٹی سے لوٹی تھی۔ ابا کو سلام کر کے وہ اندر جانا ہی چاہتی تھی کہ انہوں نے پوچھ لیا۔ اس نے ایک تھکن بھری سانس لی۔ کچھ سوال سن کر ہی تھکن ہونے لگتی ہے۔

''نہیں ابا......'' سچ تو یہ تھا کہ اسے لگتا تھا کہ وہ شمشاد کو نہیں منا پائے گی۔ وہ ضد پہ اتر آیا تھا اور اس کی ضد فاطمہ کو جھکانا تھی۔۔۔۔ جھکانے سے بھی زیادہ اسے توڑنا۔

''تو کیا اس نے تمہیں منا لیا......؟'' اس نے ابا کو دیکھا اور سر نفی میں ہلایا۔

''وہ اپنی جگہ کھڑا ہے اور میں اپنی جگہ۔''

''تو معاملہ آگے کیسے بڑھے گا اگر تم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سے ہلو گے نہیں۔'' وہ ابا کو کیسے سمجھاتی کہ ابا اسی بات کا جواب تو نہیں ہے نا۔

اس نے شانے اچکائے اور اندر چلی گئی۔ ابا سچ مچ پریشان ہوئے تھے۔

اور ہفتے بعد ان کی وہ پریشانی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

اس رات جب وہ ڈیوٹی سے لوٹی تھی تو ابا صحن میں بچھی چارپائی پہ بیٹھے تھے۔ صحن میں بلب جلا ہوا تھا اسی لئے وہ ابا کا چہرہ ٹھیک سے دیکھ سکتی تھی۔ ان کا سر جھکا تھا اور کندھے بھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ابا کو سلام کیا تو انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

ان کی بجھی آنکھوں میں فاطمہ کو بہت مایوسی دکھائی دی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

''کیا ہوا ابا......؟'' وہ اسے بغور دیکھتے رہے۔ فاطمہ کو ان کی نظروں سے الجھن ہونے لگی۔

''ابا کیا ہوا......؟'' وہ قدم قدم ان کے قریب آئی۔

ابا کے پاس قریب ایک خاکی لفافہ تھا۔ انہوں نے اٹھایا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ تھوڑی دیر ابا کا بڑھا ہاتھ اور اس میں تھاما خاکی لفافہ دیکھتی رہی۔

خاکی لفافہ تھامتے اس کا دل لرزا تھا۔

لفافہ پہلے سے چاک تھا۔ اس نے باہر لکھا پتہ نہیں پڑھا تھا۔ بس اس میں موجود کاغذات نکال کر کھولے۔ اپنے نام پہ اس کی نظر سب سے پہلے گئی۔ پھر شمشاد کے نام پہ اور سب سے اوپر کاغذات کے متن پہ۔۔

''divorce paper'' اس کے لب ایسے ہلے کہ آواز دم توڑ گئی۔

شمشاد نے اسے آزاد کر دیا تھا...... ان کا تعلق ختم ہو چکا تھا۔ اتنی آسانی سے تو کوئی اپنے گھر میں بندھی بکری کو نہیں آزاد کرتا جتنی آسانی سے اس نے اپنی شریک سفر کو آزاد کیا تھا۔ وہ بالکل ساکت سی ان کاغذات کو دیکھے گئی۔

''اس نے طلاق بھیج دی ہے۔'' ابا کی آواز کانپ رہی تھی۔

''چھوڑ دیا اس نے تمہیں۔ بنا کوئی وجہ بتائے اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔'' دروازے میں امی کھڑی تھیں۔ ان کی آواز آنسوؤں سے نم تھی۔

''آخر کچھ تو ہوا ہو گا نا۔۔وہ تو بہت پیار کرتا تھا تم سے۔''اور یہ لفظ''پیار''ہی تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ کب کیسے بیچ سے نکل گیا تھا۔

''غلطی ہم سے ہوئی تھی کہ ہم نے اپنی اتنی قابل بچی ان لوگوں میں جھونک دی جنہیں اس کی قدر ہی نہیں تھی۔''ابا اپنی جگہ سے اٹھے۔ایک عرصے سے وہ اس پچھتاوے کا شکار تھے۔اب کھل کر کہہ ہی دیا۔

''زندگی کے کچھ فیصلے ایسے ہوئے ہیں مجھ سے جنہیں میں پلٹنا چاہتا ہوں لیکن میرے بس میں نہیں ہے۔ان میں سے ایک تمہارا اس سے رشتہ کرنا تھا۔''وہ اٹھ کر اس کے سامنے کھڑے تھے۔فاطمہ بس بت بنی تھی۔اسے کچھ دکھائی سنائی نہیں دے رہا تھا۔سب کے لب ہل رہے تھے لیکن وہ بہری ہو گئی ۔روشنی تھی لیکن وہ کیسے اندھی ہو گئی......؟

''یہ میرے ہاتھوں کو دیکھو۔''ابا نے اس کے بالکل سامنے پہنچ کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑے ۔ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔فاطمہ کو اتنی دیر میں پہلی بار دو بندھے ہاتھ دکھائی دیے جو اس کے باپ کے تھے۔پھر اس نے دو نم آنکھیں دیکھیں جو اس کے باپ کی تھیں۔ان آنکھوں سے آنسو ٹپکے گالوں پہ جو اس کے باپ کے تھے۔

''میں نے تمہاری زندگی برباد کر دی۔''جو آواز سنائی دی، وہ اسے واپس اس دنیا میں لے آئی، وہ اس کے باپ کی تھی اور اس آواز میں آنسو شامل تھے، جو اس سے معافی مانگ رہے تھے۔

وہ ابا کو دیکھے گئی۔اس کی آنکھیں بس پتھرائی ہوئی تھیں۔دماغ سن تھا۔نہ کوئی خیال آ رہا تھا نہ جا رہا تھا۔بس ایک بات...... شمشاد نے طلاق دے دی۔...... شمشاد نے اسے آزاد کر دیا......۔اور وہ اسی ایک جملے کی بازگشت کے ساتھ ساکت سی مرے مرے قدموں سے اندر کی طرف چلی گئی۔

اپنے پیچھے اسے اپنے باپ اور ماں دونوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

''میں نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔''وہ ابا تھے جو رو رہے تھے۔

"اتنی سی عمر میں طلاق......" وہ امی تھیں جو بلند آواز سے کہہ رہی تھیں۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے دروازہ بند کر دیا...... اب کوئی آوازیں نہیں تھیں۔ بس ایک آواز تھی، اس کے اونچا اونچا سانس لینے کی آواز۔۔ اس کے اندر گھٹن تھی اور اس گھٹن سے اس کا دل بند ہو رہا تھا اسی لئے وہ گہرے اونچے سانس لینے لگی اور بستر پہ بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں وہ خاکی لفافہ اور کاغذ چڑ مڑ تھے۔

صدمہ تھا...... بے یقینی تھی...... دماغ سوچنے سمجھنے سے دور تھا کہ آخر ہوا کیا تھا۔ ہوا کیا تھا کہ اتنی محبت کا دعوی کرنے والا وہ شخص اتنی آسانی سے اسے چھوڑ گیا تھا۔ وہ جو اس سے محبت کا کوئی دعوی نہیں کرتی تھی لیکن وفا نبھانے کا اس نے قصد کیا تھا، وہ اس رشتے کے ختم ہو جانے پہ ساکت رہ گئی تھی اور اس انسان کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

ہاتھ میں تھاما کاغذ اس نے پھر سے دیکھا۔ بڑا بڑا واضح لکھا تھا کہ شمشاد نے اسے طلاق دے دی۔ ساتھ میں دس لاکھ کا ایک چیک بھی تھا جو یقیناً اس کا حق مہر تھا...... اس چیک کو ہاتھ میں تھامے وہ اس پہ لکھی رقم دیکھتی رہی۔۔ دس لاکھ اور بس...... اس نے پورا حق مہر ادا کر دیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کیا ایک برباد ہو جانے والی زندگی کی قیمت چند لاکھ ہوا کرتے ہیں......؟ کسی لڑکی کے نازک جذبات کو ٹھوکر لگانے کا مداوا دس لاکھ سے ہو جایا کرتا ہے کیا......؟

کاغذ اور چیک اس نے زمین پہ پٹخا اور منہ میں چادر ٹھونس کر زور زور سے چیخنے لگی۔ نجانے کتنی دیر کر وہ اسی طرح چیختی رہی، روتی رہی کہ اس کی تمام چیخیں اسی چادر میں دم توڑتی رہیں۔

رونا، آنسو بہانا کوئی بزدلی کی علامت نہیں ہوتے۔ یہ درد کی علامت ہوتے ہیں اور درد ہر کسی کو ہوتا ہے اور ایک سا ہوتا ہے۔۔۔ بہادر کو بھی بزدل کو بھی۔۔ ڈٹ جانے والے کو بھی، بھاگ جانے والے کو بھی۔ اسی لئے وہ روئی تھی، خوب روئی تھی کہ رونا اس کا حق تھا۔

اتنی سی عمر میں جب لڑکیاں اپنی نئی زندگی شروع کرنے کے لئے طرح طرح سے خواب دیکھتی ہیں، اس کی نئی زندگی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔

''کبھی آپ سے شکوہ نہیں کیا میں نے اللہ کیونکہ مجھے ہمیشہ یہی لگا کہ شکوہ کرنے کا حق نہیں ہوتا انسان کے پاس......'' چادر اس نے ایک طرف ڈالی اور آنسو پونچھے۔

''آپ نے اسے اتنا نوازا ہوتا ہے کہ اس کا شکوہ کرنا بنتا ہی نہیں ہے۔'' وہ رو رو کر اپنے ہی آنسو آستین سے مٹا رہی تھی۔

''لیکن بس ایک بات پوچھنا ہے مجھے......'' سسکتے ہوئے اس نے اوپر کی طرف دیکھا۔

''بس ایک بات پوچھنا ہے، شکوہ نہیں کرنا بس کچھ پوچھنا ہے......'' اس نے تیزی سے بہتے آنسوؤں کو صاف کیا۔

''کیا میں ایک بری لڑکی ہوں اللہ جی کہ جس انسان کو چاہا اس نے مجھے دو کوڑی کا کر دیا اور جس سے نکاح کیا اس نے مجھے زمین تلے پہنچا دیا۔'' اس نے زمین پہ پڑے کاغذ کو دیکھا جس پہ بڑا بڑا طلاق لکھا تھا۔

''شکوہ نہیں کر رہی...... قسم سے شکوہ نہیں کر رہی...... بس میں تو اپنے اوپر سوال اٹھا رہی ہوں کہ کیا میں واقعی اتنی بری لڑکی ہوں کہ کوئی بھی مرد مجھے تھوک دینا پسند کرتا ہے۔'' ایک برا جملہ اس نے خود کے لئے کہا تھا۔ وہ اس سے برا جملہ کہنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو اتنا کوسنا چاہتی تھی، طعنے دینا چاہتی تھی، لعنت ملامت کرنا چاہتی تھی کہ کیا ہی کسی نے کی ہوگی۔ یہ اس کا خود سے انتقام تھا اور اس وقت وہ جتنا منفی ہو سکتی تھی، ہو رہی تھی۔

''بری میں ہی ہوں نا تبھی تو بار بار میں دھتکاری جاتی ہوں...... کمی مجھ میں ہی ہوگی نا تبھی تو...... '' اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

''تبھی تو اللہ مجھے کوئی راس نہیں آتا......'' اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی کے کچھ تلخ لمحے، کچھ پل کو ہی سہی لیکن آپ کو بھی تلخ بنا ہی دیتے ہیں......

''بس اتنا بتا دیں مجھ میں کیا برا ہے اللہ......؟ میری لگن اور آگے بڑھنے کا جنون یا میری خودداری......؟ میں انہی باتوں پہ تو دھتکاری گئی ہوں نا...... کیا یہ سب برا ہے اللہ......؟ کیا میں اسی

وجہ سے بری ہوں بس اتنا بتا دیں۔"

اس نے روتے ہوئے، اوپر دیکھتے ہوئے اپنے خالق سے سوال کیا۔ خالق کی طرف سے جواب نہ ملے یہ ہو نہیں سکتا، بس جواب ملنے میں وقت لگ جایا کرتا ہے۔

اگلے دو دن تک وہ اپنے کمرے تک محدود رہی۔ وہ اپنی منفی سوچوں کے ساتھ جنگ کر رہی تھی۔ اسے اپنے دکھ کو قبول کر کے اس کے ساتھ جینے کے لئے خود کو تیار کرنا تھا اور اس سب کے لئے اسے تنہائی چاہیے تھی۔

ابا کے ساتھ امی بھی کتنی بار اس کا دروازہ بجا بجا کر جا چکی تھیں لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا...... کسی سے بات نہیں کی...... کچھ کھانے کی طلب نہیں ہوئی...... پانی جو بوتل میں تھوڑا بہت پڑا تھا وہی پی کر گزارا کر لیا۔۔ وہ اپنا سیاہ پڑتا چہرہ کسی کو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ اسی لئے وہ نہ کمرے سے نکلی نہ ہی ہسپتال گئی۔ وہاں اس نے فون کر دیا تھا کہ وہ بہت سخت بیمار ہے اس لئے نہیں آ سکتی۔

اور تیسرے دن اس کے کمرے کی کنڈی کھلی۔ وہ باہر نکلی تو اخبار پڑھتے ابا نے اخبار ایک طرف رکھ کر اسے دیکھا...... باورچی خانے میں کچھ تلتی ہوئی امی نے ہاتھ میں کفگیر تھامے کھڑکی سے اسے جھانکا...... شکر تھا کہ بھابھی بھائی اپنے اپنے کاموں پہ جا چکے تھے ورنہ وہ بھی اسے ایسے ہی حیرت سے تکتے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہے۔

"جب لڑکیوں کو طلاق ہو جاتی ہے تو کیا وہ پھَل پھیری بن جاتی ہیں۔۔۔؟" وہ ابا کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا لہجہ بالکل معمول کی طرح سادہ تھا۔ کہیں دکھ کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ اس نے اس دکھ کو قبول کر کے، زندگی جینے کے لئے خود کو منا لیا تھا۔

"نہیں بیٹا...... ایسی کوئی بات نہیں ہوتی۔" ابا زخمی سا مسکرائے لیکن انہیں اس کا معمول کا لہجہ اچھا لگا تھا۔ بہت کم وقت میں اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"تو آپ اور امی مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں جیسے میں کوئی خلائی مخلوق ہوں۔" امی نے جلدی سے واپس چولہے کا رخ کیا۔ ابا نے بھی اخبار اٹھا لیا اور اسے پڑھنے کی اداکاری کرنے لگے۔ وہ

اس پہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کہیں کچھ نہیں ہوا۔

''ابا......'' انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

''زندگی ختم نہیں ہوگئی۔۔نہ ہی برباد ہوگئی ہے۔۔ایک باب بند ہوا ہے اور کئی باب ہیں جو ابھی باقی ہیں۔میں ان تمام بابوں کو ٹھیک طرح سے جینے کے لئے نارمل ہوں۔ان دودنوں میں بس میں نے اندر بند رہ کر خود کو یہی سکھایا ہے کہ مجھے اس سب کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔'' ابا نے داد طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

''اور آپ کیوں اس بات پہ پچھتا رہے ہیں کہ آپ نے میری زندگی برباد کی ہے۔آپ نے کچھ نہیں کیا۔اس کا اور میرا نصیب نہیں جڑا تھا اسی لئے ٹوٹ گیا۔۔۔اور...... '' وہ ٹھہری، ابا کو دیکھا۔

''اور بس......'' ابا پھیکا سا مسکرائے۔

''تمہاری تربیت تمہاری ماں اور میں نے ایسی نہیں کی فاطمہ۔۔۔نجانے تم کہاں سے یہ سب سیکھ گئی ہو۔۔؟'' فاطمہ باپ کو دیکھے گئی۔

''سب سے بہترین تربیت زندگی ہی کرتی ہے ابا۔وہ کچھ سکھا دیتی ہے جو ماں باپ نہیں سکھا پاتے۔''

امی میز پہ ناشتہ دھر رہی تھیں۔ابا نے انہیں طلاق کی کیا وجہ بتائی، بتائی بھی کہ نہیں لیکن وہ اس سے نالاں نہیں دکھائی دیتی تھیں۔

بس ان کے چہرے پہ روایتی ماؤں والی فکر اور سوگ تھا جو یہ بتا تا تھا کہ اب ان کی بیٹی کا کیا ہو گا......؟ وہ انہیں اس فکر سے روک نہیں سکتی تھی۔جلد یا بدیر امی سمجھ جائیں گی وہ جانتی تھی۔ہم سب تکلیفوں میں چھپی مصلحتوں کو سمجھ جاتے ہیں، بس اس سب میں وقت لگتا ہے۔

چوتھے دن ہمدان اس سے ملنے آیا تھا۔وہ کمرے میں تھی جب امی نے اسے بتایا۔

''ہمدان آیا ہے تم سے ملنے۔'' وہ چونکی۔

''دانی......؟''

امی کو ذرا غصہ تھا جو ان کے چہرے سے دکھائی دے رہا تھا۔

''اندر بلاؤں یا نہیں......؟''

''آپ نے ابھی تک اسے اندر نہیں بلوایا......؟'' اس نے ہاتھ میں تھامی کتاب جلدی سے ایک طرف رکھی اور اپنا دوپٹہ اوڑھنے لگی۔

''کیا اب بھی اسے اندر بلانا بنتا ہے......؟''

''امی اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے اور آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں میں کینہ رکھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ویسے بھی وہ اس رشتے سے پہلے بھی اس گھر میں آتا تھا اور اب بھی جب جی کرے گا آئے گا۔ پلیز اسے اندر بلائیں۔'' وہ جلدی سے اپنے کھلے بال باندھنے لگی۔ امی ناگوار تاثرات کے ساتھ پلٹ گئیں۔

لاؤنج میں آئی تو اس نے چادر سے خود کو چھپا رکھا تھا۔ امی نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ اس کے سامنے منہ سر کھول کر نہیں بیٹھے گی۔ وہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئی۔ ہمدان نے سلام نہیں کیا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اسے دیکھا تک نہیں۔ سر اٹھاتا تو دیکھتا نا۔

اس کا چہرہ سخت سوجا ہوا اور لال پڑ رہا تھا۔ غصہ تھا، پچھتاوا تھا، شرمندگی تھی یا نجانے کیا تھا وہ جب سے آیا تھا اس کے سامنے بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے ماتھے کی رگیں باہر کو ابھری ہوئی تھیں۔ خاموش بیٹھا اپنی پینٹ کی سطح پہ بنے نمونے کو انگلی سے کھرچ رہا تھا۔ فاطمہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''اس (گالی) کو گولی ماردوں گا میں۔'' وہ بولا تو فاطمہ کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔ اس نے کبھی ہمدان کو ایسے گالی دیتے نہیں دیکھا تھا۔

''اس کی ہمت کیسے ہوئی آپ کو......'' وہ بات مکمل نہیں کر سکا۔ غصے سے اس کے جبڑے بھنچ گئے۔

''دانی......'' فاطمہ نے اسے ٹوکا۔ جو بھی تھا شمشاد اس کا چاچو تھا۔ وہ اپنے چاچو کے لئے ایسے نہیں کہہ سکتا تھا۔ ادب لحاظ بھی کوئی شے ہوتی ہے۔

''کیا دانی......؟ وہاں دوبئی میں بیٹھا عیاشیاں کر رہا ہے۔ یہاں آئے تو زندہ واپس نہیں جا سکے گا۔''

''دانی......'' فاطمہ اس بار چلا اٹھی۔

ہمدان نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور آنکھیں زور کی میچ لیں۔ وہ گہرے گہرے سانس باہر نکالنے لگا۔ اس کا غصے سے برا حال تھا یہ فاطمہ دیکھ رہی تھی لیکن وہ اتنا غصے میں تھا کہ فاطمہ کو اس سے ڈر لگ رہا تھا۔

''دادی، تایا سب ان کی حمایت میں بول رہے ہیں کہ اس نے ٹھیک کیا ہے...... کیا ٹھیک کیا ہے؟ اپنی عزت کو بے عزت کر کے ٹھیک کیا ہے اس نے......؟'' اس نے اب تک ایک بار بھی فاطمہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

فاطمہ خاموش رہی۔ اس کے گھر والوں نے اسے ہی درست کہنا تھا۔ یہ کوئی ایسے اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

''میں گھر نہیں جاؤں گا...... میں ان لوگوں کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا جو اس (گالی) کو سپورٹ کر رہے ہیں۔''

''دانی پلیز......'' فاطمہ نے اب کی بار ذرا نرمی سے کہا۔

''میں سچ میں پاگل ہو رہا ہوں یہ سوچ سوچ کر کہ انہوں نے یہ کیا کر دیا......؟ وہ تو آپ کو پسند کرتے تھے نا۔ اتنا لڑ جھگڑ کر دادی سے یہ رشتہ جوڑا تھا پھر کیوں آخر......؟''

مٹھی بنا کر اس نے میز پہ دھڑ سے ماری تو فاطمہ کا تراہ نکل گیا۔ پہلی بار اس نے ہمدان کا یہ روپ دیکھا تھا جو بالکل الگ تھا۔ وہ اتنا غصے والا بھی ہو سکتا ہے اسے نہیں پتا تھا۔

وہ اٹھ کر اس کے برابر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے پیارے سے دوست کو سمجھانا تھا جو اس کے دکھ میں پاگل ہو رہا تھا۔

''ہمدان میری بات دھیان سے سنو۔ مجھے نہیں پتا کہ تم یہ سمجھ سکو گے یا نہیں لیکن اب تم اتنے چھوٹے نہیں ہو تو مجھے لگتا ہے کہ تم حالات کو سمجھ سکتے ہو...... دیکھو اس نے یہی کرنا تھا کیونکہ ہم دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ یہ سب ابھی نہ ختم ہوتا تو شاید کچھ عرصے بعد ختم ہو جاتا۔ ابھی ختم

ہونے سے میں یہ فائدہ ہوا ہے کہ میں زیادہ نقصان سے بچ گئی ہوں۔ رخصتی کے بعد وہ مجھے چھوڑتا تو تکلیف بھی زیادہ ہوتی اور نقصان بھی۔'' ہمدان نے تاسف سے سر ادھر ادھر ہلایا۔ وہ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔

''وہ چھوڑتا ہی کیوں آپ کو مس......؟ کوئی آپ کو چھوڑ بھی کیسے سکتا ہے مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔'' دو دن کمرے میں بند وہ اللہ سے کہتی رہی کہ وہ بہت بری ہے اسی لئے اس کے ساتھ یہ ہوا ہے اور اب اس کے سامنے بیٹھا وہ چھوٹا لڑکا جو نجانے کب اتنا بڑا ہو گیا، اسے جو کہہ رہا تھا وہ بالکل خاموش رہ گئی۔

''انسان کی پسند اس کی انا کے سامنے ہار جاتی ہے دانی...... اور مرد کو اپنی انا بہت پیاری ہوتی ہے۔ مرد کبھی ایسی عورت کے ساتھ زیادہ وقت نہیں چل سکتا جو اس سے زیادہ پڑھی لکھی ہو، اپنے حق کے لئے کھڑی ہوتی ہو، اپنی عزتِ نفس کو مقدم سمجھتی ہو اور میں ایسی ہی لڑکی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ میں اس کی پسند کے مطابق نہیں ڈھل سکتی تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ اسے لگتا تھا کہ میں اچھی بیوی نہیں بن سکتی کیونکہ میں پڑھی لکھی اور ڈاکٹر ہوں تو اسے خوش نہیں رکھ سکتی اسی لئے، بس اسی لئے اس نے چھوڑ دیا۔''

وہ اس وقت اس کا دل اپنے گھر والوں سے برا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ غصے میں کوئی بڑا اقدام اٹھائے۔ کچھ بھی الٹا سیدھا کر لے جو سب کے لئے مسائل پیدا کرے۔

ہمدان نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔

''چاچو نے آپ کو اس لئے چھوڑا کہ آپ پڑھی لکھی تھیں۔ ڈاکٹر تھیں......؟'' فاطمہ خاموش رہی۔

''آپ کتنی بے وقوف ہیں مس۔'' فاطمہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''اس میں بے وقوفی والی کیا بات ہے......؟ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں آگے مزید پڑھوں یا نوکری کروں۔ اسے میں ڈاکٹر تو قبول تھی لیکن گھر پہ بیٹھی ہوئی ڈاکٹر۔۔۔ جو مجھے قبول نہیں تھا۔''

ہمدان نے تاسف سے سر ہلایا۔

''آپ سچ میں کتنی سادہ ہیں مس...... مجھے آپ کے لئے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ آپ سمجھ ہی نہیں سکیں وہ کیا کر گیا ہے آپ کے ساتھ۔'' فاطمہ نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ کچھ تھا جو اسے

نہیں پتا تھا۔ کچھ ایسا جو ہمدان جانتا تھا بلکہ اس کا پورا خاندان جانتا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی۔

''جو کچھ آپ کہہ رہی ہیں اگر اس نے آپ سے یہ سب کہا ہے تو اس نے آپ کو بے وقوف بنایا ہے۔''

فاطمہ کی آنکھوں میں اب الجھن تیرنے لگی تھی۔

''اس نے وہاں کل شادی کر لی ہے۔'' فاطمہ کا رنگ سیاہ پڑا۔۔۔۔۔۔شادی۔۔۔۔۔۔ اس ایک لفظ نے اس کا اعتماد ڈگمگا دیا۔

مطلب کہ ابھی ہفتہ نہیں گزرا تھا اس کی طلاق کو اور اس نے شادی بھی کر لی۔ وہ اتنی جلدی آگے بڑھ گیا۔ اتنی جلدی سب بھول گیا۔۔۔۔۔۔ لیکن کوئی اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ نہیں لیا کرتا۔ اتنی تیزی سے گھر ٹوٹ جانے، رشتہ ٹوٹ جانے جیسے صدمے سے نہیں گزر جایا کرتا۔ اس کی تو پسند نہیں تھی تو بھی اسے سنبھلنے میں دو دن تو لگے تھے اور وہ اتنی جلدی سنبھل گیا تھا جس کی اس رشتے میں پسند شامل تھی۔۔۔۔۔۔ ناممکن۔۔۔۔۔۔

''اور وہ بھی ایک ڈاکٹر سے۔'' اس کے سر پہ جیسے ایک بھاری وزنی شے آکر ٹکرائی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ نظروں کے سامنے سب دھندلا گیا۔

''اگر اسے گھر بیٹھی ڈاکٹر قبول نہ ہوتی تو ایک ڈاکٹر سے ہی شادی کیوں کرتا۔۔۔۔۔۔؟ اس نے بس آپ کو نیچا دکھایا ہے۔ وہ اور کسی طریقے سے آپ کو نیچے نہیں جھکا سکا تو یہ اوچھا کام کیا ہے۔۔۔۔۔۔''

فاطمہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

''اس کا شاید پہلے سے ہی اس ڈاکٹر کے ساتھ افیئر تھا ورنہ کوئی اتنی جلدی کیسے دوسری شادی کر سکتا ہے۔''

اس سے زیادہ اس سے سنا نہیں گیا۔ وہ وہاں سے اٹھی اور ڈگمگاتے قدموں سے چلتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ہمدان نے بھینچے لبوں سے اسے جاتے دیکھا۔

زندگی میں کبھی اتنا تاریک چہرہ، شکستہ قدم، مایوس آنکھیں اس نے نہیں دیکھی تھیں۔

''تم یہاں آئے نا تو مجھے مس کی قسم میں تمہیں گولی مار دوں گا۔'' اس نے موبائل نکال کر اسی

وقت شمشاد کو میسج کیا تھا۔

اگلے دو دن اسے اس صدمے سے نکلنے میں لگے تھے کہ شمشاد نے اسے چھوڑ کر شادی کی بھی تو ایک ڈاکٹر سے..... تو یہ طے تھا کہ شمشاد نے اسے اس لئے نہیں چھوڑا تھا کہ وہ پڑھی لکھی ڈاکٹر تھی...... گھر نہیں سنبھال سکتی تھی...... بلکہ وہ پہلے سے کسی اور کا گرویدہ ہو چکا تھا اسی لئے اسے چھوڑنا ضروری تھا

''ہمدان ٹھیک کہتا ہے کہ میں بہت سادہ اور معصوم ہوں...... '' اس نے کئی بار شمشاد کو کال ملا کر کاٹ دی۔ اب اس سے کیا بات کرنا جب وہ اسے اپنی زندگی سے الگ کر چکا تھا۔

''بلکہ میں بے وقوف ہوں۔'' اس نے فوراً تصحیح کی۔

صدمہ کتنا ہی بڑا کیوں نا لگے، اس کے اثر سے جلد از جلد نکلنا ذہنی صحت کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس نے بھی خود کو اس دوہرے صدمے سے نکالا اور دو دن بعد پھر سے ہسپتال جانے لگی۔ زندگی کچھ معمول پہ آنے لگی تھی۔ اس نے آگے مزید پڑھنے کا ارادہ کر لیا اور خود کو مصروف کر لیا تا کہ کم سے کم سوچ سکے۔

''آگے کا کیا سوچا ہے تم نے......؟'' امی اس دن اس کے کمرے میں اس کے دھلے ہوئے کپڑے الماری میں رکھنے آئیں تو اسے پڑھتے دیکھ کر پوچھا۔

''پیپر ز دوں گی۔ وہ کلیئر ہوں گے تو دیکھوں گی۔''

''میں پڑھائی کی بات نہیں کر رہی۔'' وہ امی سے نظریں چرا گئی۔

''جو آپ پوچھ رہی ہیں اس کا میں نہیں سوچنا چاہتی۔''

''کیوں نہیں سوچنا چاہتی۔ کیا اسی طرح بیٹھی رہو گی۔۔؟ پتا بھی ہے وہ شمشاد تو کب کی شادی کر چکا ہے۔ مجھے صالحہ باجی سے پتا چلا۔ بتا رہی تھیں کہ ہمدان نے گھر میں بہت ہنگامہ کیا تھا۔ ممتاز نے سختی سے شمشاد کو کہہ دیا ہے کہ وہ پاکستان نہ آئے ورنہ ہمدان کا کچھ پتا نہیں ہے کہ کیا کر گزرے۔''

فاطمہ نے گہرا سانس لیا۔

''جانتی ہوں۔ وہ ٹاپک کلوز ہو چکا ہے امی۔ اس کا نام مت لیا کریں۔''

''میری طرف سے جہنم میں جائے۔ میں کیوں لینے لگی اس کا نام۔ صرف بتا رہی ہوں کہ وہ

کب کی شادی کر چکا اور تم کب تک بیٹھے رہنے کا ارادہ رکھتی ہو......؟''

''ابھی صرف پڑھائی کا سوچا ہے۔ جب کچھ وقت گزرے گا تو اس بارے میں بھی سوچ لوں گی۔''

''وقت گزر جانے سے پہلے سوچ لو تو اچھا ہے۔''

اس نے امی کی طرف دیکھا۔

''وقت سے زیادہ انسان کا مقدر ہوتا ہے امی۔ نکاح تو آپ نے میرا ابھی وقت سے کر دیا لیکن مقدر نہیں تھا تو ختم ہو گیا۔'' امی کچھ بول نہیں سکیں۔

ہمدان کبھی کبھار ملنے آتا تھا اس سے لیکن پہلے سے بہت خاموش ہو گیا تھا۔ بس سر جھکا کر بیٹھا رہتا۔ کچھ باتیں وہ پوچھتی تو جواب دے دیتا ورنہ زیادہ تر چپ ہی رہتا تھا۔

''ایسے مت کرو دانی۔ طوطے بولتے ہوئے پیارے لگتے ہیں۔'' اسے بچپن کا چھوٹا سا ہمدان اب تک یاد تھا۔

''زبان کاٹ دی ہے کسی صیاد نے میری۔ اور پتا ہے جب اس کٹی زبان سے گھر میں چلتا پھرتا ہوں تو سب کے دل کٹ جاتے ہیں اور میرا دل جڑ جاتا ہے۔'' فاطمہ کو دکھ ہوتا۔ وہ اتنا سنجیدہ نہیں تھا جتنا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی سزا خود پہ لے کر، اپنے گھر والوں کو لوٹا رہا تھا۔ یہ اس کا بدلہ لینے کا عجب طریقہ تھا۔

''میں سنبھل گئی ہوں ہمدان...... تم کب سنبھلو گے......؟''

''جب آپ سچ مچ سنبھل جائیں گی تو ہمدان بھی سنبھل جائے گا۔''

اس کی بات کا مطلب وہ جانتی تھی۔

☆......☆......☆

اذکار جب سے ہوش میں آیا تھا بالکل خاموش اور گم صم تھا۔ اس نے نہ ہی کسی کی طرف دیکھا نہ بات کی حالاں کہ دانش اس کے پاس بیٹھا اس کے ہاتھوں کو تھپکتا، چومتا رہا...... اسے بار بار بلانے کی کوشش بھی کرتا رہا لیکن اس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھیں ایسی تھیں جن میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ وہ آنکھیں کہیں سے بھی کسی بچے کی آنکھیں نہیں تھیں۔ رطابہ نے ایسی کوئی کوشش

نہیں کی۔ وہ خود بالکل شاکڈ تھی، اس نے اذکار کی بیماری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے یقین تب تک نہیں آنا تھا جب تک ٹیسٹ کی رپورٹس نہ آ جاتیں۔

''بیٹا کچھ تو بولو...... ایسے چپ کیوں ہو......؟'' رطابہ نے اسی میں عافیت جانی تھی کہ وہ خاموش تھا۔ دانش اسے بلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن ناکام ہی اٹھ گیا۔

''اس کی ایسی حالت کیوں ہے جیسے شاک میں ہو۔۔۔؟'' کمرے سے باہر نکلتے ہی دانش نے رطابہ کا رستہ روکا۔ وہ کچھ ہچکچا کر، نظریں چراتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''میں نہیں جانتی۔''

''اس وقت تم اس کے ساتھ تھی نا جب وہ بے ہوش ہوا تھا......؟'' دانش اسے جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ رطابہ اس سے نظریں چرا رہی تھیں جو وہ صاف محسوس کر سکتا تھا۔

''مجھے سچ بتاؤ رطابہ، کچھ ہوا ہے......؟'' رطابہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور ایک طرف سے نکل کر آگے چلی گئی۔ دانش وہیں کھڑا اس عورت کی ڈھٹائی پہ حیران رہ گیا۔

وہ واپس اندر اذکار کے پاس لوٹ گیا۔

شام تک فاطمہ بھی اس کے پاس ہسپتال پہنچ چکی تھی۔ اسے دانش نے ہی فون کر کے بتایا تھا۔

''تم کوشش کرو فاطمہ کہ وہ کوئی بات کرے۔ کچھ تو کہے۔ وہ تم سے اٹیچڈ ہے۔ تمہاری بات بہت سنتا ہے۔'' فاطمہ سر ہلاتی اس کے کمرے میں چلی گئی۔

''ذکی...... دیکھو خالہ آئی ہیں۔'' خالہ کی آواز پہ بند آنکھیں کھل گئیں اور فاطمہ کو دیکھتے ہی ان میں پانی بھر آیا۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگا تھا۔

''ذکی...... میرے بچے کیا ہوا......؟ ایسے کیوں رو رہے ہو......؟'' اس کے بستر پہ ٹکنے کے سے انداز میں وہ بیٹھ گئی اور اس کے بال سہلانے لگی۔ وہ کتنی دیر روتا رہا۔

''جانی...... خالہ کو تو بتا دو...... ہم تو بیسٹ فرینڈز ہیں نا۔ کچھ ہوا ہے تو خالہ سے شیئر کرو۔''

اس نے اذکار کے آنسو پونچھے اور اس کے گال تھپکنے لگی۔

کچھ دیر تک وہ خاموش ہو گیا اور جو کچھ بھی ہوا تھا اس نے روتے ہوئے سب فاطمہ کو بتا دیا۔
فاطمہ کسی بت کی طرح بیٹھی سب سنتی رہی۔ اس کی بہن، اپنے ہی بچے کے ساتھ، گھر کے پرانے ملازم کے ساتھ، اتنا گھناؤنا کھیل کھیل چکی تھی۔ اس نے اپنے بچے کی ذہنی حالت تک کی پرواہ نہیں کی کہ اس معصوم پہ کیا بیتے گی۔

"it was not a bad touch khala" کچھ عرصے پہلے ہی جب وہ رہنے آیا تھا تو فاطمہ نے ہی اسے good bad touch کا بتایا تھا کہ وہ اب بڑا ہو رہا تھا۔ اس دور میں بچوں کی حفاظت کے لئے انہیں اتنا پتا ہونا چاہئے کہ انہیں کس انسان سے کیسے ملنا اور پیش آنا ہے۔ کس کے قریب رہنا اور کس سے دور جانا ہے...... اور اذکار کو یہ سب فاطمہ نے بہت طریقے سے سمجھایا تھا۔ جو باتیں والدین کے سمجھانے کی تھیں وہ اکثر فاطمہ اسے سمجھا دیتی کہ وہ یہ بات بخوبی جانتی تھی کہ رطابہ کے پاس اولاد کے لئے وقت ہی کہاں ہوتا ہے۔

"baba is just like grandfather" وہ پھر سے رونے لگا تھا۔ فاطمہ نے اسے ساتھ لگا لیا۔ یہ سب وہ سمجھتی تھی تو کیا رطابہ نہیں سمجھتی ہو گی۔ اپنی بہن کی ذہنیت سے بھی وہ واقف تھی۔ اس نے یقیناً یہ سب کسی اور مقصد سے کیا تھا۔

"بابا کو ماما نے گھر سے نکال دیا۔ پتا نہیں وہ کہاں گئے ہوں گے خالہ۔۔؟"

"ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے تم پریشان مت ہو۔ وہ کہیں نہیں جاتے۔ اور یہ رونا بالکل بند کرو۔ رونے سے اور طبیعت خراب ہو جائے گی۔" وہ اس کے پاس بیٹھی کتنی دیر اسے تھپکتی رہی حتی کہ وہ سو گیا۔

جب وہ باہر نکلی تو کاریڈور میں دانش نہیں تھا۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑی رہی پھر اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی جب اسے دور سے رطابہ آتی دکھائی دی جو کسی ڈاکٹر سے بات کر رہی تھی۔ رطابہ نے اسے دیکھا تو دور سے رکنے کا اشارہ کیا۔ فاطمہ کو چار و ناچار رکنا پڑا۔ وہ ڈاکٹر سے فارغ ہو کر سیدھا اس کے پاس آئی تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو......؟" اس کے ماتھے کی شکنیں دور سے بھی فاطمہ کو دکھائی دے گئی تھیں۔ اسے یقیناً اس کا یہاں آنا برا لگا تھا۔

"میں ذکی کو دیکھنے آئی تھی۔ لیکن جو کچھ اس سے پتا چلا یقین نہیں آیا مجھے۔ کوئی اپنی اولاد کے سامنے بھی ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتا ہے۔ کم از کم اس بات کا ہی خیال کر لیتی کہ اس بچے پہ کیا گزرے گی۔"

رطابہ نے دانت پیستے ہوئے اسے دیکھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ اذکار فاطمہ کے سامنے منہ کھول دے گا۔

"نجانے آپ کب سمجھیں گی باجی کہ اللہ نے آپ کو کتنا نوازا ہوا ہے اور آپ اس کی دی گئی نعمتوں کے ساتھ کیا کر رہی ہیں۔ آپ سے بڑی ناشکری عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔۔"

"میں جو بھی کروں وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔۔"

"میرا مسئلہ میرا بھانجا ہے جو مجھے بہت پیارا ہے۔"

"وہ سب سے پہلا میرا بیٹا ہے۔ اور اس کا اچھا برا میں سمجھتی ہوں۔"

"بدقسمتی ہے کہ وہ آپ کا بیٹا ہے کیونکہ آپ سے زیادہ اس کے ساتھ برا کوئی کر بھی نہیں سکتا۔"

رطابہ کا چہرہ لال پڑا۔

"شٹ اپ...... اینڈ گیٹ لاسٹ...... اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ اٹھ جائے اور یہاں تماشا کھڑا ہو جائے۔" وہ یہ تماشا کھڑا کر بھی دیتی جو وہ ایک پروفیشنل پلیس نہ ہوتی تو......

فاطمہ اسے تاسف سے دیکھتے ہوئے ایک طرف سے نکل کر باہر کی طرف چلی گئی۔

"ڈاکٹر رطابہ......" وہ اسے مٹھیاں، لب بھینچے، جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی جب پیچھے سے کسی نے اسے پکارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو ہسپتال کے سی ای او کی بیگم کھڑی تھی...... ڈاکٹر ریچل، جو اس وقت ہسپتال کا راؤنڈ لے رہی تھی۔ رطابہ کو وہ لڑکی زیادہ پسند نہیں تھی لیکن اسے برداشت کرنا اس کی مجبوری تھی۔

"یہ لڑکی...... آئی مین آپ اسے جانتی ہیں؟"

"شی از مائی سسٹر......"

"آئینور فاطمہ گل از یور سسٹر......؟" رطابہ چونکی۔

''آپ اسے کیسے جانتی ہیں۔۔؟''

''شی واز مائی کلاس میٹ......''

''اوہ۔۔ریئلی۔'' رطابہ نے ہونٹ سکوڑے۔ پھر زبردستی مسکرادی۔

ریچل اس سے اذکار کے بارے میں پوچھنے لگی۔

''ٹیسٹ یقیناً نارمل آئیں گے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ میرا بیٹا ہارٹ پرابلم کا شکار ہو اور مجھے ہی نہ پتا ہو۔ ڈاکٹر منصور کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر ریچل جانتی تھی کہ ڈاکٹر رطابہ کو اپنی پروفیشنل سکلز پہ کتنا گھمنڈ ہے۔ اس لئے اس نے مسکرا کر بس اتنا ہی کہا۔

''آئی وش......'' رطابہ کھل کر مسکرادی جیسے اسے خود پہ بہت بھروسہ ہو۔

''آئینور کی شادی تو ہوگئی ہوگی......؟؟ کالج میں تھے تو نکاح ہوا تھا۔''

رطابہ طنزیہ مسکرائی۔

''اسے ڈائیورس ہوگئی تھی۔'' ریچل کچھ شاکڈ سی اسے دیکھنے لگی۔

''ڈائیورس......''

''اس کے بعد اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ابھی تک تو بیچلرز لائف ہی انجوائے کررہی ہے۔''

''آئی ایم سوری......'' ریچل شرمندہ سی دکھائی دینے لگی۔ لیکن رطابہ کے لب و لہجے میں بہن کے لئے کسی قسم کا دکھ نہیں تھا۔

''ویل یہ اس کا اپنا فیصلہ ہے۔ ہم کیا کرسکتے ہیں......؟'' رطابہ نے شانے اچکائے۔ تبھی اس کا موبائل بجنے لگا۔ ڈاکٹر منصور کی کال آرہی تھی۔ وہ ریچل سے معذرت خواہانہ انداز میں اجازت لے کر ایک طرف چلی گئی۔

ریچل کی آنکھوں میں پشیمانی اور پچھتاوا ابھرا تھا۔ تبھی اس نے موبائل نکالا اور اپنے کانٹیکٹ نمبر سے ایک نمبر پہ کال ملانے لگی۔ وہ نمبر اس کے موبائل میں ایس عباد کے نام سے محفوظ تھا۔

☆......☆......☆

دانش کچھ دیر کے لئے گھر آیا تھا۔ کرنل پاپا اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ انہوں نے فون کر کے ہی اذکار کی طبیعت پوچھ لی تھی۔ ان کا ارادہ رات میں ہسپتال کا چکر لگانے کا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔

''عابدہ...... اذکار کے لئے دلیہ بنا دو۔''

عابدہ کچن میں تھی جب دانش نے کچن میں جھانکا۔

''ذکی بابا ٹھیک ہیں اب......؟''

''دعا کرو۔'' اس کے چہرے پہ پریشانی صاف واضح تھی۔

''زیور بابا کہاں ہیں......؟'' یونہی دانش کو خیال آیا کہ ان سے دعا کا بولے۔ وہ ہمیشہ جب پریشان ہوتا انہیں دعا کے لئے کہا کرتا۔ عابدہ کا رنگ پھیکا پڑا۔

''معلوم نہیں۔ لیکن وہ گھر پہ نہیں ہیں۔۔'' دانش چونکا۔ زیور بابا مغرب کے بعد اکیلے گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ کبھی ضروری کام سے نکلنا ہوتا بھی تھا تو ڈرائیور انہیں لے کر جاتا تھا۔

دانش نے بغور عابدہ کو دیکھا جس کی اڑی ہوئی رنگت سے وہ کافی کچھ جان گیا تھا۔

''کل یہاں کیا ہوا تھا عابدہ......؟'' عابدہ شش و پنج میں تھی کہ جو کچھ بھی ہوا وہ بتائے یا نہیں۔ پھر اس نے نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

''میں نہیں جانتی چھوٹے صاحب۔۔'' وہ اسے گھور کر دیکھتا رہا۔

''ظالم اس لئے ظالم ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مظلوم کبھی نہیں بولے گا۔ وہ ڈرتا رہے گا اور ظلم سہتا رہے گا اور اس طرح ظالم کی پکڑ کبھی نہیں ہو گی۔'' عابدہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دانش کی نگاہوں سے جو تحریر پڑھنے کو ملی تھی وہ یہی تھی کہ وہ جانتا ہے جو کچھ ہوا ہے بس تفصیل سننا چاہتا ہے۔

''ایسے میں ظالم کو سزا سنانے سے پہلے مظلوم کو کوڑے مارنے چاہیں جو ظالم کی پشت پناہی کرتا ہے۔''

عابدہ نے سر جھکا لیا۔ یہ طے تھا کہ وہ منہ نہیں کھولے گی۔ اسے زیور بابا سے کیا وعدہ یاد تھا۔ وہ وعدہ خلافی نہیں کر سکتی تھی لیکن وہ جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہتی تھی۔

''میں کسی سے کیئے وعدے کی پابند ہوں صاحب...... بہتر ہوگا کہ آپ ذکی بابا سے پوچھ لیں۔''

دانش نے گہرا سانس لیا۔

''وہ صدمے میں ہے۔ کچھ نہیں بول رہا۔'' عابدہ کا اترا چہرہ مزید اتر گیا۔

''نجانے زیور بابا کہاں گئے ہوں گے۔۔۔؟'' وہ پریشانی سے باہر نکلا تو عابدہ انہیں روکنے کے لئے آگے بڑھی پھر یک دم خاموش ہوگئی۔ اسے یہ راز راز ہی رکھنا چاہیے تھا۔

رات کھانے سے پہلے دانش ہسپتال کے لئے نکل رہا تھا تب فاطمہ گھر آئی تھی۔

''کیا میں زیور بابا سے مل سکتی ہوں......؟'' دانش اسے باہر ڈرائیو وے پہ مل گیا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا جب گیٹ سے وہ اندر آئی تو اسے دیکھ کر اتر گیا۔

''وہ یہاں نہیں ہیں۔ تمہاری اس کمینی بہن نے نجانے یہاں کیا تماشا کیا ہے کہ زیور بابا غائب ہیں اور ذکی ہسپتال میں پڑا ہے۔۔'' فاطمہ کا سر بہن کی وجہ سے شرمندگی سے جھک گیا۔

''ذکی نے کچھ بتایا......؟'' فاطمہ خاموش رہی۔ وہ جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی اور سچ اس گھر کو جلا سکتا تھا۔ اسے اس گھر کے بچوں کا خیال تھا اسی لئے اسے چپ رہنا پڑا۔

''کہاں مل سکتے ہیں بابا......؟'' دانش نے شانے اچکائے۔

''مجھے پتا ہوتا تو انہیں واپس نہ لے آتا...... اس وقت میں اتنا پریشان ہوں کہ سمجھ نہیں آرہا انہیں ڈھونڈوں یا ذکی کے پاس جاؤں۔''

''آپ ہاسپٹل جائیں۔ میں یہاں دیکھتی ہوں۔'' وہ انہیں بھیج کر خود اندر چلی گئی۔ کچن میں عابدہ کھانا بنا رہی تھی۔ فاطمہ نے اسے سلام کیا۔ حال احوال پوچھا۔

''آپ جانتی ہیں نا کہ زیور بابا کہاں ہیں......؟'' عابدہ نظریں چرا گئی۔ فاطمہ ہولے سے مسکرا دی۔ اس نے یونہی ہوا میں تیر چلایا تھا جو ٹھیک جگہ لگا تھا۔

''ذکی کا واسطہ دے رہی ہوں آپ کو کہ مجھے بتائیں وہ کہاں ہیں...... ؟ ذکی اس وقت بری حالت میں ہے...... ہمیں زیور بابا کو اس سے ملوانا ہوگا ورنہ وہ ٹھیک نہیں ہو پائے گا۔'' عابدہ چونکی۔

''کیا ہوا ہے ذکی بابا کو......؟'' فاطمہ خاموش رہی۔

''ڈاکٹرز کو لگتا ہے کہ اس کے دل میں سوراخ ہے۔اب ٹیسٹ سے ہی کنفرم ہوگا۔'' عابدہ نے دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

''میں سب جانتی ہوں جو کچھ بھی یہاں ہوا ہے عابدہ۔ وہ مجھے سب بتا چکا ہے کہ باجی نے کیا کیا ہے۔ میں اپنی بہن کی ان حرکتوں کی وجہ سے بس شرمندہ ہی ہو سکتی ہوں۔اس وقت مجھے اذکار کی فکر ہے۔آپ مجھے بابا کا بتا دیں گی تو یہ مشکل کافی کم ہو جائے گی۔۔۔اگر کچھ بھی جانتی ہیں تو پلیز اس بچے کے لئے بابا کا بتا دیں۔ بابا کا ذکی سے ملنا ضروری ہے ورنہ وہ اس صدمے سے نہیں سنبھل پائے گا۔'' فاطمہ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور عابدہ کے سامنے باندھ دیے۔ کسی پیارے کے لئے ہاتھ جوڑنے میں کیا قباحت تھی۔

عابدہ نے جلدی سے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''نہیں باجی ایسے نہیں کریں۔ میں تو اس گھر کی ملازمہ ہوں اور آپ مالکوں میں سے ہیں۔ یوں ہاتھ مت جوڑیں۔ میں بتا دیتی ہوں صرف ذکی بابا کے خیال سے۔ بابا محفوظ ہیں۔ میں انہیں یہاں سے اپنے گھر لے گئی تھی۔ وہ وہیں ہیں اس وقت میرے شوہر اور بچوں کے ساتھ۔'' فاطمہ نے سکھ کا سانس لیا۔

''انہیں کل یہاں لے آئیں عابدہ۔ انہیں کہیں بھلے وہ گھر کے اندر نہ آئیں۔ باہر تک آ جائیں لیکن بس آ جائیں۔ انہیں بتائیے گا کہ ذکی بیمار ہے۔ اسے ان کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ ذکی ان سے مل لے گا تو اس کا یہ دکھ اور صدمہ کم ہوگا۔اس کی طبیعت میں بہتری آنے لگے گی۔ ہمیں اس کے علاج میں آسانی ہو جائے گی۔کل شاید وہ ڈسچارج ہو جائے لیکن اس سے پہلے بابا کا یہاں ہونا بہت ضروری ہے۔'' عابدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔اس نے سر ہلایا۔

فاطمہ پھیکا سا مسکرا دی۔

☆......☆......☆

اذکار کی رپورٹس ڈاکٹر منصور کی تشخیص کے مطابق ہی تھیں۔ فی الوقت اسے ادویات اور ہدایات دے کر گھر بھیجا جا رہا تھا لیکن آپریشن ہی آخری حل تھا۔ رطابہ چاہتی تھی کہ جو کام بعد میں ہونا ہے وہ جلد از جلد کر لیا جائے۔

رطابہ ہاتھ میں رپورٹس پکڑے بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی کہ اس کے بیٹے کو بھی دل کا مسئلہ ہو سکتا ہے، وہ جو خود ہارٹ سرجن تھی۔

"مجھے کیسے نہیں پتا چل سکا آخر۔۔؟" ڈاکٹر منصور اس کی کیفیت سمجھتے تھے۔ وہ ایک بے حد قابل ڈاکٹر تھی جس نے بہت ہی کم عمری میں بہت کامیابی سمیٹی تھی۔ انتہائی مشکل سرجریز کی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں اللہ نے بہت شفا بھی رکھی تھی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اپنی قابلیت کو لے کر کتنے پاگل پن کا شکار تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اپنے سے کئی سال سینئر ڈاکٹرز کے برابر کی قابلیت رکھتی ہے بھلے اس کا تجربہ ان سے کم ہی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے وہ زیادہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اور ان کے نزدیک یہی اس کی سب سے بڑی برائی تھی۔

قابلیت پہ گھمنڈ انسان کو بہت دیر تک کامیاب نہیں رہنے دیتا۔

"ڈاکٹر رطابہ ایک قابل استاد کی اولاد ہمیشہ قابل نہیں نکلتی...... عالم کے گھر جاہل پیدا ہو سکتا ہے...... پولیس کا بچہ بھی چوری کر سکتا ہے...... اسی طرح ڈاکٹر کا بچہ اسی بیماری کا شکار ہو جائے جس کا وہ ڈاکٹر ہے تو اس میں کیا اچنبھے کی بات ہے۔ آخر اتنی سی بات کو آپ کیوں قبول نہیں کر پا رہیں۔" لیکن یہ بات رطابہ کو سمجھ نہیں آ نا تھی۔

"ڈاکٹر مسیحا ہوتے ہیں رطابہ، خدا نہیں ہوتے کہ سب اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔ وہ علاج کرتے ہیں، صحت یاب نہیں کرتے۔ ان کی ایک حد ہوتی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ وہ انسان ہیں اور ان کا علم محدود ہے۔ اینڈ مائنڈ اٹ ڈاکٹر رطابہ کہ ہر علم والے پہ ایک علم والا ہوتا ہے...... اور سب سے بڑا علیم وہ ہے جو اوپر ہے۔ اس کے سامنے ہمارا علم کچھ نہیں ہے۔" ڈاکٹر منصور نے بہت نرمی سے اسے سمجھایا لیکن وہ بے یقینی سے بس انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

اذکار گھر پہنچا تو زیور بابا گیٹ کے باہر ہی گھاس پہ بیٹھے تھے۔ وہ صبح سے ہی اس کے منتظر تھے جب سے عابدہ نے انہیں بتایا تھا۔

وہ جلدی سے اتر کران کی طرف لپکا اور زور زور سے رونے لگا۔ گاڑی میں فاطمہ اور دانش ہی موجود تھے۔ رطابہ ہسپتال ہی رک گئی تھی۔ اسے اذکار کا کیس کچھ مزید سینئرز سرجن سے ڈسکس کرنا تھا۔

کبھی وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑتا اور کبھی ان کے گلے لگ جاتا۔ وہ ان سے ایک ہی بات کہے جا رہا تھا۔

''معاف کردیں بابا...... معاف کردیں ہمیں۔'' دانش اور فاطمہ کی آنکھیں اس بچے کی حالت دیکھ کر بھرا گئیں۔ نجانے وہ اندر

سے کس آگ میں جل رہا تھا۔ کس تکلیف سے گزر رہا تھا وہ بھی اس ہستی کی وجہ سے جو اولاد کے لئے دنیا میں سب سے اہم اور سکون کی ضامن ہوتی ہے۔۔۔ اس کی اپنی ماں۔

بابا بھی خاموشی سے آنسو بہا رہے تھے۔ اس کا سر تھپک رہے تھے، اس کے بندھے ہاتھوں کو بار بار کھول رہے تھے جنہیں وہ بارابار ان کے سامنے جوڑ کر معافی مانگنے لگ جاتا تھا۔ جب وہ ان کے گلے لگتا تو اس کا سر تھپک کر اسے پیچھے کرتے۔ جو والہانہ محبت وہ لٹایا کرتے تھے وہ مفقود تھی۔ رطابہ کے لگائے الزام نے انہیں تین دن میں بے حد اتنا محتاط کر دیا تھا کہ وہ اس کے قریب ہونے سے بھی جھجک رہے تھے۔ دانش نے اذکار کو پیچھے کیا۔

''اندر چلیں بابا۔'' بابا کرنٹ کھا کر پیچھے ہوئے۔

''نہیں بیٹا...... میں بس ذکی بابا سے ملنے آیا تھا۔ مل لیا تو تسلی ہوگئی۔''

''بابا یہ آپ کا گھر ہے۔ اندر چلیں پلیز۔۔''

''نہیں بابا۔۔۔ میں پھر آؤں گا۔ روز آؤں گا...... بلا ناغہ آؤں گا لیکن اندر نہیں جاؤں گا۔ میں دن رات بابا کے لئے دعا کروں گا مگر اندر نہیں جاؤں گا۔ میں جنت سے نکالا ہوا ہوں، اب واپس جنت نہیں جا سکتا۔'' وہ ہاتھ ہوا میں ہلاتے ہوئے تیزی سے پلٹے۔

''اندر نہیں جا سکتا میں بابا۔ اندر کبھی نہیں جا سکتا۔۔'' ہاتھ کو انکار کی صورت ہوا میں جھلاتے وہ تیزی سے دور ہوتے گئے۔

دانش ان کو آوازیں دیتا رہ گیا لیکن انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

''ایک عزتِ نفس ہی تو تھی اس انسان کے پاس وہ بھی نہیں چھوڑی اس عورت نے۔'' دانش بڑبڑایا۔

فاطمہ اذکار کو تھام کر اندر لے گئی۔

رات میں فاطمہ اذکار کو سلا کر جب چہل قدمی کے لئے باہر لان میں آئی تو رطابہ وہیں جھولے پہ بیٹھی تھی۔ وہ بالکل گم صم تھی۔ خون کی کشش تو بہرحال ہوتی ہی ہے اسی لئے فاطمہ کو بہن سے ہمدردی ہوئی۔

''ذکی ٹھیک ہو جائے گا باجی۔'' وہ خاموشی سے دبے قدم اس کے پاس چلی گئی۔ رطابہ نے چونک کر اسے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

''یہ بس آزمائش ہے اگر آپ سمجھیں تو۔'' رطابہ اسے دیکھتی رہی۔ فاطمہ کو لگا تھا کہ وہ چوٹ کھائے ہوئے ہے اسی لئے اسے سمجھانے کا یہی موقع مناسب ہے۔ پتھروں پہ زلزلے آئیں تو وہ شق ہو جاتے ہیں، گر جاتے ہیں۔ ایسا ہی رطابہ کے ساتھ ہوا تھا لیکن فاطمہ بس یہ بھول گئی تھی کہ کچھ دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں جنہیں حالات کے چھوٹے موٹے زلزلے اتنی آسانی سے شق نہیں کر پاتے۔

''ذکی بچہ ہے۔ بچے اللہ کے باغ کے پھول ہوتے ہیں۔ اللہ نے یہ تکلیف اسے نہیں دی۔ اللہ نے اس کے ذریعے یہ تکلیف آپ کو دی ہے تاکہ آپ سنبھل سکیں۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے نا کہ اس نے وقت سے بیماری کھول دی۔ دیر ہو جاتی تو نقصان ہو سکتا تھا۔ لیکن اس سب میں آپ کے لئے سبق ہے باجی کہ جو دے سکتا ہے وہ لے بھی سکتا ہے اور انسان اس مالک کے سامنے کچھ نہیں کر سکتا۔۔'' رطابہ بس اسے دیکھ رہی تھی لیکن اندھیرے میں اس کے چہرے پہ ناگوار تاثرات کو فاطمہ دیکھ نہیں سکی تھی ورنہ شاید آگے کچھ نہ کہتی۔

''آپ کو اللہ نے ہمیشہ عطا کیا ہے اور بہت آسانی سے عطا کیا ہے بلکہ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ جن لوگوں کو اللہ بنا مانگے دیتا ہے، آپ ان میں سے ایک ہیں...... کبھی آپ سے کچھ نہیں لیا، کسی مشکل اور پریشانی میں نہیں ڈالا۔ لیکن بدلے میں کبھی آپ نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ جو نعمتیں بھی آپ کو حاصل ہیں وہ

اللہ کی دین ہیں...... میڈیکل کی تعلیم، ایک مخلص شوہر، اچھا سسرال، اتنی اچھی نوکری، پیارے اور قابل بچے، مال و دولت، عزت...... اللہ نے آپ پہ بے پناہ کرم کیا ہے تو آپ پہ بھی شکر واجب تھا لیکن آپ نے ہمیشہ نخوت سے اس سب کو دیکھا۔ ہمیشہ اس گھمنڈ میں مبتلا رہیں کہ آپ اس قابل تھیں تو یہ سب آپ کے پاس ہے۔ یہ رویہ غلط ہے باجی۔ نعمتیں شکر کرنے سے بڑھتی ہیں۔ شکر ہم پہ واجب ہے کیونکہ ہم بنا مانگے بہت نوازے گئے ہیں۔ شاید اس تکلیف سے اللہ آپ کو کچھ سمجھانا چاہتے ہیں۔"

یہ وہ لڑکی کہہ رہی تھی جسے کچھ بھی آسانی سے نہیں ملا تھا، اس نے جو کچھ بھی حاصل کیا اس کے لیے اسے بے حد جان مارنا پڑی اور بہت کچھ نہیں بھی مل سکا لیکن اس نے کبھی اللہ سے ناشکری کے بول نہیں بولے۔ شکوہ نہیں کیا تھا۔ شکوہ وہاں بنتا ہے جہاں ہمارا حق ہو اور وہ اللہ سے کچھ بھی لینا اپنا حق نہیں سمجھتی تھی۔ یہ اس کا احسان تھا جو اس نے دے دیا۔

اس لڑکی کے منہ سے یہ باتیں بری نہیں لگنی چاہئے تھیں لیکن سننے والی بھی تو رطابہ تھی نا...... وہ جس نے کبھی کسی کی ایک نہیں سنی وہ اتنا کہاں سن سکتی تھی۔

"میں نے جو بھی حاصل کیا ہے، یا جو کچھ بھی مجھے ملا میں بالکل وہ ڈیزرو کرتی تھی تبھی مجھے ملا۔۔ اچھا شوہر، اچھا سسرال، اچھے بچے یہ سب میں ڈیزرو کرتی تھی اسی لئے میرے پاس ہے۔ اپنے آپ کو دیکھو...... ہم بہنیں ہیں...... ایک جیسے ماحول میں پلی بڑھی ہیں لیکن یہ سب میرے پاس ہے اور تمہارے نہیں۔ کیونکہ میں یہ سب ڈیزرو کرتی تھی اور تم نہیں۔۔۔ جس مقام پہ بھی ہوں وہ سراسر میری اپنی محنت ہے۔ میری ذہانت نے مجھے یہ عزت اور مقام دیا ہے۔ اس میں اللہ کی دین کہاں سے آ گئی......؟ سب میں نے خود کمایا ہے، کسی کا احسان نہیں ہے مجھ پہ تو شکر کس بات کا کروں۔ فخر ہے، گھمنڈ ہے تو اسی لئے ہے کہ میں قابل ہوں...... اور قابل ہوں تو یہ سب ہے میرے پاس ورنہ نہ ہوتا۔ اور تم جس بیماری کو میری آزمائش کہہ رہی ہو، وہ میرا چیلنج ہے...... یہ چیلنج ہے کہ میرا بیٹا اسی بیماری میں مبتلا ہوا جس کی میں سپیشلسٹ ہوں اور میں اسے اس مرض سے نکالوں گی بھی۔۔ تم جیسے ہی لوگ ہوتے ہیں نان پریکٹیکل جو ہر چیز کو آزمائش اور سزا سمجھ لیتے ہیں۔ میں بہت پریکٹیکل ہوں اس لئے میں

اسے بس اپنے لئے ایک چیلنجنگ کیس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتی۔ ذکی ٹھیک ہوگا اس کا مجھے سو فیصد یقین ہے۔ شک کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔" فاطمہ بالکل گنگ رہ گئی۔ اسے پتا تھا کہ اس کی بہن ایک چکنا گھڑا ہے جس پہ کچھ نہیں ٹھہرتا لیکن اتنی ڈھیٹ ہے کہ اتنی پریشانی میں بھی اپنی ڈھٹائی سے ایک انچ نہیں ہلے گی یہ نہیں پتا تھا۔ آج وہ بھی پتا لگ گیا۔

"اللہ تمہیں کسی نقصان کے بنا اس گمراہی سے نکال دے جس کا تم شکار ہو۔" وہ دل میں دعا کرتی لوٹ گئی تھی۔

☆......☆......☆

زیور بابا روزانہ فجر کی نماز کے ساتھ ہی باہر آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ عابدہ بھی ان کے ساتھ ہی کام پہ آتی تھی اور پہلا کام ہی ان کو ناشتہ بنا کر دینے کا کرتی۔ اس سے پہلے کہ گھر والے جاگ جاتے بابا ناشتے سے فارغ ہو جاتے۔

کرنل پاپا نے خود ان سے پوچھا تھا کہ وہ گھر کے اندر کیوں نہیں آتے۔ وہ اس سارے معاملے سے بے خبر تھے جو ہوا تھا۔ انہیں بھلا کس نے بتانا تھا......؟ اس گھر میں جو فساد ڈالنے کا کام کرتا تھا وہ رطابہ ہی تو تھی اور جب سارا کیا دھرا اس کا تھا تو کس نے یہ خبر کرنل سدھو تک پہنچانا تھی بھلا...... زیور بابا کرنل سدھو کے ہر سوال پہ خاموش رہتے۔ کرنل سدھو کے پوچھے جانے والے سوالوں کے جوابات جانتے ہوئے وہ نہیں دینا چاہتے تھے۔

رطابہ سے انہوں نے پوچھا تو اس نے بآسانی جواب دے دیا۔

"زیور بابا کی دماغی حالت کافی خراب ہو چکی ہے۔ نجانے کہاں کہاں پھرتے رہتے ہیں پورا دن۔ اچھا ہی ہے ویسے کہ گھر نہ آئیں تو۔ کیا خبر کسی بھی وقت کچھ بھی کر دیں۔ ایسے بندے کا فیملی میں رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کسی وقت کوئی بڑا نقصان کر سکتا ہے۔"

کرنل صاحب کو بھی اب زیور بابا مجذوب سے دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے کہ جو پرانے ملازموں کو سر پہ بٹھا کر ان کی پوجا کریں یا ان کی خدمت کریں۔ اگر دماغی طور

سے کچھ مسئلہ ہوا تھا تو ٹھیک ہی تھا کہ وہ خود ہی گھر سے چلے گئے تھے۔ کچھ باتوں میں کرنل سدھو کا مزاج بالکل رطابہ جیسا تھا جس میں خود غرض ہونا سب سے اوپر تھا اور زیور بابا کے لئے وہ بے حس اور خود غرض دونوں ہو چکے تھے۔

دانش نے اس دن کے بعد سے رطابہ کو مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا۔ رطابہ کو کچھ زیادہ فرق بھی نہیں پڑا تھا لیکن وہ ہر وقت ڈسٹرب دکھائی دیتی تھی۔ جیسے ذہن کہیں الجھا ہوا ہو۔ اسے لگتا تھا کہ بطور ماں رطابہ اذکار کے لیے پریشان ہے لیکن وہ غلط تھا۔ رطابہ کسی اور وجہ سے الجھن کا شکار تھی۔

اذکار کو دانش نے بہت طریقے سے سمجھایا تھا کہ اس کے دل کا آپریشن ہونا ہے۔ اس لئے اسے ہمت کرنا ہوگی۔ وہ اس کی ذہن سازی کر چکا تھا لیکن اذکار نے زیادہ ردِ عمل نہیں ظاہر کیا۔

"جتنا دل کمزور تھا، اسے آپریشن کی سخت ضرورت تھی۔" ذکی کے لئے یہ بہت بڑا صدمہ نہیں تھا۔ وہ جیسے اس سب کے لئے تیار تھا۔

"آپ کہتے تھے نا بابا کہ ہمیں مضبوط ہونا چاہئے تا کہ جب بڑی باتیں ہوں تو ہم برداشت کر سکیں۔ اسی لئے چھوٹی چھوٹی باتوں پہ نہیں رونا چاہئے تو دیکھیں مجھے۔۔۔۔ میرے دل میں سوراخ ہو گیا لیکن میں بالکل نہیں رویا کیونکہ میرے نزدیک یہ زیادہ بڑی بات نہیں ہے بابا...... جانتے ہیں کہ میرے نزدیک ماما بابا کی لڑائی اور آپ کو گھر سے نکالنا زیادہ بڑی باتیں تھیں۔ جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں اس کے مقابلے میں یہ بات بڑی لگ ہی نہیں رہی۔ اسی لئے میں بالکل نہیں رویا۔ میں ڈرا بھی نہیں ہوں بابا۔" وہ دن میں کچھ دیر زیور بابا کے پاس باہر جا کر بیٹھتا تھا۔

بابا خاموشی سے ذکر کرتے اسے سنتے رہتے۔ وہ خاموش رہتے لیکن جب ذکی ان سے بات کرتا وہ بس تب ہی بولا کرتے۔

"آپ بہت بہادر ہیں۔ اور اپنی اس بہادری کے ساتھ آپ یہ جنگ جیت جائیں گے۔"

"بہادر تو نہیں ہوں بابا اسی لئے کیا پتا جنگ جیت پاؤں بھی یا نہیں۔" زیور بابا دل میں اللہ نہ کرے کہتے۔

''آپ نے ہمیں معاف کر دیا......؟'' اس بات پہ وہ خاموش ہو جاتے۔ چوٹ بہت گہری لگی تھی۔ وہ اس کے بارے میں سوچتے بھی تو اتنا درد اٹھتا کہ ان سے برداشت نہ ہوتا۔

''آپ ہمت دکھائیں گے تو آپریشن ٹھیک ہو جائے گا اور آپ جلدی صحت یاب ہو جائیں گے۔''

''ہمت سے کچھ نہیں ہوگا...... دعاؤں سے ہوگا۔ آپ دعائیں کریں گے تو ٹھیک بھی ہو جاؤں گا۔''

''میری ہر پل کی دعائیں بس آپ کے لئے ہیں۔'' وہ اس پہ اپنا پڑھا ہوا دم کر دیتے۔

''مجھے لگتا ہے اللہ نے ماما کو سزا دی ہے تبھی میں بیمار ہو گیا۔''

''ایسے نہیں کہتے بیٹا۔''

''آپ کی بددعا لگی ہوگی......'' زیور بابا نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''میں نے کبھی کسی کو بددعا نہیں دی۔ دعا دینے والے ہاتھ بددعا نہیں دیا کرتے۔'' ذکی انہیں دیکھتا جاتا۔ نجانے کیوں اسے معصوم سے چہرے والے بابا سے اتنی محبت تھی۔

رطابہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اذکار دن میں زیور بابا کے ساتھ باہر بیٹھا رہتا ہے۔ لیکن اس نے ہسپتال جاتے ہوئے اکثر زیور بابا کو گھر کے باہر دوسری دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے دیکھا تھا۔ اب اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انہیں کالونی سے ہی نکلوا دے۔ یوں بھی ان دنوں وہ اذکار کے آپریشن کو لے کر کچھ پریشان تھی۔

فاطمہ ویک اینڈ پہ لازمی چکر لگا لیا کرتی اور اذکار کو کہیں گھما بھی لاتی تھی تا کہ اس کا دل بہل جائے۔ وہ اسکول نہیں جا رہا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی کیونکہ اس کا آپریشن جلد از جلد ہونا ضروری تھا۔ رطابہ نے آپریشن کے لئے ہسپتال کے ساتھ مہینے بعد کی تاریخ طے کر لی تھی۔ ولید اور لائبہ بھی چھٹی لے کر پاکستان آ گئے تھے۔ اخبا بھی ان کے ساتھ تھی۔ گھر میں خاصی رونق ہو گئی تھی۔ رطابہ نے عابدہ کو تاکید کی تھی کہ وہ فجر سے بھی پہلے آ جایا کرے تا کہ گھر میں کسی کو کسی قسم کا مسئلہ نہ ہو۔

اس دن فاطمہ رات میں اذکار کے کہنے پہ وہیں اس کے پاس رک گئی تھی۔ وہ بضد تھا کہ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتا فاطمہ وہیں رہے۔ ان دنوں وہ ہسپتال نہیں جا رہی تھی۔ اس نے نوکری سے چھٹی لے لی تھی کہ ابھی ذکی کو اس کی بے حد ضرورت تھی۔

صبح وہ فجر کی نماز کے بعد واک کے لئے نکلی تو باہر زیور بابا کو بیٹھے دیکھا۔ عابدہ انہیں ناشتہ دے رہی تھی۔ فاطمہ کو دیکھ کر چونک گئی۔

"باجی وہ......" وہ گھبرا گئی۔

"نیک کام میں ڈرا نہیں کرتے عابدہ۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ بابا کا خیال بیٹیوں کی طرح رکھتی ہیں۔" عابدہ مسکرا کر یہ سوچتے ہوئے اندر چلی گئی کہ دونوں بہنوں میں کتنا فرق ہے۔

فاطمہ کی قمیض کی جیب میں وہی کاغذ تھا جو وہ ہمیشہ دوسروں کو صدقہ دینے کے لئے اپنے پاس رکھا کرتی تھی۔

اس نے خاموشی سے وہ لفافہ ناشتہ کرتے ہوئے بابا کے قریب رکھ دیا۔

"ذکی کے لئے دعا کریے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسی دعا ایک بچے کو اس کی ماں دے سکتی ہے، وہ آپ ذکی کو دے سکتے ہیں۔" زیور بابا نے لفافے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ بس دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لئے۔

تب سے فاطمہ کا معمول بن گیا تھا کہ وہ فجر کی نماز پڑھتے ہی عابدہ سے ناشتہ لے کر باہر آتی اور ساتھ ایک لفافہ بھی لے آتی۔

"ذکی کے لئے دعا کریے گا بابا۔" ان کے پاس سے اٹھتے ہوئے وہ التجا کرنا نہیں بھولتی تھی۔

"دعا کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔" بابا نے لفافہ لوٹا دیا۔

"یہ دعا کے لئے نہیں دیتی میں آپ کو۔ یہ آپ کے اپنے لیے ہے بابا اور انسان جب تک زندہ رہتا ہے، اس کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ویسے بھی میں اس بات پہ یقین رکھتی ہوں کہ جن لوگوں نے اپنی پوری عمر ہماری خدمت میں گزاری ہو، کبھی ان کی خدمت کرنا ہمارا بھی فرض ہے۔" بابا اس کے ملازم نہیں تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ اذکار کے لیے وہ کتنے اہم ہیں، دانش کے لیے وہ کیا ہیں اسی لئے اسے ان کا احساس تھا۔ بابا نے بس متشکر نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ایک دعا میری بہن کے لئے بھی کر دیجیئے گا کہ اللہ اسے ہدایت دے دے۔ اسے وہ سمجھا دے جو آج تک کوئی انسان اسے نہیں سمجھا سکا۔" زیور بابا نے سر جھکا لیا اور ہاتھ اٹھا لئے۔

دھکے دینے والے کو دعا دینا بڑی فقیری ہے۔ بابا نے یہ کام بھی کر دکھایا۔

روزانہ وہ لفافہ لا کر بابا کو دیتی اور روزانہ بابا واپسی پہ وہ لفافہ عابدہ کو تھما دیتے کہ وہ اس کے گھر میں رہ رہے تھے اور عابدہ کے گھر میں اس کا ایک معذور شوہر اور دو بچے بھی تھے جن کی سو ضرورتیں تھیں ۔زیور بابا نے پیسہ کبھی جمع نہیں کیا تھا، پیسہ انہیں اب بھی پیارا نہیں تھا جب وہ دوسروں کے محتاج ہو چکے تھے۔ یہی اس انسان کی قلندری تھی۔

☆......☆......☆

آپریشن کی تفصیلات پہ بات کرنے کے ساتھ رطابہ نے ڈاکٹر منصور سے ہسپتال کی سہولیات کے متعلق بھی تفصیلی بات کی تھی۔

''ڈونٹ وری ڈاکٹر رطابہ اذکار کو اس ہاسپٹل میں ہر طرح کا پروٹو کال ملے گا۔ وہ آپ کا بیٹا ہے آخر اور یہ بات یہاں کا سارا اسٹاف جانتا ہے۔'' کچھ تحفظات تھے جو اس کے دور ہو گئے تھے۔

''آئی نو لیکن......'' جس بات پہ وہ کافی دنوں سے پریشان تھی وہ اسے کہنا تھی۔

''اس ہاسپٹل کی بیسٹ ڈاکٹرز میں سے ایک نام میرا ہے آپ جانتے ہیں۔'' انہوں نے اس کی بات پہ سر ہلایا۔

''اور جب سے ذکی کا ڈائگناسز ہوا ہے میں بہت اپ سیٹ ہوں۔''

''... obviously u r his mother آپ کے لئے یہ ایک بڑا شاک ہے'' وہ بالکل سمجھ رہے تھے۔

رطابہ نے سر نفی میں ہلایا۔

''میں اس لئے اپ سیٹ نہیں ہوں ڈاکٹر کہ وہ میرا بیٹا ہے بلکہ اس لئے کہ اب سوال میری competatancy کا ہے۔''

انہوں نے ناسمجھی سے رطابہ کو دیکھا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''ڈاکٹر منصور اگر اپنے بیٹے کی ہارٹ سرجری میں خود سرجن ہو کر کسی اور سے کرواؤں گی تو کیا یہ میری قابلیت پہ سوال نہیں ہے۔ دنیا کہے گی نہیں کہ ماں خود بیسٹ ہارٹ سرجن تھی اور بیٹے کا علاج نہیں کر سکی۔''

''دنیا یہ کیوں کہے گی۔ ظاہر ہے ایک ماں کیسے اپنے ہاتھوں اپنی اولاد کا ایسا علاج کر سکتی ہے جس میں اس کے جسم کو کاٹا چیرا جائے۔'' ڈاکٹر منصور کو اس کی بات سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ کہنا کیا چاہتی ہے۔

''کر سکتی ہے...... ماں اگر رطابہ ہو تو کر سکتی ہے ڈاکٹر۔'' ڈاکٹر منصور رطابہ کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر چونکے۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اذکار کی سرجری میں خود کروں گی۔'' وہ پورے اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

ڈاکٹر منصور اس کی بات پہ شاکڈ رہ گئے۔

ناول سپاس گزار کی آخری قسط آپ اگلے ماہ کی 5 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

آخری قسط نمبر 12

ڈاکٹر منصور صد حیرت سے کتنی دیر اسے دیکھتے رہے۔ان کی زندگی میں وہ پہلی ڈاکٹر تھی، پہلی ماں تھی جو اپنے بچے کا آپریشن خود کرنا چاہتی تھی۔ بچوں کو ذرا کچھ ہو تو مائیں کانپ اٹھتی ہیں کجا کہ وہ اپنے ہاتھوں میں ہی اوزار تھام کر اپنے ہی وجود کے حصے کو کاٹ پیٹ ڈالیں اور وہ بھی اس کا دل۔۔۔

''اِٹس امپاسبل۔۔۔ ڈاکٹر رطابہ آپ یہ نہیں کر سکتیں۔''

''بٹ وائے۔۔۔؟ آئی ایم اے ہارٹ سرجن۔۔۔۔''

''لیکن اس سے پہلے آپ ایک ماں ہیں۔او۔ٹی میں کوئی عام پیشنٹ نہیں، آپ کا اپنا بیٹا ہو گا۔ہاؤ کین یو ڈو دس۔۔۔؟''

''جانتی ہوں۔تبھی کہہ رہی ہوں کہ اس کی سرجری میں ہی کروں گی۔'' ڈاکٹر منصور نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

''ہی از یور اوون سن۔'' وہ اسے احساس دلانا چاہ رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور کس کے بارے میں کہہ رہی ہے۔

''سو واٹ۔۔۔؟'' وہ ایسے بولی کہ ڈاکٹر منصور کو اس کی ذہنی حالت پہ شبہ ہونے لگا۔

''آئی ایم سوری۔۔۔شاید میں غلط کہہ گیا۔۔۔ مجھے تو آپ سے پوچھنا چاہیے تھا کہ از ہی یور آن سن۔۔۔؟'' رطابہ نے کچھ بری شکل بنا کر انہیں دیکھا۔

''لیگلی اور پروفیشنلی یہ پاسبل نہیں ہے رطابہ۔۔ ایک سرجن اپنے ہی بلڈ ریلیشن کی سرجری نہیں کر سکتا۔آپ خود سوچیں کہ او ٹی میں آپ کا بچہ پڑا ہو تو کیا آپ اتنی کمپوزڈ ہوں گی کہ اس کی سرجری

کر سکیں۔۔۔؟ آپ کو لگتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے آپ (چیرنے والا آلہ) scalpel تھام کر اپنے ہی بیٹے کو incision (چیرا) دے سکیں گی۔"" انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا بات کر رہی ہے۔

"میں کر لوں گی سر۔۔" ڈاکٹر منصور نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

"انسان ہو انسان ہی بن کر دکھاؤ۔۔۔ خواہ مخواہ کا سپر ایلین مت بنو کہ اپنے بیٹے کو سامنے دیکھ کر بھی تم ایک نارمل ڈاکٹر کی طرح بی ہیو کر سکتی ہو۔ یہ سالوں کی میڈیکل ہسٹری میں نہیں ہوا اور تم کرو گی۔۔؟"

"میں نے کہا نا کہ میں اس پہ اتنے عرصہ سوچتی رہی ہوں۔ بہت سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ لیا ہے۔ میں سب جانتی ہوں کہ اوٹی میں سرجری کے وقت کیا ہوتا ہے۔۔" ڈاکٹر منصور نے نفی میں سر ہلایا۔

"ناٹ پاسیبل۔۔۔ آپ اپنے کولیگ کو اسسٹ کرنا چاہیں تو ٹھیک ہے لیکن آپ یہ خود نہیں کر سکتیں۔"

"ڈاکٹر منصور مجھے کسی پہ ٹرسٹ نہیں ہے سوائے اپنے۔ میں کسی کے سپرد اپنا بچہ نہیں کر سکتی آپ جانتے ہیں۔"

" ڈاکٹر ثمر از دی بیسٹ سرجن۔۔۔ یو نو ہم۔۔۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہمیں کوئی ڈاؤٹ ہونا چاہئے۔"

"بٹ سر جب میں خود ایک اچھی سرجن ہوں تو۔۔۔"

"ایک ٹیچر جتنا بھی اچھا ٹیچر ہو، اپنے بچے کو سکول پھر بھی بھیجتا ہی ہے۔ اسے گھر نہیں بٹھا دیتا۔۔۔ نہ ہی ساری عمر اسے خود پڑھا سکتا ہے۔ ہر انسان چاہے وہ کتنا ہی ماہر کیوں نا ہو، کتنا ہی علم والا کیوں نا ہو لیکن رطابہ وہ ہر سچویشن کو خود ڈیل نہیں کر سکتا۔ ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ۔۔۔ یہ ایسی سچویشن نہیں ہے کہ اسے آپ خود ہینڈل کریں۔"

"بٹ سر۔۔۔" ڈاکٹر منصور نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔

"اینف از اینف۔۔۔ آپ چاہیں تو ڈاکٹر ثمر کو اسسٹ کر سکتی ہیں لیکن خود سرجری نہیں کر سکتیں۔ میں تو آپ کی سوچ پہ حیران ہوں کہ آپ کے ذہن نے یہ فیصلہ لے بھی کیسے لیا۔۔۔" وہ

بات کو وہیں ختم کر کے چلے گئے۔ ان کے ساتھی کولیگ اگر رطابہ کو سائیکو پیتھ کہتے تھے تو ٹھیک ہی کہتے تھے۔اس کا دماغ عام انسان کا دماغ نہیں تھا۔اسے درست ہونے کی اشد ضرورت تھی۔

رطابہ مٹھیاں بھینچ کر انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

☆......☆......☆

''ابھی کیا ضرورت ہے ذکی کا آپریٹ کروانے کی۔ وہ تھوڑا بڑا ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔'' رطابہ کمرے میں سونے کے لئے آئی تو دانش نے اپنا لیپ ٹاپ اسی وقت بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایج کے ساتھ پرابلمز بڑھ جاتی ہیں۔ابھی اسے کچھ ہوا نہیں لیکن وقت کے ساتھ بھی کچھ نہیں ہوگا اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔''

''پندرہ کا تو ہو جائے۔'' دانش کا دل نہیں مان رہا تھا۔

''میں نے کچھ مہینوں کے بچوں کی سرجری کی ہوئی ہے۔وہ تو پھر دس سال کا ہے۔'' وہ ہاتھوں پہ کریم کا مساج کرتے ہوئے آئینے کے سامنے سے اٹھی۔

''بہتر ہوگا کہ تم عین موقع پہ یہ باتیں کرنے کی بجائے ذکی کو منظلی طور پہ تیار کرو سرجری کے لئے کیوں کہ میں سب ارینج کر چکی ہوں۔ دس دن بعد اس کی سرجری ہے اور تم یہاں یہ فضول ڈسکشن کر رہے ہو۔میں ہارٹ سرجن ہوں اور میں بہتر جانتی ہوں کہ اس کی سرجری کب کرنا بہتر ہے۔ڈاکٹر ثمر بس دو مہینے کے لئے ہی یہاں ہیں پھر وہ کینیڈا موو کر رہے ہیں۔ میں اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتی کیوں کہ میری نظر میں ان کے علاوہ کوئی ڈاکٹر اس قابل نہیں ہے جو میرے بیٹے کی سرجری کر سکے۔'' اس نے سر جھکا اور موبائل پہ کچھ سرچ کرنے لگی اور ساتھ ساتھ اونچی آواز میں پڑھتے ہوئے سر دائیں بائیں سمجھنے کے سے انداز میں ہلانے لگی۔

دانش خاموشی سے اٹھا اور اپنا لیپ ٹاپ الماری میں رکھ کر واپس بستر پہ لیٹ گیا۔ایک نظر رطابہ کو دیکھا جو کسی کیس سٹڈی میں منہمک تھی اور رخ موڑ کر سو گیا۔

☆......☆......☆

دانش اور فاطمہ روز ذکی کو بٹھا کر ہمت دلاتے کہ اسے بہادر بننا ہے کیوں کہ اس کے دل کا آپریشن ہے لیکن وہ بہت عام سے انداز میں سب سنتا جیسے اسے اس بات سے فرق ہی نہیں پڑتا کہ اس کے دل کا آپریشن ہے۔ جیسے بات کسی تیسرے چوتھے انسان کی ہو جس سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کے چہرے پہ کوئی تفکر نہیں تھا۔ لہجے میں خوف نہیں تھا۔ انداز بھی بالکل معمول کا ہی ہوتا۔ روزانہ اسی قسم کے جملے سن سن کر وہ بے زاری سے سر ہلا دیتا تھا۔

"تم ڈرے ہوئے ہو۔۔۔؟" آپریشن سے پچھلے دن فاطمہ نے اس سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں مجھے ڈرے ہوئے ہونا چاہئے۔۔۔؟"

"میں تمہاری جگہ ہوتی تو بہت ڈری ہوئی ہوتی۔ ڈر تو لگتا ہے آخر اتنی بڑی سرجری ہے۔" فاطمہ اس کا بیگ پیک کر رہی تھی جو ہسپتال جانا تھا۔ اسے کل دوپہر تک ہسپتال میں داخل ہو جانا تھا۔

"جان بہت پیاری ہے آپ کو۔" وہ بستر پہ ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ ہاتھوں کے کٹوروں پہ چہرہ ٹکا رکھا تھا اور کہنیاں اپنے گھٹنوں پہ تھیں۔ فاطمہ مسکرا دی۔

"جان تو سب کو پیاری ہوتی ہے ذکی۔۔۔" وہ خاموشی سے خالہ کو دیکھتا رہا۔

"مجھے نہیں ہے۔" فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے شانے اچکائے۔

"پتا نہیں کیوں۔" فاطمہ اس کا بیگ بند کر کے اس کے پاس چلی آئی۔

"زیور بابا کہتے ہیں کہ ڈر کر نہیں بہادری سے جینا چاہئے۔ بزدل بندہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔ پتا نہیں کیوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ اب مجھے کسی بات سے ڈر نہیں لگتا۔ اس لئے مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا کہ میرا آپریشن ہے۔" فاطمہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یو آر اے بریو بوائے۔"

"میں سوچتا ہوں کہ جتنا ہم اس زندگی کے لئے ڈرتے ہیں، اُس زندگی کے لئے کیوں نہیں ڈرتے۔۔۔؟" فاطمہ گم صم سی اسے دیکھنے لگی۔

"ذکی ! یہ سب تمہاری سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ تم ابھی بچے ہو۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔

"حضرت علی بچے تھے ۔۔۔ نو سال کے ۔۔۔ تب اپنا دین چھوڑ کر قبول کیا تھا اسلام ۔۔۔ اللہ کے نبیؑ نے تو انہیں نہیں کہا ہو گا کہ تم ابھی اس معاملے میں مت پڑو۔ تم بچے ہو۔ بچہ ہونے سے کیا ہوتا ہے ۔۔۔؟ کیا بچوں نے مرنا نہیں ہوتا یا ان کی دوسری زندگی نہیں ہو گی ۔۔۔؟"

"اس سب کے لئے زندگی پڑی ہے بیٹا۔ ابھی تم چھوٹے ہو۔" اس نے فاطمہ کو اچنبھے سے دیکھا۔

"آپ کو کیا گارنٹی ہے کہ زندگی ابھی بہت پڑی ہے ۔۔۔؟" فاطمہ بالکل ساکت رہ گئی۔

اسے اذکار کی باتوں سے وحشت ہونے لگی۔ وہ ایسی باتیں کبھی نہیں کرتا تھا۔

"ایسی باتیں مت کرو ذکی ۔۔۔" اس نے جھرجھری لی۔

"ہمیں ایسی ہی باتیں سوچنی اور کرنی چاہئے۔ کیا موت کو یاد کرنا غلط بات ہے ۔۔۔؟ ہم یہ کام چھوڑ چکے ہیں نا خالہ اسی لئے ہمارا ایمان کمزور پڑ گیا ہے اور دنیا پیاری ہو گئی ہے۔" فاطمہ بالکل چپ رہ گئی۔ جو بھی تھا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس بات پہ وہ اس بچے کو نہیں جھٹلا سکتی تھی۔

اسی وقت رطابہ اندر آئی تھی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں ملبوس تھی۔

"ہاؤ از مورال ینگ بوائے ۔۔؟" وہ اس کے دوسری طرف آ کر بیٹھ گئی۔

"پرفیکٹ۔" اذکار نے جیسے کسی روبوٹ کی طرح جواب دیا۔ وہ جب سے ہسپتال سے لوٹا تھا، ماں سے بات کم کرتا تھا۔

"آج میں تمہارے ساتھ سوؤں گی۔" حیرت سے اس نے ماں کو دیکھا۔

"میں رات کو خراٹے لیتا ہوں۔" جب سے وہ اس گھر میں شفٹ ہوئے تھے رطابہ نے اذکار اور اخبا کے کمرے الگ کر دیے تھے۔ جب بھی اس نے ماں کے کمرے میں سونے کی خواہش کا اظہار کیا وہ اسے یہی کہہ کر نکال دیتی کہ تم خراٹے لیتے ہو اور میں رات کو سو نہیں سکتی۔

"میں گزارا کر لوں گی۔" وہ مسکرا دی۔ اذکار کے لئے یہ ناقابلِ یقین بات تھی کہ کسی بات پہ اس کی ماں یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ وہ گزارا کر لے گی۔

''رات میں لائٹ بھی جلا کر سوتا ہوں۔۔'' وہ جانتا تھا کہ رطابہ کو کمرے میں روشنی سے مسئلہ ہوتا ہے۔

''اٹس اوکے۔'' اس نے ماں کو دیکھا۔کاش کہ وہ عام حالات میں بھی اتنی ہی اولاد کے لئے برداشت کرنے والی ماں ہوتی تو اسے ماں سے کوئی شکوہ نہ ہوتا۔

''لگتا ہے آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ طنزیہ مسکرا دیا۔رطابہ چونکی۔

''کس بات کا ڈر۔۔۔؟''

''یہی کہ میں او۔ٹی سے واپس نہیں آؤں گا۔''

''ذکی۔۔۔'' فاطمہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔جس بات کو وہ سوچتے ڈر رہی تھی وہ منہ سے نکال رہا تھا۔

رطابہ کچھ شاکڈ سی رہ گئی۔

''مجھے پتا ہے کہ تم بالکل صحیح سلامت ٹھیک ہو کر واپس آؤ گے۔یہ کوئی اتنی مشکل سرجری نہیں ہے۔اس سے کہیں زیادہ مشکل سرجریز ہم کرتے رہتے ہیں۔یہ تو معمول ہے۔''

''آپ تو اتنی شیور ہیں جیسے آپ نے میری زندگی کی گارنٹی لے لی ہو۔۔۔۔ ویسے ڈاکٹرز تو علاج کرتے ہیں، زندگی نہیں دیتے۔اتنی شیورٹی بھی اچھی نہیں ہے۔کیونکہ زندگی کم لکھی ہو تو ہلکا سا بخار بھی ڈاکٹرز کی سمجھ میں نہیں آتا اور لکھی ہو تو دماغ کو کھول کھال کر درست کر دیتے ہیں۔''

فاطمہ نے اسے بغور دیکھا۔وہ بالکل بھی پہلا جیسا ذکا نہیں تھا۔معصوم اور سادہ سا بچہ جو چھوٹی چھوٹی باتوں پہ روہانسا ہو جاتا تھا۔۔ اس کے مقابل تو کوئی بڑا تجربے کار بابا بیٹھا تھا، ایسا انسان جس نے زندگی کو بے خوف ہو کر جی لیا ہو۔وہ اتنی ہمت اور بہادری کیسے دکھا رہا تھا فاطمہ حیران تھی۔

''آج تم اخبا کے ساتھ سو جاؤ۔میں یہاں سوؤں گی۔'' رطابہ نے ذکی کی بات کو نظر انداز کر کے فاطمہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔فاطمہ نے آہستگی سے سر ہلایا اور جانے لگی تو ذکی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔فاطمہ نے مڑ کر دیکھا۔ذکی اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے ہاتھ پہ بوسا دیا۔

''اپنا خیال رکھیئے گا۔''

فاطمہ کا دل بھر آگیا۔ اس نے جلدی سے ذکی کو گلے لگالیا اور اس کا سر نرمی سے چومنے لگی۔ وہ اس کا اپنا بچہ نہیں تھا، اس بہن کا بچہ تھا جو اسے کبھی بہن سمجھتی ہی نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کا دل کٹ رہا تھا کیونکہ وہ اسے بے حد پیارا تھا۔

اس کے چہرے پہ بوسہ دے کر وہ تیزی سے کمرے سے چلی گئی۔ اگر وہ مزید کھڑی رہتی تو اس کے آنسو بہنے لگتے اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔

اذکار کچھ دیر بند دروازے کے پیچھے غائب ہو جانے والی خالہ کو ہی دیکھتا رہا اور پھر اپنے تکیے پہ جا کر لیٹ گیا۔

کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ ان دونوں کے درمیان اجنبیت حائل تھی۔ رطابہ چت لیٹے چھت کو دیکھتے اذکار کو دیکھ رہی تھی۔

"ذکی۔۔۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔" اسے لگا کہ وہ پریشان ہے۔

رطابہ بھی اس کے برابر لیٹ گئی۔ وہ چھت کو دیکھتا رہا اور رطابہ اسے۔

"ایک بات کہوں ماما۔" رطابہ نے سر ہلایا۔

"جو ہوا وہ ہوا ماما۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ زیور بابا آپ کو پسند نہیں ہیں لیکن انہوں نے کبھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑا۔۔۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اب وہ کبھی اس گھر میں واپس نہیں آئیں گے لیکن اگر ہو سکے تو ان سے معافی مانگ لینا کیونکہ آپ نے ان کے ساتھ بہت برا کیا ہے۔"

"کیا اس وقت ہم ہماری بات نہیں کر سکتے ذکی۔۔۔؟" رطابہ نے چڑ کر اسے ٹوک دیا۔

"کچھ باتیں امانت ہوتی ہیں ماما۔ کہہ دینی چاہیں۔۔" رطابہ اتنے مشکل جملے اس کے منہ سے سن کر بالکل حیران سی اسے دیکھنے لگی۔

"تم نے کہاں سے یہ سب سیکھا ہے ذکی۔۔۔؟"

"پتا نہیں۔۔۔ ایسے لگتا ہے کہ کوئی دماغ میں ڈال دیتا ہے۔" وہ بالکل گم صم سی اسے دیکھنے لگی۔

"یہ جو مختلف سوچیں، مختلف آئیڈیاز آتے ہیں ہمارے دماغ میں، یہ سب اللہ کی طرف سے

ہوتے ہیں۔ یہ میں نے ایک لیکچر میں سنا تھا۔'' رطابہ اس کے بالوں میں ہاتھ چلانے لگی۔ وہ بہت وقت بعد اس دن اس سے بالکل عام انداز سے بات کر رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ میں کبھی تم دونوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکی کیونکہ میرا پروفیشن ہی ایسا تھا لیکن میں نے کبھی تم لوگوں کا برا نہیں چاہا۔'' وہ خاموش تھا۔

''کیا میں ایک بری ماں ہوں ذکی۔۔۔؟'' وہ کافی دیر چپ رہا حتی کہ وہ آگے ہو کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

''آپ بہت اچھی ڈاکٹر ہیں۔'' اس کے سوال پہ وہ ایسا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا جو اسے برا لگے۔

''آئی نو لیکن میں تم سے اپنی مدر ہڈ کا پوچھ رہی ہوں۔''

''اگر آپ کی ایک اولاد رہ جائے تو آپ کو اس کے ساتھ ایسا ہونا چاہئے کہ اس سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے کہ آپ کیسی مام ہیں۔'' رطابہ نے اسے بے چینی سے دیکھا۔

''میری دو اولادیں ہیں ذکی۔''

''دو سے ایک ہونے میں کتنا وقت لگتا ہے۔'' رطابہ پتھرائی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ماں کی نظروں سے گھبرا کر اس نے پوچھا۔

''میری سرجری ڈاکٹر ثمر کر رہے ہیں۔۔۔؟''

رطابہ نے سر ہلایا۔ وہ اسے بتاتے بتاتے رک گئی کہ وہ ڈاکٹر ثمر کو اسسٹ کرے گی۔

''سو جاؤ۔۔۔ تاکہ نیند پوری ہو سکے۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''میں نے او ٹی میں جا کر سونا ہی تو ہے۔'' رطابہ بس اسے دیکھنے لگی۔ نجانے کیوں اس کا دل کچھ بھاری سا ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا تھا۔

کچھ دیر بعد ازکار سو چکا تھا لیکن وہ جاگتی رہی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دماغ مسلسل کچھ نا کچھ سوچ رہا تھا حالانکہ آرام کی ضرورت اسے تھی کہ اس نے کل ایک آپریشن کرنا تھا وہ بھی اپنے بیٹے کا لیکن اس کا دماغ ایک خودکار مشین کی طرح چل رہا تھا۔

ڈاکٹر ثمر سرجری کر رہے تھے اور وہ انہیں اسسٹ کر رہی تھی یہ بات اس گھر میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔

☆......☆......☆

صبح ناشتے کے بعد ہی اذکار باہر نکلا تھا۔ فاطمہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ زیور بابا سے ملنے گیا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے دانش سے اجازت لی تھی۔ رطابہ بھی وہیں تھی لیکن اس نے اذکار کو جانے سے منع نہیں کیا تھا۔ رات کا بوجھل پن ہنوز طاری تھا۔

''میں کچھ دیر بابا کے پاس اکیلے بیٹھنا چاہتا ہوں۔'' فاطمہ سر ہلاتی واپس اندر چلی گئی۔

''آج میرا آپریشن ہے لیکن میں بالکل بھی ڈر نہیں رہا۔ میں نے بہادر بننا سیکھ لیا ہے۔ اب میں روتا نہیں ہوں۔'' زیور بابا نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو ان کے ہاتھوں کی لرزش واضح تھی۔

''میں نے کچھ دن پہلے خواب میں دیکھا تھا بابا کہ آپ اور میں ایک بہت پیارے باغ میں بیٹھے تھے اور آپ مجھے بتا رہے تھے کہ وہ بہت خاص باغ ہے۔۔۔ بابا کیا وہ باغ جنت تھا۔۔۔؟''

زیور بابا بس اسے دیکھتے رہے۔

''مجھے خواب میں لگا تھا کہ وہ جنت ہے۔''

''جنت کو کوئی آنکھ تصور نہیں کر سکتی بیٹا۔'' بابا نے اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹا لیا۔ اذکار نے سر ہلایا۔

''میں آپ کو کچھ کہنا چاہتا ہوں بابا۔ میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کیونکہ سب مجھے ڈانٹیں گے لیکن آپ کو بتا رہا ہوں۔ آپ کو بھی نہ بتاتا اگر ڈر ہوتا کہ آپ نہیں سمجھیں گے۔ مجھے بہت عرصے سے ایسا لگتا ہے کہ میں آپریشن تھیٹر سے واپس نہیں آسکوں گا۔ پتا نہیں کیوں مگر مجھے لگتا ہے۔'' زیور بابا گنگ سے اسے دیکھنے لگے۔ ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایسی بات وہ چھوٹا بچہ کیوں کر رہا تھا وہ نہیں جانتے تھے۔ وہ تو دن رات اس کی صحت یابی کی دعا کرتے تھے۔

''میں نے ایک لیکچر میں سنا تھا بابا کہ جب والدین نیک ہوتے ہیں تو ان کی خیر ان کی اولاد تک جاتی ہے اور اگر والدین گناہگار ہوں تو ان کے گناہوں کا عذاب ان کی اولاد تک جاتا ہے۔۔ مجھے لگتا

ہے کہ میں بیمار اس لئے ہوا ہوں کہ ماما سمجھ سکیں کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے یہ بیماری مجھ پہ آئی ہے۔''
بابا کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔
''ایسا نہیں سوچتے۔ یہ بس ایک آزمائش ہے۔'' بابا نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو ضبط کیا۔
''آپ نے تو ماما کو بددعا نہیں دی ہوگی بابا لیکن اللہ تو منصف ہے نا جو سب دیکھتا ہے۔'' بابا نے ذکی کے سر پہ ہاتھ دھرا۔ ان کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ زندگی کی کچھ بدصورتیوں نے اس بچے کو کیسا قلبِ سلیم عطا کر دیا تھا جو ایک عام انسان بڑھاپے تک بھی نہیں پا سکتا۔
''میری ایک بات مانیں گے آپ۔'' بابا اسی طرح اسے دیکھ رہے تھے۔
''اگر کبھی ماما نے آپ سے معافی مانگنے آئیں تو انہیں معاف کر کے گھر چلے جائیے گا۔ آپ کو یوں یہاں بیٹھے دیکھنے سے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔'' ان کا سر پہ دھرا ہاتھ بے جان سا ہو کر پہلو میں گر گیا۔ بابا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ جب اذکار ہسپتال سے واپس لوٹے گا تو وہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے جائیں گے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ انہوں نے کہاں جانا تھا لیکن انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ دوبارہ یہاں کبھی نہیں آئیں گے۔
''ذکی بابا! آپ کو بے فکر ہو کر ہسپتال جانا چاہئے۔ یہ باتیں واپسی پہ بھی ہو سکتی ہیں۔''
''واپسی کا یقین نہیں ہے مجھے۔ اسی لئے سب کہہ دینا چاہتا ہوں۔'' اس کا چہرہ یک دم مرجھا گیا۔
''میری ماما کو معاف کر دیں بابا چاہے وہ معافی مانگنے آئیں یا نہیں۔ میں ان کی طرف سے معافی مانگتا ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر سے ہاتھ جوڑ دیے۔ کیا کبھی کسی اولاد نے اپنی ماں کے لیے اتنی شدت سے معافی مانگی ہوگی۔۔۔؟ زیور بابا نے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ وہ رو رہے تھے لیکن ذکی خاموش تھا۔ وہ پہلے بات بات پہ رو دیتا تھا لیکن جب سے وہ ہسپتال سے آیا تھا ایک عجب طرح کا بدلاؤ آیا تھا کہ وہ اب روتا نہیں تھا۔
کچھ دیر وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اپنے ہاتھ ان سے چھڑا کر وہ ان کے گلے لگا۔

☆......☆......☆

ہسپتال کے کاریڈور میں وہیل چیئر پہ بیٹھا وہ ننھا بچہ زندگی کے چند پل گزرنے کے بعد اندر ایک ایسے بستر پہ لیٹا ہوگا جس پہ اس کا جسم زندگی اور موت کے مابین حائل ہوگا۔۔۔

نانا نانی، ماموں مامی، چاچو چاچی اور کرنل پاپا سب مل کر جا چکے تھے۔ صرف دانش اور فاطمہ وہاں اس کے ساتھ موجود تھے جس کی وہیل چیئر ایک میل نرس کاریڈور میں آگے بڑھا رہا تھا۔ وہ آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا اور مخصوص لباس میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پہ کچھ گھبراہٹ تھی کہ وہ ننھا بچہ تھا اور زندگی کو دور ہوتے، موت کو قریب محسوس کر رہا تھا۔ زندگی بھلے پیاری ہو نہ ہو لیکن موت کی اپنی ایک سختی ہوتی ہے جو انسان کو پریشان رکھتی ہے۔

آپریشن تھیٹر کے قریب پہنچ کر دانش یک دم اس سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ خاموش آنسو جو لبوں سے سسکی کو بلند ہونے سے پہلے ہی دبا دیتے ہیں۔ وہ باپ تھا لیکن کمزور پڑ کر بیٹے کو کمزور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ باپ کے یوں والہانہ گلے لگنے پہ اذکار کی اپنی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

فاطمہ بار بار آستین کو چہرے تک لے جا کر آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ اس کی زبان پہ ورد جاری تھا۔ بھلے وہ ڈاکٹر تھی لیکن خود کو عام انسان ہی سمجھتی تھی۔ اس نے کبھی بہن کی طرح کبھی اپنے آپ کو زندگی بانٹنے والا فرشتہ نہیں سمجھا تھا۔

"مضبوط رہنا اور بالکل ڈرنا نہیں۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔" اس سے الگ ہو کر انہوں نے اس کا شانہ تھپکا۔

فاطمہ کی طرف اس نے دیکھا تو وہ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پہ سجا کر اس سے گلے ملی۔ اس کے چہرے پہ پیار کیا۔

"ذکی! تم بہت بہادر اور نیک بچے ہو۔ اللہ تمہاری ضرور حفاظت کریں گے۔ تمہیں کچھ نہیں ہونے دیں گے۔" اذکار مسکرا دیا۔

"خالہ! میری ماما کا خیال رکھئے گا۔" فاطمہ کا چہرہ پھیکا پڑا۔

"تم ٹھیک ہو کر خود ان کا خیال رکھنا۔ ویسے بھی اب تم ایک جوان بیٹے کا روپ دھارنے لگے ہو

جو ماں کا سہارا ہوتے ہیں۔'' وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

''میرا ایک کام کرنا ہے آپ نے۔ میری الماری میں ایک کاغذ پڑا ہے، آپ والا۔۔۔ اس میں کچھ پیسے تھے جو میں نے چیرٹی کے لئے جمع کئے تھے۔ وہ سارے پیسے ماما کو دینا کہ وہ زیور بابا کو اپنے ہاتھوں سے دے دیں۔'' فاطمہ کا دل مزید بھرا گیا۔ اس نے اذکار کا ہاتھ تھپکا۔

تبھی اوٹی ڈریس میں رطابہ باہر آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک میل نرس مزید تھا۔

''ذکی چلو بیٹا۔'' ابھی وہ واش نہیں ہوئی تھی۔ (آپریشن کے لئے تیار نہیں ہوئی تھی)۔

دانش اور فاطمہ کی جذباتیت دیکھ کر اس نے بے زاری سے منہ پھیر لیا۔ میل سٹاف کو اشارہ کیا جو اسے اندر لے جانے لگے۔

اذکار نے مڑ کر انہیں دیکھا اور ہاتھ ہلا دیا۔ پھر وہ دروازے کی اوٹ میں گم ہو گیا۔

''بچے کا مورال ہائی کرنا چاہئے آپ دونوں کو۔ نہ کہ اسے پریشان کریں۔ یہاں اس کے ساتھ اسے بک اپ کرنے کے لئے چھوڑا تھا۔ اگر رونا دھونا ہی تھا تو اسے اکیلے چھوڑ دیتے۔''

اسے اوٹی ڈریس میں دیکھ کر دانش نے بے چینی سے پوچھا۔

''تم آج بھی سرجری کے لئے جا رہی ہو۔ ذکی کو تمہاری ضرورت ہے۔''

''اسی کے لئے ہی جا رہی ہوں۔'' دانش الجھا۔

''ڈاکٹر ثمر کو میں اسسٹ کروں گی سرجری میں۔'' کچھ سنبھل کر اس نے اعتماد سے کہا تو فاطمہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دانش بالکل گنگ سا اسے دیکھنے لگا۔ وہ ایک سرجن کا شوہر تھا اور ڈاکٹرز کے شوہر بیویوں کے ساتھ رہ کر اتنا تو سمجھ جاتے ہیں کہ اس بات کا کیا مطلب ہے۔

''یو کانٹ ڈو دس۔''

''آئی کین۔ میں اس کی سرجری خود کرنا چاہتی تھی یہ تو ڈاکٹر منصور نے پرمیشن نہیں دی اور ڈاکٹر ثمر کو ہائر کر لیا۔'' بے یقینی سے وہ دونوں اس کی شکل دیکھنے لگے۔

''اسے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ایک سمپل سی سرجری ہے اور ایسی سرجریز ہم دن میں کئی بار کرتے ہیں

۔'' باہر سے تسلی دیتے ہوئے نجانے کیوں اس کا اپنا دل پل بھر کے لئے زور سے دھڑکا تھا۔

وہ واپس لوٹ گئی تھی۔ ابھی اسے واش ہونا تھا اور ایک بار اکیلے میں ذکی سے ملنا تھا۔ وہ پہلے سیدھی ذکی سے ملنے چلی گئی۔

میل سٹاف اسے بیڈ پہ منتقل کر چکے تھے۔

''میں یہیں ہوں ذکی تمہارے پاس۔ میرے بیٹے کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' اس کا ہاتھ تھام کر اس نے ایسے لہجے میں کہا کہ دو آنسو یک دم ذکی کی آنکھوں میں چمکے اور اس نے بہت امید سے ماں کو دیکھا ۔جیسے یہ اللہ کی طرف سے تسلی تھی جو ماں کے منہ سے دلائی جا رہی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔ اسے ماں کی بات کا یقین آ گیا تھا۔ رطابہ نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ ذکی نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

رطابہ اس سے قریب ہوئی تو اس نے ماں کا چہرہ چوم لیا۔ دو آنسو اب گالوں سے ہوتے بالوں میں جذب ہو گئے۔ نجانے کتنے وقت بعد اس نے یوں ماں کے منہ کو چوما تھا۔ آخری بار کی اسے یاد ہی نہیں تھی۔ رطابہ نے بھی اس کے ماتھے کو چوما اور جلدی سے پلٹ گئی۔ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آ کر وہ خود کو کمزور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے ابھی ایک کٹھن مرحلے سے گزرنا تھا۔

''ماما اخبا کا خیال رکھنا پلیز ۔۔۔'' رطابہ سے واپس مڑ کر اسے دیکھا نہیں گیا اور وہ تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

اردگرد سرجری کے پروسیجر کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ کچھ دیر میں اینستھیٹک بھی وہیں آ چکے تھے۔

اذکار نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں۔

''اللہ میں آپ کے باغ کا پھول ہوں پھر بھی مجھ سے جو غلطیاں ہوئیں مجھے معاف کر دیں۔ بیشک میں نہیں جانتا کہ میں یہاں سے اٹھ پاؤں گا یا نہیں۔ بس مجھے سب غلطیوں پہ معاف کر دیں۔ اس وقت میں جس احساس سے گزر رہا ہوں وہ بس آپ جانتے ہیں۔''

انستھیٹک اس سے ہلکے پھلکے سوال کر رہا تھا تا کہ اس کا دھیان بٹا رہے۔

''اللہ جی میرا دل کہتا ہے کہ میں اس بے ہوشی سے کبھی جاگ نہیں سکوں گا۔ اگر یہ میرا آخری

وقت ہے تو میں معافی مانگتا ہوں اور اگر اس کے بعد بھی میں زندہ رہا تو ساری زندگی بس شکر ادا کروں گا۔"

تب تک ڈاکٹر ثمر بھی واش ہو کر اوٹی میں آ چکے تھے۔ اس سے مسکرا کر بات کرتے وہ اس کا حوصلہ بلند کر رہے تھے۔ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں ان کی بات سن رہا تھا۔

"اگر میری زندگی ہے تو مجھے اس صحت سے بہتر صحت دینا اور اگر زندگی ختم ہے تو موت آسان کرنا۔" انستھلک اپنا کام کر چکا تھا۔ ذکی کا دماغ سن ہونے لگا تھا۔ آخری منظر جو اسے یاد رہا تھا کہ اس نے ماں کو اوٹی ڈریس میں ملبوس خود پہ جھکتے دیکھا تھا اور پھر وہ اپنے ہوش کھو چکا تھا۔

☆......☆......☆

فاطمہ اور دانش وہیں ایک کاریڈور میں بیٹھے تھے جب ظہر کی نماز کا وقت ہوا تو فاطمہ اٹھ کر ہسپتال کے پریئر ایریا کی طرف بڑھی۔ اس کی آنکھیں بار بار بھر رہی تھیں۔ دل نجانے کیوں بری طرح ڈرا ہوا تھا۔ شاید وہ اتنی ڈری ہوئی نہ ہوتی اگر ذکی کے جملے اس کے ذہن میں گردش نہ کر رہے ہوتے۔

"خالہ! میری ماما کا خیال رکھئے گا۔" وہ کاریڈور میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ارد گرد کون آ رہا تھا کون جا رہا تھا اسے ہوش نہیں تھا۔ اس کا سارا ارتکاز انہی جملوں پہ تھا۔ وہ پریئر ایریا کی طرف مڑنے ہی والی تھی کہ اسے کسی نے پکارا۔

"آئینور۔" وہ چونکی اور مڑ کر آواز کی سمت دیکھا تو پتھرا گئی۔ اس کے سامنے ریچل کھڑی تھی۔ وقت بالکل نہیں گزرا تھا۔ وہ ہو بہو ویسی ہی تھی جیسے کالج میں ہوا کرتی تھی۔ وقت تو آئینور پہ بھی نہیں گزرا تھا لیکن وہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ اور میچور دکھائی دینے لگی تھی۔

"کیسی ہو یار۔؟ کہاں ہوتی ہو۔؟ اتنے عرصے بعد مل رہے ہیں۔" پانچ سال پہلے کا منظر اس کی نگاہوں میں گھوم گیا تو اندر ایک ٹیس اٹھی۔ وہ بھول چکی تھی لیکن درد ابھی باقی تھا۔

"ٹھیک ہوں۔ یہیں اسی شہر میں ہوتی ہوں۔"

"شہر میں تو ہو۔ آئی مین یور جاب۔؟" آئینور کچھ کہنے لگی تو اس سے پہلے ہی ریچل بول پڑی۔

"او ہاں۔۔۔ تمہارے nephew کی سرجری ہے نا آج۔۔۔؟" فاطمہ نے کچھ اچنبھے سے

سر ہلایا کہ وہ کیسے جانتی تھی۔

"میرے ہزبینڈ اس ہاسپٹل کے ڈائریکٹر ہیں اور ڈاکٹر رطابہ ہماری بہت ہی قابل ڈاکٹر ہیں۔ ان کے بیٹے کی سرجری کا سب کو پتا ہے۔" اس نے خود ہی وضاحت دی۔

"بٹ ڈانٹ وری۔ ڈاکٹر ثمراز دی بیسٹ ڈاکٹر ان دا ٹاؤن۔ وہ بالکل ٹھیک ہو کر آئے گا۔" آئینور نے سر ہلا کر زیرِ لب انشاءاللہ کہا۔

"میں چلتی ہوں۔۔" آئینور مزید اس سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"چلی جانا۔ پلیز دومنٹ میری بات سن لو۔ کچھ امپورٹنٹ ہے۔" بے زار سی صورت لئے فاطمہ نے وقت دیکھا۔

"جلدی کہو ریچل۔ مجھے نماز کے لئے دیر ہو رہی ہے اور پھر مجھے واپس اندر جانا ہے۔" او ٹی ہسپتال کی دوسری عمارت میں تھا اور پریئر ہال دوسری۔۔۔ ریچل نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

"تم اب تک ویسی ہی ہو آئینور۔ ویسی ہی پیور اور ڈفرنٹ۔۔۔ سب سے الگ۔۔۔ تبھی تو اس نے مجھے ایک نظر نہیں دیکھا اور اب تک وہ تمہیں ہی ڈھونڈ رہا ہے۔ تمہاری جیسی اسے کوئی ملی ہی نہیں پھر۔" ریچل کے لہجے میں حسرت تھی۔ فاطمہ چونکی۔

"میں عباد کی بات کر رہی ہوں۔" فاطمہ کے چہرے پہ ایک سیاہ لہرایا۔

"میں اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی ریچل۔ بہتر ہے کہ ہم اس بات کو یہیں ختم کردیں۔ تم سے مل کر اچھا لگا۔"

ریچل نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا جو قریباً مڑ چکی تھی۔ فاطمہ کچھ حیران ہوئی۔ ریچل کے چہرے پہ اضطراب کی سی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں موہوم سی امید تھی۔

"وہ تمہیں پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا ہے آئینور۔ اس کے ساتھ ایسا مت کرو۔ پچھلے آٹھ مہینے سے وہ تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ کہاں کہاں اس نے خاک نہیں چھانی۔ جو کچھ بھی کالج میں ہوا تھا وہ سب میرا اور سمیرا کا کیا دھرا تھا۔ تم دونوں کے درمیان جو بھی مس انڈرسٹینڈنگ ہوئی وہ ہم نے پیدا کی تھی

کیوں کہ میں تمہیں اس سے دور کرنا چاہتی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ، جو تمہیں چاہتا ہے، تمہیں حاصل بھی کر پائے۔ میں تم دونوں کو ایک ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے جیلسی ہوتی تھی کہ میں تم سے زیادہ خوبصورت ہو کر بھی کیوں اس کی نظروں میں نہیں ہوں۔ کیا کمی تھی مجھ میں بھلا۔ اور ایسا تم میں کیا تھا جو مجھ میں نہیں تھا۔ تم تو کبھی کسی سے بات کرنا تک گوارا نہیں کرتی تھی۔ اتنی روڈ، عجیب اور نان سوشل تھی۔۔ میں یہ تو دیکھ ہی نہیں سکی کہ وہ تمہارے اندر کا حسن دیکھ چکا تھا تو اس کے لئے میرا ظاہری حسن کیا خاک معنی رکھتا۔ اور سمیرا۔۔۔ اس نے اپنا کوئی پرانا بدلا لینا تھا عباد سے اسی لئے اس نے مجھے آگے کر دیا، مجھے مہرہ بنا دیا اور میں بخوشی بن بھی گئی کیوں کہ ہم دونوں کا ایک ہی مقصد تھا۔۔۔ تم دونوں کو الگ کرنا۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ عباد سے بدلا لینے کے لئے سب کر رہی تھی اور میں اپنی محبت میں ایسا کرنے پہ مجبور ہو گئی۔'' آئینور حق دق سی اسے سن رہی تھی۔ یہ سب اس کے لئے نیا تھا۔ سمیرا اس کی دوست ہو کر اس کے ساتھ یہ کر سکتی تھی اسے اندازہ نہیں تھا۔ ہاں وہ خود غرض سی لڑکی تھی، کسی حد تک بدتمیز اور منہ پھٹ بھی تھی لیکن ایسی چال چلے گی یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

''ہم نے مل کر اس کی نظروں میں تمہارا کردار مشکوک بنایا اور اسے تمہاری نظروں سے گرایا۔ ویسا کچھ بھی نہیں تھا جو ہم نے لاسٹ وائیوا والے دن کہا تھا۔ عباد تو کبھی تمہارے بارے میں ایک لفظ کسی سے نہیں کہتا تھا کیوں کہ وہ تمہیں اتنا معتبر سمجھتا تھا۔ وہ تو اس بات سے ڈرتا تھا کہ کسی کے سامنے تمہارا ذکر کرنا بھی کہیں تمہیں بدنام نہ کر دے۔۔ اس کی نظروں میں بس تمہارے لئے میں نے دو ہی تو جذبے دیکھے تھے، ایک محبت اور دوسرا احترام کا۔۔۔ اور یہ دو جذبے میں اپنے لئے اس کی نظروں میں چاہتی تھی جو مجھے کبھی دکھائی نہیں دیے۔ اس دن تمہارا اس سے دل برا کرنے کے لئے وہ سب ہم نے جھوٹ بولا تھا۔ تمہارے ہزبینڈ کا ہمیں نہیں پتا تھا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ جب وہ تمہیں لینے آنے لگا تو ہمیں موقع مل گیا تمہیں برا ثابت کرنے کا۔ اسی لئے ہم نے اسے جان بوجھ کر تمہارا بوائے فرینڈ بنا دیا تاکہ عباد تمہیں عام لڑکی سمجھ کر دھتکار دے۔ یہ سب ہم نے کیا تھا آئینور۔ سمیرا اور میں نے۔۔۔ عباد بے قصور تھا۔ وہ تم سے پہلے ہی محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا

ہے حتیٰ کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ وہ تو یہ تک نہیں جانتا تھا کہ تم شادی شدہ نہیں ہو پھر بھی وہ تمہیں ایک امید لئے ڈھونڈ رہا ہے۔"

آئینور بالکل گم صم کھڑی سب سنتی رہی پھر اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ایک گہری سانس لی اور آنکھیں موند کر کھولیں۔

"اگر میری تربیت ایسی نہ ہوتی تو اس وقت یہ کاریڈور طمانچے کی آواز سے گونج اٹھتا۔" ریچل آئینور کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔ لیکن وہ اپنی جگہ ٹھیک تھی۔ جو کچھ اس نے کیا تھا، ایک تھپڑ تو بنتا ہی تھا۔

"مگر میں ایسا کچھ نہیں کروں گی کیونکہ دوسروں کو ذلیل کرنے کی گھٹیا حرکت میں نے کبھی سیکھی ہی نہیں ہے۔"

وہ آگے بڑھنے لگی تو ریچل جلدی سے سامنے آ گئی۔

"عباد تمہارا منتظر ہے آئینور۔ اس نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔ کب سے وہ تمہیں پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا ہے۔ کوئی جگہ اس نے چھوڑی نہیں جہاں سے تمہارا سراغ مل سکے۔"

"وہ سب پیچھے رہ چکا ہے۔" اس نے ریچل کو دیکھے بنا بس سامنے کی کھلی ہوادار کھڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اب سچ میں اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچتی تھی جس نے اسے بری طرح رد کیا تھا۔

"وہ اب بھی آگے نہیں بڑھا۔ وہیں کھڑا ہے جہاں پہلے تھا۔۔"

"لیکن میں آگے بڑھ چکی ہوں۔" آئینور نے اسے دیکھ کر بہت مضبوط لہجے میں جتایا۔ ریچل طنزیہ مسکرائی۔

"تم بھی آگے نہیں بڑھی ہو۔ تم اگر آگے بڑھی ہوتی تو تمہاری ڈائیورس نہ ہوئی ہوتی یا تم آج سنگل نہ ہوتی۔ مان لو آئینور کہ تم بھی وہیں کھڑی ہو۔" اس نے چونک کر ریچل کو دیکھا۔

"میری ڈائیورس۔۔۔؟"

"مجھے ڈاکٹر رطابہ نے بتایا تھا سب کچھ۔" فاطمہ کا چہرہ پھیکا پڑا۔ اس کی بہن ہر جگہ اس کی عزتِ نفس کو مجروح کرنا اپنا فرض جو سمجھتی تھی۔ کم از کم اس لڑکی کے سامنے اس کی عزت رکھ لیتی۔ کاش

کہ وہ اس رطابہ کا کچھ کر سکتی۔ مگر دنیا میں کوئی انسان ایسا پیدا ہی نہیں ہوا تھا جو اس کا کچھ بگاڑ سکتا۔ بعض انسان لاعلاج ہوتے ہیں۔ ان کا علاج اللہ کے ہاتھ ہی سے ہونا ہوتا ہے۔ رطابہ انہی میں سے ایک تھی۔

''تم دونوں کا ساتھ قسمت میں ہے آئینور۔ تبھی تو اتنے سال گزرنے کے بعد بھی تم دونوں سنگل ہو۔ قدرت تم دونوں کو ملانا چاہتی ہے۔ اسی لئے وہ تمہیں یہاں لے آئی جہاں میں تھی۔ ہمارا ملنا طے تھا کیونکہ مجھے ہی تم دونوں کو ملانے کا وسیلہ بننا تھا۔''

''اور اس سب سے تمہارا کیا فائدہ ہے۔۔۔؟ کیوں کہ شاید تم کوئی کام بھی فائدے کے بنا تو کرتی نہیں ہو۔''

''ہاں کیوں کہ میں اب عباد کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ جس سے محبت کرتے ہیں اس سے چھینا نہیں جاتا۔۔۔ اسے دیا جاتا ہے۔ یوں بھی میں اپنی لائف میں مطمئن ہوں۔ اپنے ہزبینڈ کے ساتھ ایک سٹیلڈ لائف گزار رہی ہوں۔ تو جس کا دل میں نے برباد کیا، اسے بھی خوش ہونے کا پورا حق ہے۔ میں اسے اس کی خوشی لوٹانا چاہتی ہوں آئینور جو کہ بس تم ہو۔ یقین کرو وہ تم سے جتنی محبت کرتا ہے، وہ میں نے دیکھی ہے۔ اس کی گواہ میں ہوں۔۔''

فاطمہ اسے کچھ دیر دیکھتی رہی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ ریچل نے اسے روکا نہیں تھا۔ بس اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسے لگا تھا کہ اس کی اتنی لمبی دلیلوں، وضاحتوں اور تقریروں نے کہیں نا کہیں برف پگھلائی ضرور ہے۔

نماز میں دعا مانگتے، ہاتھ پھیلاتے اذکار کی زندگی کی دعا کے ساتھ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ زندگی میں جب جب اس کی ذات پہ بات آئی تھی، اللہ نے وقت کے ساتھ ثابت کر دیا کہ بات کرنے والا ہی غلط تھا۔ آج ریچل اور عباد غلط ثابت ہوئے تھے اور سال پہلے شمشاد۔۔۔ جب خود ہمدان نے اسے آکر بتایا تھا کہ اسے ٹھکرا کر جس لڑکی سے شمشاد نے شادی کی تھی وہ اسے چھوڑ گئی ہے۔

''میں نے ہی ایک بار سوال کیا تھا نا اللہ آپ سے کہ کیا میں بری ہوں جو سب مجھے تھوک جاتے ہیں۔ اس وقت آپ خاموش تھے لیکن آج آپ نے مجھے جواب دے دیا ہے۔ آپ نے مجھے سرخرو کر دیا

ہے۔آپ نے مجھے میری نظروں میں معتبر کر دیا ہے۔ مجھے یہ بتانے کے لئے شکریہ کہ میری زندگی میں، میری کوئی جہد بھی ناکام نہیں رہی۔ مجھے یہ بتانے کا شکریہ کہ اللہ ہمیشہ سچے اور محنتی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے پھر بھلے دنیا کے چلن کیا ہی ہوں۔ میں آج سپاس گزار ہوں اللہ کہ زندگی میں بھلا کتنا ہی تھکی ہوں، لڑی ہوں، جلی ہوں مگر آپ نے مجھے تھامے رکھا ہے، چھوڑا نہیں ہے۔۔۔آپ ہمیشہ میرا سہارا بنے رہے ہیں اور میں جس مقام پہ ہوں وہ سب آپ کا عطا کیا ہے۔

آپ ساتھ نہ دیتے تو آج آئینور فاطمہ گل کبھی اس جگہ نہ ہوتی جہاں ہے۔ یہ سب کچھ جو مجھے حاصل ہے، ڈگری، عزت، نوکری، عزتِ نفس یہ سب آپ کا دیا ہوا ہے۔میرے دل میں بس شکر اور احساس ہے لیکن اس کو ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔۔بس یہ آنسو ہیں جو آنکھوں سے بہہ رہے ہیں۔" پریئر ہال میں وہ اکیلی تھی اور اس کے ساتھ بس اس کا اللہ تھا۔ وہ اللہ جس کے لئے ایک سپاس گزار کے دل کا احساس اور آنسو ہی سب کچھ ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

جب ڈاکٹر ثمر نے ذکی کے سینے پہ پہلا چیرا دیا تو رطابہ کا دل بری طرح دھڑکا۔

(آپ کو لگتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے آپ (چیرنے والا آلہ) scalpel تھام کر اپنے ہی بیٹے کے incision (چیرا) دے سکیں گی۔) ڈاکٹر منصور کی آواز کے ساتھ ہی اس کا سر اذکار کے جسم سے ابلنے والے خون کو دیکھ کر بری طرح بے قابو ہوا۔

ڈاکٹر ثمر اب electrocautery سے اذکار کے خون کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ (الیکٹروکاٹری ایک ایسا آلہ ہے جو دورانِ آپریشن خون کی نالیوں کو جلا کر سیل کرنے کے کام آتا ہے تاکہ خون کا بہاؤ روکا جا سکے)

اس کا سر چکرانے لگا تھا لیکن وہ کھڑی رہی۔اس نے بار بار آنکھیں میچیں اور گہری سانسیں لیں۔

"یہ ایک پیشنٹ ہے رطابہ اور بس۔۔۔" اس نے خود کو دل میں تسلی دی۔

اذکار کی sternotomy کی جا رہی تھی۔(ایک تکنیک جس کے ذریعے سینے کی ہڈی کو کاٹا جاتا

ہے تا کہ دل تک رسائی ممکن ہو سکے)۔ اس سے مزید کھڑا رہنا جیسے دوبھر ہوا اور وہ ایک قدم پیچھے ہوئی۔ اس کی جگہ ڈاکٹر امبر آگے بڑھیں۔ احتیاطی تدبیر کے طور پہ ڈاکٹر منصور نے ڈاکٹر امبر کو بھی اسسٹ کرنے کے لئے کہا تھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ رطابہ ابھی یہ بات کر رہی ہے کہ وہ اسسٹ کرے گی لیکن بعد میں ایسا ممکن نہیں رہے گا۔

اس نے ایک طرف ہوتے گہرے سانس لیے۔

"مجھے اس وقت ایک ڈاکٹر ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ اگر میں اس سرجری کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں گی تو میری اتنی قابلیت کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" اس نے خود کو سمجھایا۔ زور کی آنکھیں میچیں اور دو تین بار گہرے سانس لے کر وہ واپس اپنی جگہ آ کر کھڑی ہوگئی۔

سامنے اذکار کا دل دھڑکتا دکھائی دے رہا تھا اور پہلی بار رطابہ کو محسوس ہوا کہ یہ دل کیا ہوتا ہے۔۔۔ جو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسے الٹا پلٹتا رہتا ہے۔۔۔ جسم کا وہ حصہ کہ یہ ٹھیک ہو تو سب ٹھیک ہوتا ہے اور یہ خراب ہو تو سب خراب ہو جاتا ہے۔۔۔ جان لو کہ یہ دل ہے۔۔۔ جان لو کہ یہ دل ہے۔۔۔

ڈاکٹر ثمر sutures کے ذریعے اس حصے پہ stitches لگا رہے تھے اور وہ انہیں اسسٹ کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش واضح تھی۔ ڈاکٹر ثمر نے اسے منع بھی کیا لیکن وہ کھڑی رہی۔ stitches لگانے کے دوران ہی heart arrset ہو گیا اور مانیٹر پہ چلتی پلس ریٹ بالکل سپاٹ ہو گیا (ایسی حالت جس میں دل خون کو پمپ کرنا بند کر دیتا ہے)۔ دل کا دھڑکنا بند ہو گیا تو رطابہ کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔ وہ ایک بار پھر ڈاکٹر سے ماں بن گئی تھی۔ سامنے پڑا مریض ایک عام مریض سے پھر اس کا بیٹا بن گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ واضح تھی۔ اس کے ہاتھوں میں تھامے forceps کانپ رہے تھے۔

"ڈاکٹر امبر پلیز ریپلیس ڈاکٹر رطابہ۔" ڈاکٹر ثمر نے اسے ایک طرف کرنا چاہا۔

"آئی ایم فائن سر۔" اس نے ایک گہرا سانس لے خود کو جلد ہی کمپوز کیا۔ تبھی مانیٹر پہ اس کا پلس ریٹ بحال ہونا شروع ہوا۔

"manual ventilation please" ڈاکٹر ثمر کے اشارے پہ ایک اسسٹنٹ نے ایک بیگ کی طرح کا تھیلا ہاتھ میں تھام کر پمپ کرنا شروع کیا جس کا مقصد سانس کے عمل کو تیز کرنا تھا۔ اس کے دل نے پھر سے دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔ رطابہ کی جان میں جان آئی۔

سکر لگا کر اندر جمع خون کا اخراج ممکن بنایا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ٹانکے لگا کر پھر سے زخم کو بند کیا جا رہا تھا۔ آخری ٹانکوں کو کھینچ کر اس کا سینہ کسی بیگ کی طرح بند کر دیا گیا اور آخری ٹانکے لگائے جانے لگے۔

قریب دس منٹ کے بعد ہی یک دم اذکار کی سانسیں اکھڑنے لگ گئی تھیں۔

"ہی از سنکنگ۔۔۔" ڈاکٹر ثمر نے کارڈیک مانیٹر کو دیکھا جہاں پلس ریٹ یک دم بہت کم ہو گئی تھی۔ اس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا تھا۔ رطابہ ساکت ہوئی۔

"سی پی آر۔" ڈاکٹر ثمر نے سٹاف سے کہا اور ذکی کو سی پی آر دیا جانے لگا۔ اس کا جسم سی پی آر کی وجہ سے ہلتا لیکن پلس ریٹ نہیں بڑھ رہا تھا۔

"ونس مور۔۔۔ (ایک دفعہ پھر)" اسے وقفے وقفے سے سی پی آر دیا جا رہا تھا لیکن اس کا پلس ریٹ بہتر ہونے کی بجائے اسی پہ رک گیا۔

رطابہ بس پتھرائی نظروں سے مانیٹر کو دیکھ رہی تھی جہاں زندگی کی لائن سپاٹ ہو گئی تھی اور ایک ٹون کی سپاٹ آواز ہی سنائی دے رہی تھی۔

قریباً دس منٹ تک اسے وقفے وقفے سے سی پی آر دیا جاتا رہا لیکن لائن ویسی ہی سپاٹ رہی۔ رطابہ کی نظریں مونیٹر اور ذکی کے درمیان گیند کی طرح گھوم رہی تھیں۔

ڈاکٹر ثمر نے دائیں بائیں سر ہلایا اور ہاتھ سے اشارہ کیا تو ڈاکٹر امبر پیچھے ہٹ گئی۔

"ہی از ایکسپائر (یہ مر چکا ہے)۔" رطابہ نے بے یقینی سے ڈاکٹر ثمر کو دیکھا۔ پھر اذکار کو۔۔۔ پھر سامنے مانیٹر کو۔۔۔ سب کچھ جامد تھا۔ کہیں کوئی ہلچل نہیں تھی۔

"ذکی۔ ذکی آنکھیں کھولو۔۔" اس نے اذکار کا ہاتھ تھاما۔ اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ یک دم جیسے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ رطابہ کسی خواب کی صورت اذکار کو دیکھ رہی تھی جو بیڈ پہ پڑا اسے کہہ رہا تھا۔

"کچھ لوگ ہماری زندگی بہتر بنانے کے لئے ہم سے الگ کیے جاتے ہیں ماما۔اس لئے میں جا رہا ہوں۔بس آپ سمجھ جائیں کہ میں کیوں جا رہا ہوں۔۔۔"

کسی نے پیچھے سے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا اور یک دم روشنی غائب ہو گئی۔رطابہ نے اذکار کو دیکھا جو بالکل ساکت پڑا تھا۔

"ہی از نو مور۔۔۔" ڈاکٹر امبر کی مری مری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"اس نے مجھے بات کی ہے ابھی۔۔۔ ذکی! تم کیا کہہ رہے تھے ابھی۔۔۔؟" اس نے اذکار کا بازو ہلایا۔

"ڈاکٹر رطابہ۔۔۔ ہی زانو مور۔۔۔" ڈاکٹر امبر نے پیچھے سے اسے کندھے سے تھام کر پیچھے کیا۔

"ڈاکٹر ثمر! اس نے ابھی مجھ سے بات کی ہے۔اس نے مجھ سے اخبا کی بات کی ہے۔۔۔ بلیومی ڈاکٹر۔۔۔وہ زندہ ہے۔"

"ہم اسے سی پی آر دے کر دیکھ چکے ہیں ڈاکٹر رطابہ۔ہی از نو مور۔۔۔" ڈاکٹر ثمر نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ڈاکٹر امبر کو اشارہ کیا جو رطابہ کو زبردستی وہاں سے ہٹانا چاہ رہی تھیں۔

"اس نے ابھی مجھ سے بات کی ہے ڈاکٹر۔ بالکل ابھی۔۔۔" وہ امبر کو پرے دھکیل کر میل سٹاف کی طرف لپکی جو چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

"تم نے دیکھا نا ابھی۔۔۔دیکھا نا کہ اس نے مجھ سے بات کی ہے۔۔۔؟"

میل سٹاف نے ترحم بھری نظروں سے رطابہ کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"تم نے دیکھا۔۔۔ ذکی نے مجھ سے بات کی ہے۔دیکھا تم نے۔۔۔؟" وہ ایک اور سٹاف سے ہذیانی انداز میں پوچھ رہی تھی۔اس نے دکھ سے سر نفی میں ہلا دیا۔

"تم سب کو کیوں نظر نہیں آیا۔ذکی نے ابھی مجھ سے بات کی ہے۔۔۔" وہ چلائی۔

"ڈاکٹر رطابہ۔۔۔ اس نے آپ سے بات نہیں کی۔وہ جا چکا ہے۔وہ اب کسی سے بات نہیں

کر سکتا۔۔۔ آپ ایک ڈاکٹر ہیں۔ سمجھنے کی کوشش کریں۔'' ڈاکٹر ثمر نے کچھ سختی سے رطابہ کو شانے سے جھنجھوڑا۔ وہ بے یقینی سے ڈاکٹر ثمر کو دیکھنے لگی۔

ڈاکٹر ثمر کا دل پگھلا۔ وہ اس وقت ایک ماں تھی۔۔۔ خدا کی قسم وہ ایک پیارا بیٹا کھو دینے والی ماں تھی جس کی ایسی ہی حالت ہونا تھی۔

''رطابہ۔۔۔ ذکی از۔۔۔ نو مور۔۔۔'' وہ بہت نرمی سے ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا اور رطابہ وہیں سے تیزی سے مڑی، ذکی کا ہاتھ تھام کر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

ڈاکٹر ثمر باہر نکل گئے۔ اوٹی سے باہر ہی فاطمہ اور دانش سے ان کا سامنا ہوا۔ ان کے چہرے پہ کچھ ایسا تھا کہ دونوں کا دل کانپ گیا تھا۔

انہوں نے دانش کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

''آپریشن کے دوران ہی۔۔۔'' انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیسے جملہ مکمل کریں۔

''he had a cardiac failure...'' فاطمہ نے پاس کی دیوار کا سہارا لیا اور خود کو لڑھکنے سے بچایا۔

''مطلب۔۔۔؟'' دانش نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہی از ایکسپائر۔۔'' دانش کھلے منہ سے ڈاکٹر ثمر کی شکل دیکھنے لگا۔

''آئی ایم سوری۔۔۔ میں نے پوری کوشش کی لیکن۔۔۔'' ان کا سر جھک گیا۔

''آپ لوگ تو۔۔۔ آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہ عام سی سرجری ہے۔۔۔ پھر کیسے۔۔۔؟'' دانش کے منہ سے بے ربط جملے اور آنکھوں سے تیزی سے آنسو بہنے لگے۔

'' زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' دانش کا کندھا تھپک کر وہ آگے بڑھ گئے۔

وہ دونوں تیزی سے اوٹی کی طرف بھاگے۔ کسی نے انہیں نہیں روکا۔ یہ وقت روکنے کا نہیں تھا۔

اندر رطابہ بے یقین سی اذکار کا ہاتھ تھامے اسے پکار رہی تھی۔

''بولو نا ذکی۔۔۔ بات کرو مجھ سے۔۔ تم نے ابھی مجھ سے بات کی تھی نا۔۔۔ ذکی

۔۔۔؟" دانش اور فاطمہ اذکار کو دیکھتے ہی وہیں تھم گئے۔شاکڈ تھا۔بہت بڑا شاکڈ تھا۔ان کا ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔

"یہ کیسے جا سکتا ہے۔۔۔؟ تم تو کہتی تھی کہ تم اور ڈاکٹر بیسٹ ڈاکٹرز ہو۔۔۔ یہ کیا کیا تم لوگوں نے۔۔۔؟" دانش مجنون کی سی

کیفیت میں اذکار کا چہرہ ٹٹول کر رطابہ سے کہنے لگا۔

"یہ کہیں نہیں گیا۔اس نے مجھ سے ابھی بات کی ہے۔۔۔ کوئی یقین نہیں کر رہا۔اس نے مجھ سے بات کی ہے ابھی دانش۔۔۔ یہ زندہ ہے۔اس کا دل بند نہیں ہوا۔۔۔ میں نے اسی لئے کہا تھا کہ مجھے اس کی سرجری کرنے دیں۔میں اپنے بچے کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔"

"کہاں گیا تمہارا علم اور وہ بڑا ہونے کے دعوے۔۔؟ تم نے میرا بیٹا مار دیا۔" رطابہ نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دانش کو دیکھا۔

"میں نے مار دیا۔۔۔؟" رطابہ کے ہاتھ سے اذکار کا ہاتھ چھوٹا۔

"ہاں تم نے مارا ہے میرا بیٹا۔۔ تم نے مارا ہے ذکی کو۔۔۔ تمہارے بڑے بولوں نے، تمہارے تکبر نے، تمہارے زعم نے۔۔۔ تمہارے گناہوں نے ہمارا بچہ ہم سے چھین لیا۔۔۔ تمہارے ناشکرے پن نے رطابہ۔۔۔"

"دانش بھائی پلیز۔۔۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔" روتے ہوئے فاطمہ نے دانش کو کہا۔

"میرا بچہ، میرا معصوم بچہ چلا گیا صرف اس عورت کی وجہ سے۔۔۔ یہ عورت کہتی تھی کہ آئی ایم بیسٹ ہارٹ سرجن ان دا ٹاؤن۔۔۔اور اپنے بچے کو نہیں بچا سکی۔۔۔" رطابہ اپنی جگہ سے اٹھی۔وہ ساکت پتلیوں سے دانش کو دیکھ رہی تھی۔

"میرے بچے کا دل بند ہو گیا۔اسی عورت کے ہاتھوں میرے بچے کا دل بند ہو گیا۔۔" وہ الٹے قدم باہر کی طرف بڑھتی گئی۔

"میرا ذکی چلا گیا۔" دانش اب دھاڑیں مار کر اذکار سے لپٹا ہوا تھا۔

وہ مرے قدموں سے دروازے سے باہر نکلی تھی۔ چہرے کا ماسک اترا ہوا تھا اور آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔۔۔۔ ان ہاتھوں نے پچھلے کئی سالوں میں ہزاروں جسموں کو چیرا تھا، ہزاروں دلوں کی مرمت کی تھی لیکن کبھی کسی ایک کا بھی دل بند نہیں ہوا تھا۔ آج انہی ہاتھوں سے ایک دل بند ہوا تھا اور وہ دل اس کے اپنے بیٹے کا تھا۔

"لگتا ہے آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس بات کا ڈر۔۔۔؟"

"یہی کہ میں او۔ٹی سے واپس نہیں آؤں گا۔" اس نے مڑ کر او ٹی کو دیکھا۔ دروازہ بند ہو چکا تھا اور ذکی اندر رہ گیا تھا۔

اس نے پھر سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔

"آپ تو اتنی شیور ہیں جیسے آپ نے میری زندگی کی گارنٹی لے لی ہو۔۔۔ ویسے ڈاکٹرز تو علاج کرتے ہیں، زندگی نہیں دیتے۔ اتنی شیورٹی بھی اچھی نہیں ہے۔" وہ وہیں او ٹی کی دیوار کے ساتھ بیٹھ گئی اور روتے ہوئے یک دم حلق پھاڑ کر چیخنے لگی۔۔۔ گھٹن جو بہت بڑھ گئی تھی اسے نکالنا تھا۔ دل تنگ پڑ رہا تھا اب کیسے ٹھیک ہونا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ دل کی طبیب اپنا دل ٹھیک کرنا نہیں جانتی تھی۔ یہی اس کے علم کی محدودیت تھی۔

"ذکی۔۔۔" وہ حلق کے بل چلا رہی تھی۔ کتنی نرسیں اور ڈاکٹرز اس کی طرف بھاگے تھے جو زمین پہ بیٹھی ہوئی چلاتے ہوئے اپنے ہاتھ زمین ہی مار رہی تھی۔ فاطمہ اندر سے روتی ہوئی اس کی چیخیں سن کر باہر نکلی تھی۔

"باجی۔۔۔ باجی سنبھالو خود کو۔" وہ روتے ہوئے اس کے سامنے زمین پہ دوزانو بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ تھام لئے۔

"میں بیسٹ ڈاکٹر ان دا ٹاؤن ہوں۔۔۔ میرا بچہ کیسے دل کے بند ہونے سے مر سکتا ہے۔

اس کا دل کیسے بند ہو سکتا ہے۔۔۔؟" وہ ہذیانی انداز میں کہہ رہی تھی۔ تمام نرسیں اور ڈاکٹر اس کے گرد جمع تھے۔

"اس کا دل نہیں بند ہو سکتا۔ میرے ہاتھوں کبھی کسی کا دل بند نہیں ہوا۔ میرے بیٹے کا دل کیسے بند ہو سکتا ہے۔۔۔؟ وہ نہیں جا سکتا۔۔۔ وہ نہیں مر سکتا۔۔۔" وہ چیخ رہی تھی۔ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ فاطمہ نے اسے اپنے ساتھ لگانے کی کوشش کی۔ وہ اسے پرے دھکیل رہی تھی۔

"اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ نہیں مر سکتا۔" وہ اٹھی اور اپنے آفس کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ فاطمہ نے روتے ہوئے گھر فون کر کے بتا دیا۔

☆......☆......☆

ایمبولنس کرنل نواز سدھو کے گھر کے سامنے رک رہی تھی۔ کالونی کی مسجد میں علان کیا جا رہا تھا کرنل نواز سدھو کے پوتے کا انتقال ہو چکا ہے۔۔ ایمبولنس سے اترتے اسٹریچر پہ لیٹا وجود دور سے زیور بابا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پھر دیوانہ وار مخالف سمت میں بھاگ پڑے۔

ماتم کی فضا میں بس ایک وجود خاموش تھا اور وہ رطابہ کا تھا۔ وہ ساکت اور پتھرائی نظروں سے بس اذکار کو دیکھتی جاتی تھی۔ کتنوں نے اسے رلانے کی کوشش کی لیکن وہ بس خالی نظروں سے بیٹے کو دیکھتی رہی۔

جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔ وہ تب بھی خاموش تھی۔ اس نے اسی خاموشی سے اس پر نور چہرے کو چوما ،کئی بار چوما اور اسکے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے الوداع کیا۔

جنازہ گھر کے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ بیٹا باپ، دادا، چاچا، ماموں اور نانا کے کاندھوں پہ سوار تھا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی اور وہ خالی نظروں سے بس اسے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ ماں کی کوکھ جیسے بھری ہوتی ہے ویسے خالی بھی ہو سکتی ہے۔ اسی سوچ سے اس نے لپک کر اخبا کو خود سے بھینچ لیا۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی اکلوتی رہ جانے والی اولاد کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اسے بار بار وہ الفاظ یاد آ رہے تھے جو ذکی کے منہ سے ادا ہوئے تھے۔۔۔ وہ خواب

تھا یا خیال۔۔۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔وہ زندگی اور موت کے بیچ کا مرحلہ تھا کہیں۔اس کی میڈیکل سائنس میں اس کی کوئی توجیہہ نہیں تھی کہ کوئی انسان جس کا دل رک گیا ہو وہ کیسے بے ہوشی سے ہوش میں آکر کلام کر سکتا ہے۔

☆......☆......☆

''آئینور آنٹی۔۔۔ باہر کوئی آپ کو بلا رہا ہے۔'' جنازے کے بعد ایک بچے نے آکر اسے مخاطب کیا۔

''باہر کہاں۔۔۔؟'' وہ عابدہ کے ساتھ مہمانوں کو چائے پیش کر رہی تھی۔

''باہر گیٹ پہ کوئی انکل ہیں بلیک شلوار قمیض میں۔۔۔''

اس نے چائے عابدہ کے حوالے کی اور تیزی سے باہر کی طرف نکلی۔گیٹ پہ کوئی کھڑا تھا لیکن اس کا چہرہ وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ابھی مرد جنازہ پڑھ کر واپس نہیں لوٹے تھے۔وہ محتاط سی ہو کر اس تک پہنچی۔

''جی کہیے۔۔۔''اجنبی مڑا اور آئینور فاطمہ گل پتھر کی ہو گئی۔اس کے سامنے سموئیل عباد کھڑا تھا۔

''کیسی ہو۔۔۔؟'' وہ کتنی دیر بے یقینی کی کیفیت میں اسے دیکھتی رہی۔

''ٹھ۔۔۔ ٹھیک۔۔۔ آپ یہاں کیسے۔۔۔؟'' بڑی دقت ہوئی اسے ایک جملہ مکمل کرتے۔

''جنازے میں آیا تھا۔آئی ایم سوری فار از کار۔۔۔''

''آپ کو کس نے بتایا۔۔۔؟ مطلب آپ یہاں تک کیسے پہنچے۔۔۔؟'' اسے یقین تھا ریچل نے ہی اسے بتایا ہوگا۔

''کیا ہم کچھ دیر کہیں اور جا کر بات کر سکتے ہیں۔۔۔؟'' وہ کچھ دیر گومگو کی کیفیت میں رہی پھر اسے ایک منٹ کہہ کر اندر گئی تا کہ کسی کو بتا سکے کہ وہ کچھ دیر میں آتی ہے۔وہ باہر آئی تو عباد گیٹ پہ ہی کھڑا تھا۔ دونوں سامنے والے پارک کی طرف خاموشی سے چلتے چلے گئے۔پارک میں پہنچ کر وہ ایک ہی بینچ کے دو کناروں پہ بیٹھ گئے۔کتنی دیر خاموشی سے گزر گئے۔پھر سموئیل نے کھنگار کر گلا صاف کیا۔ آخر کسی کو تو بات کرنا تھی۔سو اس نے پہل کی۔

''میں کرنل سدھو کے پوتے کا جنازہ پڑھنے آیا تھا۔۔ یہیں سامنے والی لین میں میرا گھر ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہاں تم مجھے مل جاؤ گی۔ میں تو تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر یاد آیا کہ ریچل نے بتایا تھا کہ تمہارا بھانجا بیمار ہے۔ ان فیکٹ میں ایک بار پہلے بھی آیا تھا تو مجھے ازما نے بتایا تھا کہ اس کا بھائی بیمار ہے اور ہسپتال میں ہے۔ سب وہیں گئے ہیں۔ لیکن میں بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ تمہارا بھانجا ہو گا ۔'' اس نے وقفہ لیا۔

''میں نے بہت ڈھونڈا ہے تمہیں آئینور۔۔۔ اور تم ملی بھی تو اس جگہ۔۔۔ اس موقع پہ۔۔۔''

''کیوں ڈھونڈا۔۔۔؟'' عباد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا رنگ فاطمہ کے سخت تاثرات سے پھیکا پڑا۔

''وہ بابا جی۔۔۔ ان کو کھانا تم دیتی تھی نا۔ ان کے پاس وہ تمہارے ہاتھ کا بنایا کاغذ، وہ دیکھا تھا میں نے۔ مجھے پتا تھا کہ وہ تمہارا ہی دیا ہوا ہے۔ لیکن وہ کچھ پوچھنے پہ بتاتے ہی نہیں تھے کہ تم کہاں مل سکتی ہو۔''

''بتایا نہیں کیوں ڈھونڈ رہے تھے مجھے۔۔۔؟'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''تم نے اسپشلائزیشن کر لیا۔۔؟'' وہ اس کے سوال کو ٹالنا چاہتا تھا۔

''نہیں کیا۔۔۔ ''

''کیوں۔۔۔؟'' وہ چونکا۔'' تمہیں تو پیڈز میں جانے کا بہت شوق تھا۔''

''بندے کو علم اتنا حاصل کرنا چاہئے جتنا وہ سنبھال سکے کیوں کہ اکثر عاجزی کم پڑ جاتی ہے اور علم انسان سے سنبھالا نہیں جاتا۔ پھر علم تکبر کے ملاپ سے چھلکنے لگتا ہے۔ ایسے علم سے جہالت بھلی ہے ۔'' اس کے سامنے اس کی بہن مثال تھی اور وہ ویسا بننے سے ڈرتی تھی۔

''کہاں جاب کرتی ہو۔۔۔؟''

''کیا میرا انٹرویو کرنے کے لئے مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔۔۔؟'' وہ کچھ کھسیا کر اٹھا اور سر نفی میں ہلایا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

وہ نیچے جھکا اور اس کے سامنے گھاس پہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ہاتھ ہوا میں بلند کئے اور پھر اس

کے سامنے جوڑ دیے۔

"معافی مانگنے کے لئے ڈھونڈ رہا تھا۔" اس کے بندھے ہاتھ دیکھ کر وہ پلکیں تک نہیں جھپک سکی۔اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"جو کچھ بھی میں نے کیا اس کی معافی آئینور۔تم وہ بالکل بھی ڈیزرو نہیں کرتی تھی جو میں نے کیا، جو میں نے کہا۔اس کا احساس ابھی نہیں، بہت پہلے سے مجھے تھا لیکن تمہیں کیسے کہتا، کیسے بتاتا ۔تم تو نجانے کہاں چھپ گئی تھی ۔ میں تمہاری پہلے بھی بہت عزت کرتا تھا اور اب اور بھی زیادہ کرتا ہوں۔جو بھی بکواس کی، دل سے بالکل نہیں کی۔۔بس دماغ میں بھر دیا گیا اور میں بکتا چلا گیا۔انسان ہوں، شیطان کے وار سے نہیں بچ سکا اور ہمزات (غصے کے شدید حملے) کا شکار ہو گیا۔اللہ گواہ ہے کہ اگر زمین پھٹ سکتی تو میں اس وقت پشیمانی سے اس میں دھنس چکا ہوتا۔" آئینور بالکل سانس روکے اسے سن رہی تھی۔پہلی بار کوئی مرد اس کے سامنے گھٹنوں پہ گرا تھا۔ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ رہا تھا ۔اس وقت اللہ نے اسے اس کے اس سوال کا جواب دیا تھا کہ وہ کیسی لڑکی ہے کہ ہر مرد اسے تھوک دیتا ہے۔۔۔ ہاں وہ اللہ کی نظر میں ایسی لڑکی تھی جس کے سامنے ایک مرد گھٹنوں کے بل گرا ہوا اس کو عزت کے مقام پہ بٹھا کر اس سے معافی مانگ رہا تھا۔

"میں ایسا کیا کہوں کہ ان الفاظ کا مداوا ہو سکے اور تم میری معافی قبول کر لو۔" اس کی آنکھوں میں کوئی پانی نہیں تھا لیکن لہجہ گلوگیر تھا۔اپنی مردانہ انا پہ پیر رکھ کر کسی لڑکی کے سامنے اپنے کیے کی معافی مانگنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے اور سموئیل عباد نے یہ مشکل ترین کام کر دیا تھا۔تو کیا ایک مشکل کام آئینور فاطمہ گل نہیں کر سکتی تھی۔۔۔ اسے معاف کرنے کا۔اپنا ظرف بڑا کرنے کا۔۔۔؟

"عزت ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔کوئی انسان نہ ہمیں ذلیل کر سکتا ہے نہ ہماری عزت بڑھا سکتا ہے ۔وہ سب میرے مقدر میں تھا اور یہ سب بھی میرے مقدر میں تھا کہ اللہ نے مجھے معتبر کرنا تھا۔کسی بھی قسم کے مداوے کی ضرورت نہیں ہے۔میں نے آپ کے ظاہر پہ معاملہ کر کے آپ کی بات کا اعتبار کر لیا ہے۔" عباد نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا۔

"اگر آپ کی معافی تلافی ہوگئی ہو تو مجھے اجازت دیں۔ گھر پہ بہت مہمان ہیں۔۔" آئینور اٹھی۔
"کیا ہم پھر ملیں گے۔۔۔؟" اس وقت اسے روکنا بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ آئینور نے مڑ کر دیکھا۔
"اللہ نے چاہا تو۔۔۔" وہ مضبوط قدم جماتے ہوئے پارک سے نکلتی چلی گئی۔
"اللہ نے یونہی تو تمہیں کہیں اور سے توڑ کر پانچ سال بعد مجھ سے نہیں جوڑا آئینور۔ کچھ تو اس کے ارادے ہیں اور مجھے اس کے ارادوں پہ بڑا یقین ہے۔" وہ اب اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

پچھلے چار مہینے سے وہ بس گھر کے اندر باہر چکر لگاتی رہتی۔ اسے ڈپریشن کا بری طرح دورہ پڑا تھا۔ اس نے ہسپتال جانا چھوڑ دیا تھا۔ ہسپتال والوں نے کتنی ہی بار اسے کالز کیں، ڈاکٹر منصور گھر بھی آئے لیکن اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔
"میں اپنے بچے کو نہیں بچا سکی۔ اب میں کبھی سرجری نہیں کر سکوں گی۔" اس کا ایک ہی جواب تھا۔
"رطابہ ہم ڈاکٹرز مریض کا علاج کرتے ہیں، اسے صحت اور زندگی دینا ہمارا کام نہیں ہے۔ یہ کام اللہ کے ہیں۔ تم اللہ کے کاموں کا ذمہ خود کیوں اٹھانا چاہتی ہو۔۔۔؟ تمہیں یہ بات سمجھنا چاہئے کہ وہ اتنی ہی زندگی لکھوا کر لایا تھا۔ تم اسے america بھی لے جاتی تو بھی اس نے زبردست میڈیکل ٹریٹمنٹ لے کر بھی نہیں بچنا تھا۔"
"میں اب کوئی سرجری نہیں کر سکتی۔ اوٹی میں جاؤں گی تو وہ میرے سامنے آجائے گا۔ مجھ سے پوچھا گا کہ کیسی ہارٹ سرجن ہوں جو اسے نہیں بچا سکی۔ میں اسے کیا جواب دوں گی۔۔۔؟"
"وہ جا چکا ہے۔۔" اس نے ڈاکٹر منصور کو دیکھا اور رونے لگی۔
"مگر مجھ سے اس نے بات کی تھی ناویں۔۔۔ وہ پھر سے مجھ سے بات کرے گا تو میں کیا جواب دوں گی۔۔۔؟" اپنے شعبے کی ذہین ڈاکٹر کو اس حال میں دیکھ کر انہیں افسوس ہوا۔ ڈاکٹر منصور نے جانے سے پہلے دانش سے کہا تھا کہ وہ اسے کسی اچھے سائیکاٹرسٹ کو دکھائے۔ دانش اس معاملے

میں بالکل بے حس ہو چکا تھا۔

وہ بے چینی سے گھر کے اندر باہر چکر لگاتی رہتی۔ اس لفافے کو دیکھتی جو فاطمہ نے یہ کہہ کر اسے دیا تھا کہ یہ ذکی نے اسے دینے کو کہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے زیور بابا کو دے اور زیور بابا وہ تو اس دن کے بعد سے اسے کبھی دکھے ہی نہیں۔ وہ بار بار عابدہ سے زیور بابا کا پوچھتی لیکن اسے ایک ہی جواب ملتا۔

''چھوٹی بی بی ! وہ ذکی بابا کی وفات والے دن کے بعد سے کہیں چلے گئے ہیں۔ جس کے لئے روز باہر آتے تھے جب وہ چلا گیا تو وہ یہاں آ کر کیا کریں گے۔'' عابدہ رونے لگتی اور رطابہ اونچی آواز میں اس سے بھی اونچا اونچا روتی تو عابدہ اس کی ایسی حالت دیکھ کر ڈر جاتی۔۔۔ روزانہ وہی منظر ایک خواب کی صورت اس کی نظروں میں گھومتا تھا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ جو بے ہوشی سے ہوش میں آ ہی نہیں سکا تھا اس نے کیسے رطابہ سے بات کی تھی۔ کیا اس نے جاگتے میں خواب دیکھا تھا یا شاید جب وہ اس سے سرجری سے پہلے ملی تھی یہ باتیں اس نے تب کی تھی۔ اس کا ذہن صدمے سے دوچار ہو کر سرجری سے پہلے اور بعد کے وقت کا امتیاز بھول کر اسے گڈمڈ کر رہا تھا۔ جو باتیں اس نے پہلے کی تھیں وہ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے سرجری کے بعد کی تھیں۔ جب یاد نہ آتا تو وہ رونے لگتی۔ اپنے دماغ کو کوستی اور سر کے بال نوچتی۔ دانش کو لگتا تھا کہ وہ اس دنیا میں مکافات کا شکار ہو چکی ہے۔

ذکی نے کہا تھا کہ وہ اس کی زندگی سے اس لئے جا رہا ہے تا کہ اس کی زندگی بہتر ہو۔ لیکن اس کی زندگی تو بدتر ہو چکی تھی۔ اس کی تمام ڈگریاں اس کے منہ پہ مار کر اسے اس کی اوقات دکھا دی گئی تھی۔ سارا تکبر، علم مٹی ہو گیا تھا۔ اس کا ذہین ترین ذہن بیمار ہو چکا تھا۔

اس دن وہ عجب بے چینی کا شکار کالونی سے باہر نکل گئی تا کہ زیور بابا کو ڈھونڈ سکے۔ ذکی نے کہا تھا کہ اسے زیور بابا سے معافی مانگنا چاہئے کیوں کہ اس نے ان کے ساتھ برا کیا ہے۔ ذہن میں ایک سوال ابھرتا تھا کیا اسے زیور بابا کی ہائے لگی ہے۔ کالونی سے بہت دور اسے فٹ پاتھ پہ بیٹھے ایک بزرگ پہ زیور بابا کا گمان ہوا تھا۔ وہ ان کی طرف لپکی۔ قریب جانے پہ پتا چلا کہ وہ زیور بابا نہیں تھے۔ وہ وہیں قریب میں بیٹھ کر رونے لگی۔

''بیٹا کیوں رو رہی ہو۔۔؟'' بابا اٹھ کر اس کے پاس آئے۔

''میرا بیٹا مر گیا۔ میری نوکری ختم ہو گئی۔ میں دماغ خراب ہو گیا ہے۔ سکون ختم ہو گیا زندگی سے۔ ہر نعمت تھی زندگی میں، اب جیسے کچھ بھی نہیں رہا۔'' وہ روتے ہوئے انہیں بتا رہی تھی۔ وہ زندگی میں کبھی یوں بلک بلک کر نہیں روتی تھی، اسے تو لوگوں کو رلانے میں کمال حاصل تھا اور جب سے ذکی گیا تھا وہ بات بات پہ ایسے ہی روتی تھی۔

''نعمت ہمیشہ ہی تو نہیں رہتی ہے بیٹا۔ نعمتوں کا زوال بھی ہوتا ہے۔ دن لوگوں کے درمیان اللہ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی تنگی کبھی خوشحالی۔ کبھی صحت کبھی بیماری۔۔۔ انسان زندگی میں امتحان کے لئے آیا ہے بیٹا۔ بس ہر انسان کا امتحان فرق ہے۔ ہر انسان کا جہاد فرق ہے لیکن حالتِ امتحان میں ہر کوئی ہے۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا لیکن تمہیں اس سے سیکھنا ہوگا۔'' اس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور مڑنے لگے۔

''مجھے کسی کی بددعا لگی ہے۔ کسی کے ساتھ بہت برا کیا تھا میں نے۔''

''کسی کے ساتھ زیادتی کا احساس ہے تو اللہ کے بندے سے معافی مانگ لو۔ اللہ معاف کر دے گا۔''

''اللہ کا بندہ ہی تو کھو گیا ہے۔'' وہ سر ہاتھوں پہ گرا کر رونے لگی۔

''اس کی طرف سے صدقہ کر دو۔ دل اللہ صاف کر دے گا۔'' رطابہ نے آنسو پونچھے اور اٹھ کر وہی لفافہ انہیں دینا چاہا جو اس کے موبائل کے کور میں تھا۔

''میں بھکاری نہیں ہوں بیٹا۔ یونہی راہ میں بیٹھ جاتا ہوں۔ اللہ کے بندوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا ہوں۔ جاؤ بیٹا اور اللہ سے معافی مانگ کر زندگی کو پھر سے شروع کرو۔ بس اللہ کے بندے کا دل نہ توڑنا۔ دل میں تو اللہ بستا ہے، اسے توڑا نہیں کرتے۔'' رطابہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

وہ ہسپتال سے نکلی تو پارکنگ میں ہی سموئیل اسے اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا دکھائی دیا۔ آئینور کو دیکھتے ہی اس نے ہاتھ ہلایا۔ وہ اس کی طرف چلی آئی۔

''کافی دیر سے ویٹ کر رہا تھا۔ اب یہ مت پوچھنا کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ تم یہاں جاب کرتی ہو

۔جب تمہیں ڈھونڈ لیا تو ہسپتال ڈھونڈنا کچھ مشکل نہیں تھا۔'' آئینور نے دل میں آیا سوال دبا دیا۔

''کہیں چلیں۔۔۔؟'' آئینور نے سر نفی میں ہلایا۔عباد کو یہی امید تھی کہ وہ منع کر دے گی۔وہ مسکرا دیا۔

''میں یہیں بات کر لیتا ہوں۔نو پرابلم۔۔۔ کیا گاڑی میں بھی نہیں بیٹھ سکتے۔۔۔؟''

آئینور نے ہونٹ پھیلا کر سر پھر سے نفی میں ہلایا۔سموئیل پھر مسکرا دیا۔وہ ویسی کی ویسی ہی تھی۔

''اٹس اوکے۔میں یہیں کھڑے ہو کر بات کر لوں گا۔۔۔ ویسے شاید ہی کسی لڑکے نے کبھی کسی لڑکی کو ہسپتال کی کار پارکنگ میں پرپوز کیا ہوگا۔'' آخری جملہ اس نے کان کھجاتے ہوئے ذرا ہولے سے کہا تھا لیکن اتنا اونچا ضرور کہا تھا کہ وہ سن سکے۔

''عباد! اس سے پہلے آپ کچھ کہیں میں یہ کلیئر کر دینا چاہتی ہوں کہ میں ایک لوئر مڈل کلاس فیملی سے ہوں۔ہمارا کوئی کمپیرزن نہیں ہے۔آپ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔میں نے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے لئے بہت محنت کی ہے۔میں آپ سب کی طرح سونے کا نوالا لے کر پیدا نہیں ہوئی۔میں نے بہت سفر کیا ہے تب اس جگہ پہنچی ہوں۔''

''کیا میں نے آپ کا بائیوڈیٹا یا فیملی بیک راؤنڈ پوچھا۔۔۔؟'' اس نے آئینور کی بات کاٹ دی۔

''آئینور! اگر تمہیں یہ لگتا ہے کہ یہ جان کر کہ تم ایک سیلف میڈ لڑکی ہو مجھے برا لگے گا تو ایسا کچھ نہیں ہے۔تمہارے ان ہاتھوں کو دیکھ کر میں جانتا تھا کہ تم نے زندگی میں بہت محنت کی ہے۔تمہارے بتائے بنا بھی اتنا جانتا تھا میں تمہیں آئینور۔تمہاری یہی خودی اور وقار ہے جو تمہیں دوسروں سے الگ کرتا ہے۔تبھی تو اتنے عرصے جھک مارتا رہا لیکن ایک بھی تم جیسی نہیں ملی اور نہ ہی کبھی ملے گی۔آئینور فاطمہ گل تو بس ایک ہی ہے۔'' اس کے منہ سے یہ سب سن کر آئینور سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا مشکل ہو گیا تھا۔

''کیا آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا نکاح ہوا تھا اور پھر۔۔'' اس نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

''ہاں۔۔ یہ جانتے ہوئے بھی۔سب جانتے ہوئے بھی تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔کہا نا کہ تم جیسی اور کوئی مل نہیں سکی۔'' وہ کتنی دیر خاموش کھڑی رہی تو اسے پھر سے پوچھنا پڑا۔

''کچھ کہو گی نہیں۔۔۔؟''

وہ بہت کنفیوز ہو چکی تھی۔اس سے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔وہ وہاں سے بھاگنے کا ارادہ رکھتی تھی جسے وہ بھانپ گیا۔

''جواب کے بنا جانے نہیں دوں گا۔'' وہ اس کے سامنے رستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔اس نے سموئیل کو ایک نظر دیکھا اور پھر نظر پھیر لی۔

''کیا مجھے ساری زندگی عباد ہی کہنا ہو گا یا سموئیل کہنے کی اجازت ہو گی۔۔۔؟'' وہ اس کے پیارے سے، انوکھے سے اقرار پہ ہنس دیا۔

''سموئیل کہو، عباد کہو یا سمی کہو۔۔۔ جو بھی کہو قبول ہے۔بس تم مجھے قبول کر لو۔۔'' وہ کھل کر مسکرا دیا تو وہ جھینپ گئی اور تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔آگے بڑھتی ہوئی آئینور کے چہرے پہ بھی ایک عرصے بعد ایک پیاری سی مسکان تھی۔

☆......☆......☆

اور کچھ دل جو پتھر ہوا کرتے ہیں جب زلزلے آئیں تو وہ لڑھک کر گر جاتے ہیں اور شق ہو جاتے ہیں۔۔۔ ایک ایسا دل رطابہ کا تھا۔

ایک بار وہ گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے اس سڑک پہ اس بھکارن سے ٹکرائی تھی اور چپکے سے اس کے پاس وہ لفافہ چھوڑ گئی تھی جو ذکی نے زیور بابا کے لئے چھوڑا تھا۔آج وہ اسے زیور بابا کی طرف سے ایک صدقے کا لفافہ دینے آئی تھی۔ایسا لفافہ وہ ہر مہینے زیور بابا کی طرف سے دیتی تھی کہ شاید اس ایک نیکی سے وہ جہاں کہیں بھی ہوں، اس کی طرف سے دل صاف کر چکے ہوں، اسے معاف کر چکے ہوں کہ دل کو اللہ پھیرتا ہے اور اللہ اس کی نیت جانتے تھے۔

''اس دن بھی تم تھی نا جو یہ رکھ کر گئی تھی۔۔۔؟'' بھکارن نے لفافہ دیکھ کر اس سے پوچھا تو رطابہ نے سر ہلا دیا۔

''آپ اتنی اچھی انگلش کیسے بولتی ہیں۔۔۔؟ پڑھی لکھی ہیں۔۔۔؟''

''کالج میں پڑھاتی تھی۔ ۲۰۰۵ کے زلزلے میں سب ختم ہو گیا۔ یہ ہاتھ معذور ہو گیا تو کام کاج کرنے سے بھی گئی۔ ذہن بھی کام کرنا چھوڑ گیا۔ گھر بار، خاندان سب ختم ہو گیا تو یونہی بے سہارا بچے گود لے لئے کہ ایک نیا خاندان بنا لوں۔ اب یہاں وہاں گھومتی ہوں۔ کام مل جائے تو کر لیتی ہوں۔ کوئی کچھ دے دے تو اللہ کا لاکھ شکر کرتی ہوں۔ پہلے اتنا کچھ تھا تو شکر کبھی نہیں کیا۔ اب سب چھن گیا تو قدر آ گئی کہ کیا کچھ تھا میرے پاس جواب نہ رہا۔ اب قدر آ گئی ہے۔ قدر آ گئی ہے تو سوچتی ہوں نعمتیں بھی پھر سے آ ہی جائیں گی۔۔۔'' وہ ساتھ ساتھ بھنے دانے کھا رہی تھی۔ اس دن اس کے ساتھ بچے نہیں تھے۔

''انسان کو بس ہر حال میں اللہ کا شکر گزار بننا چاہئے کیوں کہ یہ جو بھی بہاریں ہیں یہ اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ ہمارا کوئی کمال نہیں۔ وہ چاہے تو چھین لے اور چاہے تو نواز دے۔ انسان کی اوقات ایک ٹکے کی بھی نہیں ہے۔'' رطابہ کی آنکھیں بھر آگئیں۔

زندگی کی حقیقتیں انسان کو اکثر ان لوگوں سے سیکھنے کو ملتی ہیں جن کے پاس بڑی ڈگریاں نہیں ہوتیں، جسم پہ اعلیٰ لباس بھی نہیں ہوتا لیکن انہوں نے زندگی سے جنگ کی ہوتی ہے اور اسی جنگ میں بہت کچھ پایا ہوتا ہے۔

''ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ میرے لئے بھی دعا کریئے گا کہ میں بھی یہ گر سیکھ سکوں۔۔۔ میں بھی سپاس گزار بن سکوں۔'' اپنی آنکھوں کی نمی ٹشو سے پونچھ کر وہ سامنے دکان میں چلی گئی۔ اسے اذما کے لئے بہت کچھ لے کر گھر جانا تھا۔ کل سے اسے ہسپتال واپس جانا تھا اور زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا تھا۔

❀ ❀